MAUR-108 (N)

Ghair Afsanavi Adab

MAUR-108 (N) غیرافسانوی ادب

فہرست

غیرافسانوی ادب

بلاک:1 خاکہ

اکائی۱: خاکہ نگاری کافن،اردو میں خاکہ نگاری کا آغاز وارتقا............ 10
اکائی۲: فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری............ 22
اکائی۳: عبدالحق اور نام دیو مالی............ 37

بلاک:2 انشائیہ

اکائی۴: انشائیہ کافن، بنیادی خصوصیات،مضمون اور مقالہ کا باہمی رشتہ............ 55
اکائی۵: محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری اور نیرنگ خیال............ 67
اکائی۶: خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری اور سی پارۂ دل............ 78

بلاک:3 سوانح نگاری

اکائی۷: اردو میں سوانح کی روایت............ 93
اکائی۸: حالی کی سوانح نگاری (یادگار غالب کے حوالے سے)............ 110
اکائی۹: شبلی کی سوانح نگاری (الفاروق کے حوالے سے)............ 121

بلاک:4 خطوط نگاری

اکائی۱۰: خطوط نگاری کافن اور اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز وارتقا............ 136
اکائی۱۱: خطوط غالب: ایک جائزہ............ 159
اکائی۱۲: ابوالکلام آزاد اور غبار خاطر............ 172

بلاک:5 طنزومزاح

اکائی۱۳: طنزومزاح کافن اورآغاز وارتقا............ 190
اکائی۱۴: رشید احمد صدیقی،بحیثیت طنزومزاح نگار مضامین رشید کے خصوصی حوالے سے............ 209

اکائی۱۵: مشتاق احمد یوسفی، بحثیت طنز ومزاح نگار چراغ تلے کے خصوصی حوالے سے............................222
اکائی۱۶: اردو نظم میں طنز ومزاح کی روایت: اکبرالہ آبادی کے خصوصی حوالے سے................................237

کورس کا تعارف

خاکہ نگاری ایک منفرد نثری صنف ہے جو غیر افسانوی ادب کے زمرے میں رکھی جاتی ہے۔ خاکہ نگاری کے لغوی معنیٰ ڈھانچہ (Structure) تیار کرنا ہے۔ یہ کسی شخص کی ایسی مرقع کشی کرتا ہے کہ اس شخص کے تمام اوصاف وکمالات کی تصویر ابھر کر سامنے پھر جاتی ہے۔ اس کا چلنا پھرنا ہنسنا بولنا، اٹھنا بیٹھنا غرض کہ روزمرہ کے تمام معمولات کی ایسی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جس سے اس شخص کے ظاہری و باطنی خدوخال ہمارے سامنے واضح ہو جاتے ہیں اور قاری اسے نہ دیکھ کر بھی دیکھا ہوا محسوس کرتا ہے۔ نثار احمد فاروقی کے بقول ''خاکہ کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے۔'' مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' اس صنف کی ابتدائی اور اب تک کی بہترین مثال ہے۔ مولوی عبدالحق رشید احمد صدیقی، منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، مجتبیٰ حسین وغیرہ اردو کے اہم خاکہ نگار ہیں۔ اردو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش اردو تذکروں میں ملتے ہیں۔ نکات الشعرا (میر تقی میر) تذکرۂ ہندی (مصحفی) مجموعۂ نغز (قدرت اللہ قاسم) اور محمد حسین آزاد کی تصنیف آبِ حیات اس کی چند اہم مثالیں ہیں۔ عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں بھی اس صنف کے ابتدائی نقوش ابھرتے ہیں۔ لیکن اردو میں اسے مکمل صنف کی حیثیت سے متعارف کرنے کا سہرا مرزا فرحت اللہ بیگ کے سر ہے۔

اردو ادب کی نثری اصناف سخن میں انشائیہ کا اہم مقام ہے۔ 1857ء کے بعد ملک کے حالات اور سماجی نظام میں حیرت انگیز تبدیلی دکھائی دیتی ہے اور اس کی وجہ انگریز قوم کا ہندوستان پر پوری طرح سے تسلط قائم ہو جانا ہے۔ اس دور کے ادب پر نظر ڈالیں تو صرف شعری اصناف کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ جس میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، واسوخت وغیرہ شامل ہیں۔ نثری اصناف کا بہت زیادہ سرمایہ موجود نہیں تھا۔ نثر میں داستان ہی غالب تھی۔ انشائیہ اردو ادب کی ایک مشہور اور جدید صنف ہے جس کا تعلق غیر افسانوی ادب سے ہے۔ اُردو کی تقریباً تمام غیر افسانوی اصناف جن میں سوانح، خاکہ، سفرنامہ، رپورتاژ، مکتوب اور انشائیہ وغیرہ شامل ہیں کا آغاز کافی تاخیر سے یعنی اُنیسویں صدی کی ابتداء سے ہوا۔ اس سے پہلے اردو نثر میں داستان، حکایات اور تمثیلی قصّے وغیرہ ہی پائے جاتے تھے۔ 1857ء کے بعد سے بدلتے ہوئے حالات میں اردو شعراء اور ادباء نے خوابوں اور خیالوں کی افسانوی دنیا سے نکل کر باقاعدہ غیر افسانوی اصناف کو فروغ دیا۔ اس کے بعد سے اردو میں حقیقت نگاری کی شروعات ہوئی اور جدید اصناف میں طبع آزمائی کرنے کا رجحان عام ہوا۔ 1857ء کے غدر کے بعد مضمون، خطوط، انشائیہ، مختصر کہانی، ناول وغیرہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ تمام اصناف مغربی ادب سے مستعار لئے ہوئے ہیں۔ انشائیہ بھی مغرب سے اردو ادب میں آیا ہے لیکن خاص بات یہ ہے کہ انشائیہ پر ہندوستانی تہذیب کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

سوانح نگاری کا تعلق غیر افسانوی ادب کی اصناف سے ہے۔ اس صنف میں کسی شخص کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ سوانح لکھنے والا موجود اور دستیاب مواد کی روشنی میں ہی سوانح لکھتا ہے۔ اس طرح سوانح نگار اپنے زمانے کے مواد کا پابند ہوتا ہے۔

اردو کا ابتدائی زمانہ افسانوی ادب اور خاص طور پر داستانوں سے عبارت ہے لیکن دکنی عہد سے ہی غیر افسانوی ادب کے نقوش صوفیائے کرام کی تحریروں میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ صوفیائے کرام کے یہاں تصوف و روحانیت کے علاوہ سماجی اور اجتماعی زندگی کے متعلق بھی تعلیمات ملتی ہیں۔ جو ان کے سماجی شعور پر دلالت کرتی ہیں۔ غیر افسانوی ادب کو انگریزوں کی آمد کے بعد زیادہ فروغ ملا۔ یہاں تک کہ اردو ادب میں اس کی حیثیت نمایاں ہوتی چلی گئی۔ حالؔی، شبلؔی اور ان کے معاصرین مرزا حیرت، عبدالرزاق کانپوری، سید افتخار بلگرامی اور محمد سلیمان

منصور پوری نے سوانح نگاری کی روایت کوآگے بڑھایا۔ یہ سلسلہ اردوادب میں جاری ہےان میں مولانا سید سلیمان ندوی،مولانا عبدالسلام ندوی ،غلام رسول مہر،قاضی عبدالغفار،مولانا عبدالماجد دریا آبادی،صالحہ عابد حسین،حبیب الرحمٰن خاں شروانی ،رئیس احمد امروہوی ،شیخ محمد اکرام ،عبدالمجید سالک،ملا واحدی،خورشید مصطفیٰ رضوی اور شاہ معین احمد ندوی وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔

بہ حیثیت فن اردومکتوب نگاری کا آغاز تقریباً دوسو برس پہلے ہوا۔ یہ فارسی زبان کے زیر اثر اردو میں پروان چڑھی۔ابتدا میں فارسی روایات کا استعمال خوب ہوتا رہا لیکن بعد میں اردو نے اپنی الگ راہ نکال لی۔اردومکتوب نگاری کے ارتقا میں غالب کے علاوہ غلام غوث بےخبر،رجب علی بیگ سرور،سرسید احمد خاں،محسن الملک،حالی،شبلی،آزاد،ڈپٹی نذیر احمد،اکبرالہ آبادی،مولانا ابوالکلام آزاد ،فیض احمد فیض، جاں نثار اختر اور فراق گورکھپوری وغیرہ کا نام واضح طور پر ملتا ہے۔رجب علی بیگ سرور کی زبان رنگین اور گنجلک ہے۔ جب کہ غالب نے مکاتیب کوایک نئی زبان سے روشناس کرایا اور اسے باضابطہ ایک صنف کے طور پر اردو میں متعارف کرایا۔غالب کے خطوط میں طنزومزاح کی چاشنی،بوجھل لمحوں کے لیے بھی اکسیر کا کام کرتی ہے۔سرورکوجدید الفاظ کے استعمال پر قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے مجلس میں مستعمل زبان کا خطوط میں روانی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔سرور عام طور پر لکھنؤ کی مفرس اور پرتکلف زبان استعمال کرنے کے قائل تھے جب کہ غالب کے یہاں آسان لب ولہجہ ملتا ہے اور بے جا آداب والقاب سے بےاعتنائی بھی۔اس طرح غالب نے اردوخطوط نگاری کا چلن بدل دیا اور بیان میں ایسی ندرت پیدا کی کہ مراسلہ مکالمے میں تبدیل ہوگیا۔اس باب میں ہم خطوط نگاری کافن اوراس کے آغاز وارتقا سے متعلق گفتگو کریں گے۔

طنزومزاح اردوادب کی ایک مقبول صنف ہے۔مزاح نگاری کافن انسانی زندگی کالازمی حصہ ہے۔انسانی صفات میں سنجیدگی جوہر کی حیثیت رکھتی ہے۔لیکن انسانی معاشرہ ہمیشہ سنجیدہ رہ کر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔مزاج کی تبدیلی انسان کی سرشت میں شامل ہے۔متانت،سنجیدگی اوراپنے روزمرہ کے مشاغل سے اکتا کرانسان کچھ دیر کے لیے فرحت اور تازگی کی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے۔ایسے میں وہ طنزومزاح کا دامن تھام لیتا ہے۔طنزومزاح ادیب کی قوتِ مشاہدہ اور ذہنی ادراک کی پیداوار ہے۔اس لیے طنزومزاح کے عناصر معاشرہ اورانسانی زندگی پر تنقیدی نظر کا حکم رکھتے ہیں،جن کے سہارے طنزومزاح نگار اپنے معاشرہ کی ناانصافیوں اور فرد کی نارسائیوں کا مطالعہ کرتا ہے۔اس میں فرق اتنا ہے کہ تنقیدی ادب اپنے تعقلی اور سنجیدہ مباحث کے باعث ایک نظریے اور ردِعمل کوتحریک دیتا ہے۔لیکن ظریفانہ ادب مزاح کے ساتھ نشتریت کے ایک خوشگوار امتزاج کے باعث نہ صرف مقبول ہوتا ہے بلکہ عوامی راحت اور فرحت کا سبب بھی بنتا ہے۔

اس کورس میں ہم اردوادب کی کئی غیرافسانوی اصناف سے متعارف ہوں گے جن میں خاکہ نگاری،انشائیہ،سوانح نگاری،خطوط نگاری اورطنزومزاح شامل ہیں۔ان اصفان کی تعریف،اجزائے ترکیبی،فن اور روایت کے بارے میں جانیں گے ساتھ ہی اہم مصنفین اوران کی تصنیفات سے بھی متعارف ہوں گے۔

اکائی 1 ''خاکہ نگاری کافن،اردو میں خاکہ نگاری کا آغاز وارتقا'' پرمبنی ہے۔اس میں خاکہ کے معنی نیز اس کی تعریف اورفن پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔اس کے علاوہ اس کے عہد بہ عہد ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 2 ''فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری کے اوصاف واس کی انفرادیت کا ذکر مع امثال کیا گیا ہے۔

اکائی 3 ''مولوی عبدالحق اور نام دیو مالی'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں مولوی عبدالحق کے خاکے نام دیو مالی کی روشنی میں ان کی خاکہ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے نیز شامل نصاب خاکے کے اوصاف کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اکائی 4 میں ''انشائیہ کا فن، بنیادی خصوصیات، مضمون اور مقالہ کا باہمی رشتہ'' پر مبنی ہے۔اس میں صنف انشائیہ کی تعریف، اس کے فن اور خصوصیات پر گفتگو کی گئی ہے۔اس کے علاوہ مضمون کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے فن پر بھی مختصراً گفتگو کی گئی ہے۔نیز مضمون اور مقالہ کے باہمی تعلق پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اکائی 5 ''محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری اور نیرنگ خیال'' پر مبنی ہے۔اس میں آزاد کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات ''نیر ینگ خیال'' کے خصوصی حوالے سے پیش کی گئی ہے۔نیز ''نیرنگ خیال'' کے مخصوص مضامین کے حوالے سے اردو انشائیہ نگاری میں ان کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 6 ''خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری اور سیپارۂ دل'' پر مبنی ہے۔اس میں حسن نظامی کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات کا ذکر ''سیپارۂ دل'' کے خصوصی حوالے سے کیا گیا ہے۔نیز ''سیپارۂ دل'' کے مخصوص مضامین کے حوالے سے اردو انشائیہ نگاری میں ان کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 7 میں ''اردو میں سوانح نگاری کی روایت'' پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں سوانح کی تعریف، اس کے فن اور اردو میں سوانح نگاری کی روایت پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 8 ''حالؔی کی سوانح نگاری (یادگار غالب کے خصوصی حوالے سے)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں حالی کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ''یادگار غالب'' کے خصوصی حوالے سے ان کی سوانح نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 9 ''شبلؔی کی سوانح نگاری (الفاروق کے خصوصی حوالے سے)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں شبلی کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ''الفاروق'' کے خصوصی حوالے سے ان کی سوانح نگاری کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔

اکائی 10 ''خطوط نگاری کا فن اور اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز وارتقا'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں خطوط کی تعریف وفن پر گفتگو کی گئی ہے۔ساتھ ہی اردو ادب میں مکتوب نگاری کے آغاز وارتقا کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 11 ''خطوط غالب: ایک جائزہ'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں غالب کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے ان کے خطوط کی اہمیت وافادیت پر گفتگو کی گئی ہے۔نیز اردو ادب میں خطوط غالب کی ادبی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

اکائی 12 ''ابوالکلام آزاد اور غبار خاطر'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں آزاد کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے ان کے خطوط کی انفرادیت پر گفتگو کی گئی ہے۔نیز اردو ادب میں ''غبار خاطر'' کی ادبی قدر و

قیمت کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

اکائی 13 ''طنز ومزاح کا فن اور آغاز وارتقا'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں طنز ومزاح کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اردو ادب میں طنز ومزاح کے عہد بہ عہد ارتقا پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

اکائی 14 ''رشید احمد صدیقی، بحیثیت طنز و مزاح نگار مضامین رشید کے خصوصی حوالے سے'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں رشید احمد صدیقی کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''مضامین رشید'' کا فنی جائزہ لیتے ہوئے اس کے فنی امتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 15 ''مشتاق احمد یوسفی، بحیثیت طنز و مزاح نگار چراغ تلے کے خصوصی حوالے سے'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''چراغ تلے'' کا فنی جائزہ لیتے ہوئے اس کے فنی امتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 16 ''اردو نظم میں طنز ومزاح کی روایت: اکبرالہ آبادی کے خصوصی حوالے سے'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں اکبرالہ آبادی کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز اردو نظم نگاری میں ان کی خدمات اور فنی امتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بلاک:1 خاکہ

اکائی ا: خاکہ نگاری کا فن، اردو میں خاکہ نگاری کا آغاز وارتقا

اکائی ۲: فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری

اکائی ۳: عبدالحق اور نام دیو مالی

اکائی 1: خاکہ نگاری کا فن، اردو میں خاکہ نگاری کا آغاز وارتقا

ساخت

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 خاکہ نگاری کا فن

1.3.1 تعریف اور قسمیں

1.3.2 اجزائے ترکیبی

1.4 اردو میں خاکہ نگاری کی ابتدا

1.5 اردو میں خاکہ نگاری کا ارتقا

1.5.1 آزادی کے بعد خاکہ نگاری

1.6 آپ نے کیا سیکھا

1.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1.8 سوالات کے جوابات

1.9 فرہنگ

1.10 کتب برائے مطالعہ

1.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- خاکہ نگاری کی تعریف اور اس کے مختلف اقسام سے متعارف ہوں گے۔
- خاکہ نگاری کے فن سے واقف ہوسکیں گے۔
- خاکہ نگاری کے محرکات اور اجزائے ترکیبی سے متعلق واقفیت حاصل کرسکیں گے۔
- خاکہ نگاری کی ابتدا سے متعلق معلومات حاصل کرسکیں گے۔
- خاکہ نگاری کے عہد بہ عہد ارتقا کے متعلق جانکاری حاصل کرسکیں گے۔

1.2 تمہید

خاکہ نگاری ایک منفرد نثری صنف ہے جو غیر افسانوی ادب کے زمرے میں رکھی جاتی ہے۔ خاکہ نگاری کے لغوی معنی ’ڈھانچہ

(Structure) تیار کرنا ہے۔ یہ کسی شخص کی ایسی مرقع کشی کرتا ہے کہ اس شخص کے تمام اوصاف وکمالات کی تصویر ابھر کر سامنے پھر جاتی ہے۔ اس کا چلنا پھرنا ہنسنا بولنا، اٹھنا بیٹھنا غرض کہ روزمرہ کے تمام معمولات کی ایسی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جس سے اس شخص کے ظاہری و باطنی خدوخال ہمارے سامنے واضح ہو جاتے ہیں اور قاری اسے نہ دیکھ کر بھی دیکھا ہوا محسوس کرتا ہے۔ نثار احمد فاروقی کے بقول ''خاکہ کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے۔'' مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' اس صنف کی ابتدائی اور اب تک کی بہترین مثال ہے۔ مولوی عبدالحق رشید احمد صدیقی، منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، مجتبیٰ حسین وغیرہ اردو کے اہم خاکہ نگار ہیں۔ اردو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش اردو تذکروں میں ملتے ہیں۔ نکات الشعرا (میر تقی میر) تذکرۂ ہندی (مصحفی) مجموعۂ نغز (قدرت اللہ قاسم) اور محمد حسین آزاد کی تصنیف آب حیات اس کی چند اہم مثالیں ہیں۔ عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں بھی اس صنف کے ابتدائی نقوش ابھرتے ہیں۔ لیکن اردو میں اسے مکمل صنف کی حیثیت سے متعارف کرنے کا سہرا مرزا فرحت اللہ بیگ کے سر ہے۔

1.3 خاکہ نگاری کا فن

1.3.1 تعریف اور قسمیں

انگریزی زبان کا لفظ Sketch اردو میں خاکہ کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ یہ صنف اردو میں انگریزی کے توسط سے آئی ہے جس کے لغوی معنی کسی کا نقشہ کھینچنا، کسی مختلف لکیروں کا خطوط کے ذریعے کسی شخص کے خدوخال اس طرح بیان کرنا کہ اس کی شخصیت کی تصویر نمایاں ہو جائے۔ یعنی خاکہ ایسی نثری صنف ہے جس میں کسی شخص کے خصائل، عادات واطوار اور سیرت و کردار اس طرح بیان ہوئے ہوں کہ اس سے اس شخص کی جیتی جاگتی، ہنستی بولتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے ابھر جائے۔ اس صنف میں مبالغے کا دخل غیر مہذب اور بے جا سمجھا جاتا ہے۔ خاکہ کسی اپنے سے وابستہ دل چسپ یادوں کی ایک تصویر ہے جو نجی تعلقات سے شروع ہو کر غیر روایتی انداز پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ کسی شخصیت کے سیاسی، ادبی کارناموں کا جائزہ نہیں ہے۔ انور ظہیر کے بقول:

> ''اس میں داخلی اور خارجی عناصر کو ہم آمیز کر کے دودھیا کاغذ پر اس طرح رکھ دیا جاتا ہے
> کہ تمام تر حقیقت بیانیوں اور سفاکیوں کے ساتھ خاکے کے کردار سے ذاتی ربط وضبط اور ہمدردی کا
> جذبہ موجِ تہہ نشیں کی طرح موجود ہو۔''

خاکہ نگاری کسی شخصیت کو الفاظ کے ذریعے زندگی عطا کرنے کا نام ہے۔ یہ خاکہ نویس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی شخصیت کو اس کے اصلی خدوخال کے ساتھ زمانے پر واضح کرے اور جس کا لکھا جائے اس کے منتخب پہلوؤں کو زیر قلم لائے۔ خاکہ نگار کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ جس کسی شخصیت کا خاکہ لکھ رہا ہو اس کے اچھے پہلوؤں کو بیان کرے، جیسا کہ نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی میں فرحت اللہ بیگ نے کیا۔ فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

> ''جہاں مولوی صاحب کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریاں بھی ظاہر کروں گا تا کہ
> مرحوم کی اصلی جیتی جاگتی تصویر کھینچ جائے۔ اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائے جو کسی کے
> خوش کرنے یا جلانے کے لیے لکھی گئی ہو۔''

خاکے کی قسمیں:

ماہرین نے خاکے کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں جن میں سوانحی خاکہ،تعارفی خاکہ،تاثراتی خاکہ،توصیفی خاکہ،مزاحیہ اورطنزیہ خاکہ اہم ہیں۔

سوانحی خاکہ: سوانحی خاکہ ایسا خاکہ ہے جس میں کسی جاننے والے کی زندگی اور واقعات کوتسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں پر یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ بیان ایسا ہو کہ سوانحی خاکہ ہی رہے سوانح نہ بننے پائے۔اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ خاکہ نویس غیر ضروری تفصیلات سے اجتناب کرتے ہوئے ایجاز واختصار سے کام لے اور زندگی کے تمام اہم واقعات کو غیر جانب داری سے بیان کردے۔ جیسا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی میں کیا ہے۔

تعارفی خاکہ: یہ ایسا خاکہ ہے جس میں کسی شخصیت کی زندگی اور اس کی سیرت کا تعارفی بیان ہوتا ہے۔اس طرح کے خاکے خاکہ نویس کی ذاتی معلومات پر لکھے جاتے ہیں۔خاکہ نگار شخصیت کے ان پہلوؤں کا انتخاب کرتا ہے جو عوام کی نظر سے اوجھل ہیں۔یعنی وہ قاری کے سامنے ایسا تعارف پیش کرتا ہے کہ شخصیت کے وہ چھپے پہلو اجاگر ہوتے ہیں جن سے اب تک کچھ لوگ ہی متعارف ہو سکے تھے۔

تاثراتی خاکہ: یہ کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے۔اس طرح کے خاکوں میں خاکہ نگار شخصیت سے متعلق اپنا تاثر پیش کرتا ہے۔جس کردار کا وہ انتخاب کرتا ہے اس کی ہو بہو تصویر پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ایسا کرتے ہوئے وہ جذباتی قرابت اور ذاتی رشتے سے قطعی طور پر اجتناب برتتا ہے۔اس طرح کے خاکوں میں کئی شخصیتوں کا عکس نظر آتا ہے۔

توصیفی خاکہ: یہ خاکے کی ایسی قسم ہے جس میں خاکہ نگار اپنے ذاتی تجربات اور جس شخص کا خاکہ لکھ رہا ہے اس کے اوصاف اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی تمام خوبیاں قاری کے سامنے اجاگر ہو جاتی ہیں۔اس طرح کے خاکوں میں عام طور پر شخصیت کے منفی پہلو سے احتراز کیا جاتا ہے اور صرف اس کی خوبیوں کی جانب ہی مکمل توجہ ہوتی ہے۔

مزاحیہ خاکہ: خاکے میں عام طور پر مزاح کا عنصر اس لیے شامل کیا جاتا ہے کہ قاری سنجیدگی کی گرفت میں آنے کی وجہ سے مضمون کی جانب سے بیزار نہ ہونے پائے۔اردو میں کچھ خاکے ایسے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد خاکہ نگار شخصیت کے ان پہلوؤں کے بارے میں لکھتا ہے جس سے جس شخصیت کا خاکہ لکھا جارہا ہے اس کی زندگی کے مزاحیہ پہلو اجاگر ہو سکیں۔

طنزیہ خاکہ: اردو میں طنزیہ خاکوں کی تعداد بہت کم ہے۔اس پر لکھنا اس وجہ سے بھی بہت مشکل ہے کہ اگر حد درجہ احتیاط ملحوظ نہ رکھا جائے تو طنز ہجو بن جاتا ہے۔ایسے خاکوں میں خاکہ نگار ایسے جملوں کا استعمال کرتا ہے جسے پڑھ کر قاری بے ساختہ مسکرا اٹھے۔

1.3.2 اجزائے ترکیبی

ا۔اختصار ۲۔وحدت تاثر ۳۔کردار نگاری ۴۔واقعہ نگاری ۵۔منظر کشی ۶۔اسلوب بیان

اختصار: خاکہ نگاری کے اجزائے ترکیبی میں پہلا جز اختصار ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ کا کہ نویس غیر ضروری تفصیلات سے پرہیز کرتے ہوئے شخصیت کے اہم،اچھوتے اور دل چسپ پہلوؤں پر ہی نظر رکھتا ہے اور انھیں سادے اور دلچسپ انداز میں بیان کر دیتا ہے۔

وحدت تاثر: وحدت تاثر افسانے کے اہم اجزائے ترکیبی میں سے ایک ہے۔یہ افسانے سے مختلف ایک مخصوص داخلی ترتیب کی صورت زندگی کے حالات وواقعات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ تمام واقعات ایک دوسرے سے شیر وشکر ہو جاتے ہیں۔خاکہ نویس اپنی جدت طرازی سے ایسا تاثر پیش کرتا ہے کہ جس شخصیت کا خاکہ پیش کیا جارہا ہے اس کا اثر تادیر قائم رہے۔

کردارنگاری: خاکہ نگاری میں کردارنگاری سب سے اہم اجزا میں سے ایک ہے۔ کیوں کہ خاکہ نویس بغیر کسی کردار کے خاکہ تخلیق نہیں کرسکتا۔اس کے لیے ضروری نہیں کہ کردار انسان یا جاندار ہی ہوں۔کردارنگاری کے حوالے سے خاکہ نگار شخصیت کے عادات واخلاق وافکاروخیالات کا اس طرح بیان کرتا ہے کہ شخصیت کے خدوخال ہمارے سامنے مکمل طور پر واضح ہوجاتے ہیں۔

واقعہ نگاری: خاکے کی بنا واقعہ پر ہی ہوتی ہے۔خاکہ نگار زندگی کے اہم اور منفرد واقعات کے انتخاب سے کردار میں ایسا رنگ بھرتا ہے کہ اس کی انفرادیت واضح ہوجاتی ہے۔بعض دفعہ خاکہ نگار اپنی جودت طبع سے معمولی واقعے کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ شخصیت کا ضروری حصہ لگنے لگتا ہے۔اس طرح واقعہ نگاری کے ذریعے شخصیت کے خدوخال اور اس کے معاملات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

منظرکشی: کسی خاکے کے لیے منظرکشی ایک لازمی اوراہم جزو ہے۔خاکہ نگار اپنے خاکوں میں رنگ بھرنے کے لیے مناظر کا سہارا لیتے ہیں۔اس سے خاکے میں جان پڑ جاتی ہے اور قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔

اسلوب بیان: اسلوب بیان کو خاکے میں کافی اہمیت حاصل ہے۔خاکے کو کامیاب اور ناکام بنانے میں اسلوب بیان کا بڑا دخل ہے۔صابرہ سعید لکھتی ہیں:

> ''بیان کی صناعی کے ذریعے ہی خاکہ نگار کسی شخصیت کو اس کے معائب ومحاسن،قوتوں اور کمزوریوں،لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ لفظوں میں اسیر کرسکتا ہے۔''
>
> (اردوادب میں خاکہ نگاری،صفحہ:۳۷)

اسلوب بیان کی وجہ سے کسی صنف میں جان پڑ جاتی ہے۔خاکہ نگار بات میں اثر پیدا کرنے کے لیے خوب صورت زبان و بیان کا استعمال کرتا ہے۔اس درمیان خاکہ نگار اس بات کا مکمل دھیان رکھتا ہے کہ قاری کا ذہن نفس مضمون سے ہٹ کر زبان کی چاشنی میں الجھ کر نہ رہ جائے۔

1.4 اردو میں خاکہ نگاری کی ابتدا

اردوخاکہ نگاری کی ابتدائی نقوش نظم ونثر دونوں جگہ دستیاب ہیں۔نظم میں یہ قصیدوں میں منعکس ہوتا ہے۔مدحیہ یا ہجویہ قصیدے میں شاعر کسی شخصیت کی تعریف یا اس کا خاکہ اڑا رہا ہوتا ہے۔تعریف کے بہ طور شاعر کسی شخص کے اوصاف اور فنی خوبیوں کو بیان کرتا ہے جب کہ ہجویہ قصائد کے ذریعہ وہ جس شخص کا بیان کررہا ہوتا ہے اس کی خامیوں،بے اعتدالیوں اور عیوب پر بات کرتا ہے۔یہی صورت حال مرثیہ میں بھی دکھائی پڑتی ہے۔اس صنف میں زیادہ تر واقعات کربلا کا بیان ہوتا ہے۔اس میں مراثی نگار کربلا میں حصہ لینے والوں کے کرداران کی بہادری،شجاعت،دلیری اور حوصلے کا بیان کرتا ہے۔مخالف فریق کی عیاریوں،سازشوں اور چالبازیوں کو بھی پیش کرتا ہے،چونکہ یہ بہ طور خاکہ ایک صنف کی حیثیت سے نہیں ہوتا ہے لہٰذا یہاں یہ نہیں کہا جانا چاہیے کہ راقم نے خاکہ کے اصول کی پاسداری نہیں کی۔اس حوالے سے مثنوی کے کردار بہت اہمیت کے حامل ہیں۔نثر میں افسانہ،ناول،خصوصاً ڈراما میں خاکہ کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔یہی سارے عوامل مل کر خاکہ ایک مختلف صنف کے آلہ کار بنے۔

1.5 اردو میں خاکہ نگاری کا ارتقا

اردوخاکہ نگاری کو بحیثیت مکمل صنف متعارف کرانے اور شہرت ومقبولیت عطا کرنے میں فرحت اللہ بیگ کا نام سرفہرست ہے۔ان کا

شہرہ آفاق خاکہ ''مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' نے اس صنف کے لیے راستہ ہموار کیا۔ان کے ہم عصروں میں رشید احمد صدیقی اور مولوی عبدالحق کا نام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے۔

مولوی عبدالحق نے ''چند ہم عصر'' کے عنوان سے خاکوں کا مجموعہ تحریر کیا جس کی اشاعت ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔اس مجموعہ میں منشی امیر احمد، مرزا حیرت، سید محمود، مولوی چراغ علی، مولوی محمد عزیز مرزا، شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی، خواجہ غلام الثقلین، حکیم امتیاز الدین، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، گدڑی کا لال، نور خان، محسن الملک، مولانا محمد علی مرحوم، شیخ غلام قادر گرامی، حالی، راس مسعود، میرن صاحب، نام دیو۔مالی، سر سید احمد خان۔ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا حسرت موہانی، آہ۔عبدالرحمٰن صدیقی، درویش پروفیسر۔ری ہٹ سک، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، نواب عماد الملک، پروفیسر مرزا حیرت اور خالدہ ادیب خانم سمیت کل ۲۴ خاکے موجود ہیں۔اس مجموعہ میں چند گمنام اور کم شناس اشخاص کے خاکے بھی موجود ہیں۔حالی کا خاکہ سب سے زیادہ کتاب کی شہرت کا باعث بنا۔اس میں نام دیو مالی کا خاکہ بھی ملتا ہے جسے ایک نیک دل اور فرض شناس شخص کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

> ''وہ بہت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور منکسر المزاج تھا۔اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کے ملتا۔غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی۔اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔''
>
> (چند ہم عصر: مولوی عبدالحق، ص ۲۳۱۔۲۳۰)

خاکوں کا یہ مجموعہ سب سے پہلے اردو اکیڈمی سندھ نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔۱۹۵۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔بھارت میں پہلے پہل اس مجموعہ کی اشاعت انجمن ترقی اردو ہند سے ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔مولوی عبدالحق نے اس کتاب میں خاکہ نگاری کے تمام لوازمات کو بطور حسن و خوبی سے برتا ہے۔کتاب کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔صابرہ سعید اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ ''مولوی صاحب صرف چند ہم عصر ہی لکھتے اور کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی اردو میں ان کا نام ہمیشہ عزت واحترام سے صاحب طرز انشا پردازی کے ساتھ لیا جاتا۔''

رشید احمد صدیقی نے ''گنج ہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' کے عنوان سے دو خاکوں کے مجموعے خلق کیے۔اول الذکر کی اشاعت ۱۹۳۷ء اور آخر الذکر ۱۹۶۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔گنج ہائے گرانمایہ میں رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ کے ماحول کی بہترین عکاسی کی ہے۔رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ سے بے پناہ لگاؤ تھا۔یہ مجموعہ اس عقیدت و لگاؤ کی مرقع کشی ہے۔اس میں جن قابل ذکر اشخاص کے خاکے ملتے ہیں ان میں اصغر گونڈوی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، سجاد حیدر یلدرم اور مولوی عبدالحق کے نام قابل ذکر ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے خاکوں کا خاصہ یہ ہے کہ انہوں نے ذاتی تعلقات اور شخصی مراتب کو خود پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ان کا خاکہ ''ذاکر صاحب'' اور ایک چپراسی ''کندن'' بہت مقبول و مشہور ہوئے۔وہ انسان کو مقام و مرتبے سے نہیں تولتے ہیں بلکہ ان کی نظر میں انسان اپنے کردار عمل اور کارناموں سے پہچانا جانا چاہئے۔رشید احمد صدیقی کا طرز اسلوب نہایت دلکش ہے۔ان خاکوں میں ان کے اسلوب کی دلکشی جا بہ جا دکھائی دیتی ہے۔ان کے یہاں مستعمل تشبیہات واستعارات میں بھی ایک الگ جاذبیت دیکھنے کو ملتی ہے۔مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحضہ ہو:

> ''ہم سب میں جو لوگ مرزا صاحب کے صحیفۂ خوشنودی میں کوئی ممتاز مقام اور موصوف کو یقین دلا چکے ہوتے کہ ہم کو لکھنے پڑھنے کا کام دوسروں سے زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ان موصوف یا وثیقہ مقرر کر دیا تھا، جسے مغلوں کے پنج ہزاری یا سہ ہزاری منصب دار ہوتے، اسی طرح مرزا صاحب کے یہاں پنج سیری تک کے منصب دار ہوتے

تھے۔‘‘

(کندن، مشمولہ ہم نفسان رفتہ از رشید احمد صدیقی۔ص،۱۶۰۔۱۵۹، سرسید بک ڈپو علی گڑھ،۱۹۷۴ء)

رشید احمد صدیقی کی نثر میں قول محال، رمزیت، ایمائیت اور صنعت کا خوب خوب استعمال ہوتا ہے۔ان کے استعمال سے ان کی تحریروں میں جگہ جگہ دلکشی، رعنائی اور انفرادیت نظر آتی ہے۔ایک مثال دیکھئے۔’’بڑے آدمی چھوٹی بات کر کے بڑے بنے رہتے ہیں اور چھوٹا آدمی بڑے کام کر کے بھی چھوٹا ہی رہ جاتا ہے۔اسے کیا کہئے۔‘‘

خاکہ’’کندن‘‘ کا شمار نہ صرف رشید احمد صدیقی بلکہ اردو خاکہ نگاری میں سرفہرست خاکوں میں ہوتا ہے۔کندن ایک جفاکش اور محنتی چپراسی ہے۔رشید احمد صدیقی نے اس کی محنت اور لگن سے متاثر ہو کر اس کو خاکے کا موضوع بنایا۔اس میں انہوں نے ایک معمولی چپراسی کی غیر معمولی صلاحیتوں کا بیان کیا ہے جو اپنے کام کو ایمانداری اور لگن سے کرتا ہے۔وہ اس کے غیر معمولی حافظہ اور انتظامی امور میں ماہر ذہن کو خوب خوب سراہتے ہیں۔اس کی ایک مثال دیکھئے:

’’میرا خیال ہے کندن شاید اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے ہندی رسم خط میں کچھ ہندسے یا ایک آدھ عبارت نوٹ کر لیتا ہو لیکن اس کی اٹکل اور قوت حافظہ غیر معمولی تھی۔اپنے کاموں کے علاوہ مدتوں وہ امتحان کے دفتر میں بہت سے کام انجام دیتا رہا۔اس دفتر میں کام کرنے کی ذمہ داری ہر شخص کے سپرد نہیں کی جاسکتی تاوقتیکہ اس پر کامل بھروسہ نہ ہو۔کندن کی ایمانداری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتر کا ہی نہیں دوسرے نیم سرکاری اور پرائیوٹ کام بے تکلف سپرد کر دئے جاتے تھے۔کندن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا۔جو وہ کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔دفتر نے ایک بار بالکل نئی سرکاری بائیسکل پر اسے بینک یا سنٹرل پوسٹ آفس کسی ضروری کام سے بھیجا۔کندن نے آکر بتایا کہ سائیکل کوئی اٹھالے گیا۔اس کی اطلاع تو احتیاطاً پولیس کو کرنی تھی لیکن یونیورسٹی میں کسی نے کندن سے سوال جواب نہیں کیا۔یہ بات مان لی گئی کہ سائیکل چوری ہو گئی اور بس۔‘‘(ایضاً۔ص،۱۶۶)

شاہد احمد دہلوی خالص دل کی ٹکسالی زبان میں خاکے لکھتے ہیں۔ان کا اسلوب شدید شگفتہ اور سلیس ہے۔ان خاکوں کے دو مجموعے’’گنجینۂ گوہر‘‘اور’’بزم خوش نفساں‘‘ ہیں۔’’گنجینۂ خوش گوہر‘‘میں اور’’بزم خوش نفساں‘‘میں ۲۶ خاکے ہیں۔ان خاکوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاہد احمد دہلوی کو اس صنف سے خاصا لگاؤ تھا۔

اشرف صبوحی ایک مشہور خاکہ نگار ہیں۔انہوں نے’’دل کی چند عجیب ہستیاں‘‘میں دہلی کے وضع دار اشخاص کو خاکوں کا موضوع بنایا ہے۔انہوں نے اپنے قلم کی طاقت سے دہلی کے غربت مند اور وضع دار شخصیتوں اور ان دم توڑ رہی ثقافتوں کو زندہ کیا ہے۔ان خاکوں سے دہلی کے عظمت پارینہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ان کا دوسرا مجموعہ’’غبار کارواں‘‘ ہے۔اس مجموعہ میں بھی غیر معروف افراد کے خاکے ملتے ہیں۔

عبدالرزاق کانپوری کا خاکہ’’یادِ ایام‘‘میں بیس شخصیت کے خاکے ملتے ہیں۔اس تصنیف کا پہلا خاکہ سرسید احمد خان سے متعلق ہے جب کہ آخری خاکے کا تعلق سرسید احمد خان کے پوتے سرراس مسعود سے ہے۔عبدالرزاق کانپوری کے خاکوں کا اسلوب شگفتہ اور دلچسپ ہے۔بیان میں لطافت کے ساتھ سادگی بھی ملتی ہے جس سے خاکے میں آکر تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ان خاکوں کی نوعیت سوانحی ہے۔

اردو ادب کے معروف ادیب عبدالماجد دریابادی نے اردو کا طویل ترین خاکہ لکھ کر خاکہ نگاری کی صف میں اپنا مقام بنایا۔’’محمد علی: ذاتی

ڈائری کے چنداوراق''(اردو کا طویل ترین خاکہ)،''وفیاتِ ماجدی''اور''معاصرین''ان سے یادگار ہیں۔''وفیات ماجدی''میں باسٹھ(۶۲) جب کہ''معاصرین میں کچھ اسّی (۸۰) خاکے موجود ہیں۔عبدالماجد دریابادی کا قلم بڑا زرخیز تھا۔ان کے خاکوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے انسان کی نفسیات کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ان میں خاکہ نگاری کے لئے لازم ضروری صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

خواجہ محمد شفیع دہلوی نے دہلی کی قدیم شخصیتوں کو اپنے خاکوں کا موضوع بنایا۔ان کے مجموعہ''دلی کا سنبھالا'' جو کہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ میں شخصیات کے علاوہ''جامع مسجد''،''جامع مسجد کا چوک'' اور''بزمِ سخن'' جیسے خاکے بھی ملتے ہیں۔شخصیات میں خواجہ امان (مترجم: بوستانِ خیال)،اسداللہ خاں غالب،منشی ہرگوپال تفتہ،منشی بالمکند بےصبر نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ،استاد ذوق،محمد حسین آزاد اور پنڈت ہردے ناتھ (ستار نواز) اور میر کاظم علی خاں جیسی شخصیت کے خاکے ملتے ہیں۔

عبدالمجید سالک نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور کامیاب خاکے لکھے ہیں۔''یارانِ کہن''ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے جس میں کل ۲۰ خاکے ملتے ہیں جو مولانا محمد علی،علامہ اقبال،مولانا ابوالکلام آزاد،میاں فضل حسین،آغا حشر کاشمیری،مولانا حسرت موہانی،خواجہ حسن نظامی اور چراغ حسن حسرت جیسی اہم شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔

مالک رام بنیادی طور پر محقق ہیں۔انہیں ماہر غالبیات میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔انہوں نے''وہ صورتیں الٰہی'' کے نام سے خاکوں کا مجموعہ تخلیق کیا جن میں مرزا غالب،سید سلیمان ندوی،برج موہن دتا تریہ کیفی اور یگانہ جیسی اہم ادبی شخصیات پر خاکے ملتے ہیں۔

فرقت کاکوروی کی ادبی پہچان ایک مزاح نگار کی ہے لیکن انہوں نے خاکہ نگاری کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی۔ان کا مزاحیہ رنگ اور دلچسپ انداز بیان اس صنف میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔''مداوا''،ناروا''اور''صید وہدف''ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔

ان کے علاوہ بشیر احمد ہاشمی اور سید اعجاز حسین نے اس صنف میں سخن آزمائی کی ہے۔بشیر احمد ہاشمی کا مجموعہ''گفت وشنید''ریڈیائی مضامین کا مجموعہ ہے۔جس میں مصنف نے مختلف پیشوں سے منسلک افراد کے خاکوں کے ذریعہ ان کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔۔سید اعجاز حسین نے''ملک ادب کے شہزادے'' کے عنوان سے خاکوں کا مجموعہ لکھا جس میں کل چوالیس (۴۴) خاکے ملتے ہیں۔

1.5.1 آزادی کے بعد خاکہ نگاری

ملک کی آزادی جہاں ایک طرف مسرت کا پیغام لے کرآتی ہے وہیں دوسری طرف تقسیم کا کرب بھی ابھر کرآیا جس کا اثر شعروادب پر بھی پڑا۔اردو ادب لکھنے،پڑھنے اور بولنے والے دو الگ الگ ملکوں میں منقسم ہوگئے لیکن ادب سرحدوں کا پابند نہیں ہوتا ہے۔خاکہ نگاروں کے فن کو کمال عروج تک پہونچانے میں دونوں طرف کے ادیبوں نے اپنا خون جگر صرف کیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد جن خاکہ نگاروں نے اپنی جرات طبع اور انفرادیت سے اس صنف کو وقار اور اعتبار بخشا ان میں عصمت چغتائی کا نام اہمیت سے ذکر کیے جانے لائق ہے۔عصمت کا شمار اردو کے چند مایہ ناز فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی فکشن نگاری سے ایک عہد کو متاثر کیا ہے۔عصمت نے اپنے بھائی عظیم جو کہ خود ایک صاحب طرز ادیب ہیں کا خاکہ''دوزخی'' کے عنوان سے تحریر کیا۔اس خاکے کا شمار اردو کے چند بہترین خاکوں میں ہوتا ہے۔اس خاکے کا طرز اسلوب اس کی مقبولیت کا سب سے اہم جز و ہے۔اس خاکے کے متعلق سعادت حسن منٹو کا کہنا ہے کہ''شاہجہاں نے اپنی محبوبہ کی یاد قائم رکھنے کے لیے تاج محل بنوایا۔عصمت نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں دوزخی لکھا۔'' یہ بچپن سے بیمار،کمزور اور لاغر بھائی کی نفسیاتی کشمکش کا بیانیہ ہے۔عصمت نے اس کے علاوہ مجاز لکھنوی کا خاکہ بھی لکھا ہے۔

عصمت اور منٹو دونوں ہی باغی ذہن کے ادیب ہیں۔منٹو نے خاکوں کے تین مجموعے بطور یادگار چھوڑے ہیں۔''گنجے فرشتے

’’،’’لاؤڈاسپیکر‘‘اور’’شخصیتیں‘‘ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ان میں سب سے زیادہ شہرت’’گنجے فرشتے‘‘ کوحاصل ہوئی۔اس میں منٹو نے ادب،قلم اورسیاست سے تعلق رکھنے والے اشخاص کواپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے۔اس مجموعے کے دیباچہ کا ذیل جملہ بہت مشہور ہوا۔وہ لکھتے ہیں

> ’’آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہوسکتی،اس کے منہ سے میں گالیوں کے بجائے پھول نہیں جھڑا سکا۔میراجی کی ذلالت پر مجھ سے استری نہ ہوسکی......اس کتاب میں جوفرشتہ بھی آیااس کا منڈن ہوا ہےاور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سےادا کی ہے۔‘‘

فکرتونسوی نے’’خدوخال‘‘ کےعنوان سے۱۳خاکوں پر مشتمل ایک مجموعہ مرتب دیا۔ان خاکوں کی نوعیت توصیفی اورتعریفی ہے۔شوکت تھانوی نے خاکوں کے تین مجموعے لکھے ہیں۔ان کے نام’’شیش محل‘‘،’’قاعدہ بے قاعدہ‘‘اور’’نورتن‘‘ ہیں۔رسالہ’’نقوش‘‘ کے مدیرطفیل نے خاکوں کے سات مجموعے لکھ کراس صنف میں کافی اضافہ کیا۔یہ مجموعے اس بات کی دلیل ہیں کہ طفیل کواس صنف سے خاصا لگاؤ تھا۔غلام السیدین نے’’آندھی میں چراغ‘‘عنوان سے مجموعہ تحریر کیا۔اس میں مہاتما گاندھی، جواہرلال نہرواور ڈاکٹر ذاکرحسین سمیت ملک کے مختلف ادیبوں،شاعرو ناقد اور سیاسی وسماجی رہنماؤں کے خاکے شامل ہیں۔علی جوادزیدی کے خاکے تاثراتی نوعیت کے ہیں۔انہوں نے خاکوں کے تین مجموعے’’آپ سے ملیے‘‘،’’ہم قبیلہ‘‘،اور’’اہل قبیلہ‘‘ یادگار چھوڑے ہیں۔ضیاالدین احمد برنی کا’’عظمت رفتہ‘‘ترانوے(۹۳)خاکوں پر مبنی مجموعہ ہے۔ان خاکوں کی حیثیت شخصی ہے۔سیدصباح الدین عبدالرحمٰن نے دوجلدوں پر مشتمل’’بزم رفتگان‘‘ کےعنوان سے خاکوں کا مجموعہ لکھ چھوڑا ہے۔شورش کاشمیری کا مجموعہ’’چہرے‘‘بہت مشہور ہوا۔’’مردم دیدہ‘‘ کے نام سے چراغ حسن حسرت نے خاکوں کا مجموعہ تحریر کیا۔تخلص بھوپالی نے’’پوسٹ مارٹم‘‘،’’پان۔دان والی خالہ‘‘(تین جلد)طنزیہ ومزاحیہ خاکوں کا مجموعہ تحریر کیا۔’’پوسٹ مارٹم‘‘ میں کنہیالال کپور،شعری بھوپالی،مجتبیٰ خاں اورکیفی بھوپالی جیسے اہم شخصیات کے خاکے ملتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے مزاحیہ خاکہ نگاری میں ایک اہم مقام پیدا کیا۔انہوں نے اپنے خاکوں کے لیے احباب کومنتخب کیا۔ان کے خاکوں کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے خاکہ نگاری کے اصولوں کی مکمل پاسداری کی ہے۔’’آدمی نامہ‘‘،’’سو ہے وہ بھی آدمی‘‘،’’چہرہ در چہرہ‘‘،’’ہوئے ہم دوست جس کے‘‘،مجتبیٰ حسین کے خاکوں کے لائق ذکرمجموعے ہیں۔

صالحہ عابدحسین نےفکشن کےعلاوہ خاکہ نگاری میں ہاتھ آزمایا ہے۔’’بزم دانشوری‘‘ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔اس میں انہوں نے اپنے عہد کی معروف شخصیتوں کا خاکہ لکھا ہے۔ان کا طرزتحریرسادہ اورسلیس ہے۔ان کاقلم عورتوں کی حمایت میں اوران کی عظمت کے بیان میں سرگرداں رہتا ہے۔

رضیہ سجادظہیر نے عام انسانوں کواپنے خاکوں کا موضوع بنایا۔رضیہ سجادظہیر کے خاکے سادہ اورسلیس ہونے کے ساتھ ساتھ شگفتہ اور دلفریب ہوتے ہیں۔وہ خاکوں کے لیےایسے کردار کاانتخاب کرتی ہیں جوان کےآس پاس ہوں اورقاری جن سے آسانی سے جڑ سکے۔رضیہ سجاد ظہیر کی تصانیف’’اللہ دے بندہ لے‘‘اور’’زردگلاب‘‘میں افسانے اورخاکے دونوں شامل ہیں۔

قرۃالعین حیدر نے’’پکچرگیلری‘‘ کےعنوان سے چندخاکوں کا مجموعہ تحریرکیا۔ان میں سجادحیدر یلدرم اورابن انشاءسمیت کل چھ شخصیات پرخاکے شامل ہیں۔

یوسف ناظم نے مزاحیہ خاکہ نگاری میں اہم نام بنایا ہے۔ان کے خاکوں کے تین مجموعے’’سائے ہمسائے‘‘،’’ذکراختر‘‘اور’’علیک

سلیک'' ہیں۔ان کی زبان دلچسپ اور رواں ہے ۔ان کے علاوہ مولانا عبدالکلام آزاد،صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین،اطہر پرویز،خلیق انجم،وہاب عندلیب نے بھی خاکے لکھے ہیں۔معاصر خاکہ نگاروں میں وہاب عندلیب ایک اہم نام ہے۔ان کے خاکوں کا مجموعہ'' قیمت و قامت'' کافی مقبول ہوا۔خاکہ نگاری کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

1.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

- خاکہ نگاری کے فن سے متعلق جانکاری حاصل کی
- خاکہ نگاری کے آغاز اوراس کے عہد بہ عہد ارتقا سے متعلق معلومات حاصل کی
- اردو کے پہلے باضابطہ خاکہ نگار کا سرسری مطالعہ کیا
- اہم خاکہ نگاروں کے متعلق جانکاری حاصل کی
- ابتدا سے اب تک اردو کے اہم خاکہ نگاروں کے اوران کے اہم خاکوں کے مجموعوں سے متعلق واقفیت حاصل کی
- اردو کی مایہ ناز خواتین خاکہ نگاروں اوران کے خاکوں سے متعلق جانکاری حاصل کی

1.7 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال:1۔ خاکہ نگاری کی تعریف بیان کیجیے؟

سوال:2۔ خاکہ نگاری کے فن اوراقسام پر روشنی ڈالیے؟

سوال:3۔ خاکہ نگاری کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے؟

سوال:4۔ اردو خاکہ نگاری کے اہم خاکہ نگاروں اوران کے مجموعوں کا مختصر جائزہ پیش کیجیے؟

سوال:5۔ آزادی کے بعد کے خاکہ نگاروں اوران کے مجموعوں کے نام بتایئے؟

1.8 سوالات کے جوابات

جواب1 ۔خاکہ نگاری ایک منفرد نثری صنف ہے جو غیر افسانوی ادب کے زمرے میں رکھی جاتی ہے۔خاکہ نگاری کے لغوی معنیٰ'ڈھانچہ (Structure) تیار کرنا ہے۔یہ کسی شخص کی ایسی مرقع کشی کرتا ہے کہ اس شخص کے تمام اوصاف وکمالات کی تصویر ابھر کر سامنے پھر جاتی ہے۔اس کا چلنا پھرنا ہنسنا بولنا،اٹھنا بیٹھنا غرض کہ روزمرہ کے تمام معمولات کی ایسی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جس سے اس شخص کے ظاہری و باطنی خدوخال ہمارے سامنے واضح ہو جاتے ہیں اور قاری اسے نہ دیکھ کر بھی دیکھا ہوا محسوس کرتا ہے۔نثار احمد فاروقی کے بقول'' خاکہ کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے۔'' مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ'' نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' اس صنف کی ابتدائی اوراب تک کی بہترین مثال ہے۔مولوی عبدالحق رشید احمد صدیقی،منٹو،عصمت چغتائی،قرۃ العین حیدر، مجتبیٰ حسین وغیرہ اردو کے اہم خاکہ نگار ہیں۔اردو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش اردو تذکروں میں ملتے ہیں۔نکات الشعرا (میر تقی میر) تذکرۂ ہندی (مصحفی) مجموعۂ نغز (قدرت اللہ قاسم) اورمحمد حسین آزاد کی تصنیف آب حیات اس کی چند اہم مثالیں ہیں۔عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں بھی اس صنف کے ابتدائی نقوش ابھرتے ہیں۔لیکن اردو میں اسے مکمل صنف کی

حیثیت سے متعارف کرنے کا سہرا مرزا فرحت اللہ بیگ کے سر ہے۔

جواب2۔انگریزی زبان کا لفظ Sketch اردو میں خاکہ کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ یہ صنف اردو میں انگریزی کے توسط سے آئی ہے جس کے لغوی معنی کسی کا نقشہ کھینچنا، کسی مختلف لکیروں کا خطوط کے ذریعے کسی شخص کے خدوخال اس طرح بیان کرنا کہ اس کی شخصیت کی تصویر نمایاں ہو جائے۔ یعنی خاکہ ایسی نثری صنف ہے جس میں کسی شخص کے خصائل، عادات واطوار اور سیرت وکردار اس طرح بیان ہوئے ہوں کہ اس سے اس شخص کی جیتی جاگتی، ہنستی بولتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے ابھر جائے۔ اس صنف میں مبالغے کا دخل غیر مہذب اور بے جا سمجھا جاتا ہے۔ خاکہ کسی اپنے سے وابستہ دل چسپ یادوں کی ایک تصویر ہے جو نجی تعلقات سے شروع ہو کر غیر روایتی انداز پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ کسی شخصیت کے سیاسی، ادبی کارناموں کا جائزہ نہیں ہے۔ خاکہ نگاری کسی شخصیت کو الفاظ کے ذریعے زندگی عطا کرنے کا نام ہے۔ یہ خاکہ نویس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی شخصیت کو اس کے اصلی خدوخال کے ساتھ زمانے پر واضح کرے اور جس کا لکھا جائے اس کے منتخب پہلوؤں کو زیر قلم لائے۔ خاکہ نگار کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ جس کسی شخصیت کا خاکہ لکھ رہا ہو اس کے اچھے پہلوؤں کو بیان کرے، جیسا کہ نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی میں فرحت اللہ بیگ نے کیا۔ ماہرین نے خاکے کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں جن میں سوانحی خاکہ، تعارفی خاکہ، تاثراتی خاکہ، توصیفی خاکہ، مزاحیہ اور طنزیہ خاکہ اہم ہیں۔

جواب3۔خاکہ نگاری کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔اختصار ۲۔وحدت تاثر ۳۔کردار نگاری ۴۔واقعہ نگاری ۵۔منظر کشی

۶۔اسلوب بیان

جواب4۔اردو خاکہ نگاری کو بحیثیت مکمل صنف متعارف کرانے اور شہرت ومقبولیت عطا کرنے میں فرحت اللہ بیگ کا نام سر فہرست ہے۔ ان کا شہرہ آفاق خاکہ ''مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' نے اس صنف کے لیے راستہ ہموار کیا۔ مولوی عبدالحق نے ''چند ہم عصر'' کے عنوان سے خاکوں کا مجموعہ تحریر کیا جس کی اشاعت ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔ اس مجموعہ میں منشی امیر احمد، مرزا حیرت، سید محمود، مولوی چراغ علی، مولوی محمد عزیز مرزا، شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی، خواجہ غلام الثقلین، حکیم امتیاز الدین، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، گدڑی کا لال، نور خان، محسن الملک، مولانا محمد علی مرحوم، شیخ غلام قادر گرامی، حالی، سراس مسعود، میرن صاحب، نام دیو۔ حالی، سرسید احمد خان۔ ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا حسرت موہانی، آہ۔ عبدالرحمن صدیقی، درویش پروفیسر۔ ری ہٹ سک، ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، نواب عماد الملک، پروفیسر مرزا حیرت اور خالدہ ادیب خانم سمیت کل ۲۴ خاکے موجود ہیں۔ اس مجموعہ میں چند گمنام اور کم شناس اشخاص کے خاکے بھی موجود ہیں۔

رشید احمد صدیقی نے ''گنجہائے گرانمایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' کے عنوان سے دو خاکوں کے مجموعے خلق کیے۔ اول الذکر کی اشاعت ۱۹۳۷ء اور آخر الذکر ۱۹۶۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ گنج ہائے گرانمایہ میں رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ کے ماحول کی بہترین عکاسی کی ہے۔ رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ یہ مجموعہ اس عقیدت ولگاؤ کی مرقع کشی ہے۔ اس میں جن قابل ذکر اشخاص کے خاکے ملتے ہیں ان میں اصغر گونڈوی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، سجاد حیدر یلدرم اور مولوی عبدالحق کے نام قابل ذکر ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے خاکوں کا خاصہ یہ ہے کہ انہوں نے ذاتی تعلقات اور شخصی مراتب کو خود پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ ان کا خاکہ ''ذاکر صاحب'' اور ایک چپراسی ''کندن'' بہت مقبول ومشہور ہوئے۔

شاہد احمد دہلوی خالص دل کی ٹکسالی زبان میں خاکے لکھتے ہیں۔ان کا اسلوب شدید شگفتہ اور سلیس ہے۔ان خاکوں کے دو مجموعے''گنجینۂ گوہر''اور''بزم خوش نفساں''ہیں۔اشرف صبوحی ایک مشہور خاکہ نگار ہیں۔انہوں نے''دل کی چند عجیب ہستیاں''میں دہلی کے وضع دار اشخاص کو خاکوں کا موضوع بنایا ہے۔اردو ادب کے معروف ادیب عبدالماجد دریابادی نے اردو کا طویل ترین خاکہ لکھ کر خاکہ نگاری کی صف میں اپنا مقام بنایا۔''محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند اوراق''(اردو کا طویل ترین خاکہ)،''وفیاتِ ماجدی''اور ''معاصرین''ان سے یادگار ہیں۔اس کے علاوہ خواجہ محمد شفیع دہلوی کے خاکوں کا مجموعہ''دلی کا سنبھالا''،عبدالمجید سالک کا''یارانِ کہن''، مالک رام کا''وہ صورتیں الٰہی''،فرقت کاکوروی کا''مداوا''،''ناروا''اور''صید و ہدف''،بشیر احمد ہاشمی کا مجموعہ''گفت وشنید''،سید اعجاز حسین کا''ملک ادب کے شہزادے''کے عنوان سے خاکوں کا مجموعے ملتے ہیں۔

جواب 5۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جن خاکہ نگاروں نے اپنی جرات طبع اور انفرادیت سے اس صنف کو وقار اور اعتبار بخشا ان میں عصمت چغتائی کا نام اہمیت سے ذکر کیے جانے لائق ہے۔عصمت کا شمار اردو کے چند مایہ ناز فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی فکشن نگاری سے ایک عہد کو متاثر کیا ہے۔عصمت نے اپنے بھائی عظیم جو کہ خود ایک صاحب طرز ادیب ہیں کا خاکہ''دوزخی''کے عنوان سے تحریر کیا۔اس خاکے کا شمار اردو کے چند بہترین خاکوں میں ہوتا ہے۔

منٹو نے خاکوں کے تین مجموعے بطور یادگار چھوڑے ہیں۔''گنجے فرشتے''،''لاؤڈ اسپیکر''اور''شخصیتیں''ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ان میں سب سے زیادہ شہرت''گنجے فرشتے''کو حاصل ہوئی۔اس میں منٹو نے ادب،فلم اور سیاست سے تعلق رکھنے والے اشخاص کو اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے۔فکر تونسوی نے''خدوخال''کے عنوان سے ۱۳ خاکوں پر مشتمل ایک مجموعہ مرتب دیا۔ان خاکوں کی نوعیت توصیفی اور تعریفی ہے۔شوکت تھانوی نے خاکوں کے تین مجموعے لکھے ہیں۔ان کے نام''شیش محل''،''قاعدہ بے قاعدہ''اور''نورتن''ہیں۔رسالہ''نقوش''کے مدیر طفیل نے خاکوں کے سات مجموعے لکھے کر اس صنف میں کافی اضافہ کیا۔یہ مجموعے اس بات کی دلیل ہیں کہ طفیل کو اس صنف سے خاصا لگاؤ تھا۔غلام السیدین نے''آندھی میں چراغ''عنوان سے مجموعہ تحریر کیا۔

اس طرح علی جواد زیدی کے خاکوں کے تین مجموعے''آپ سے ملیے''،''ہم قبیلہ''،اور''اہل قبیلہ''ہیں۔ضیاالدین احمد برنی کا ''عظمت رفتہ''،سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا ''بزم رفتگاں''،شورش کاشمیری کا''چہرے''، چراغ حسن حسرت کا ''مردم دیدہ''کیا۔تخلص بھوپالی کا''پوسٹ مارٹم''،''پ ان۔دان والی خالہ''،''پوسٹ مارٹم''انکے خاکوں کے مجموعے ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے مزاحیہ خاکہ نگاری میں ایک اہم مقام پیدا کیا۔''آدمی نامہ''،''سو ہے وہ بھی آدمی''،''چہرہ در چہرہ''،''ہوئے ہم دوست جس کے''،مجتبیٰ حسین کے خاکوں کے لائق ذکر مجموعے ہیں۔صالحہ عابد حسین نے فکشن کے علاوہ خاکہ نگاری میں ہاتھ آزمایا ہے۔''بزم دانشوری''ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔رضیہ سجاد ظہیر نے عام انسانوں کو اپنے خاکوں کا موضوع بنایا۔رضیہ سجاد ظہیر کے خاکے سادہ اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ شگفتہ اور دلفریب ہوتے ہیں۔رضیہ سجاد ظہیر کی تصانیف''اللہ دے بندہ لے''اور''زرد گلاب''میں افسانے اور خاکے دونوں شامل ہیں۔قرۃالعین حیدر نے''پکچر گیلری''کے عنوان سے چند خاکوں کا مجموعہ تحریر کیا۔ان میں سجاد حیدر یلدرم اور ابن انشاء سمیت کل چھ شخصیات پر خاکے شامل ہیں۔یوسف ناظم نے مزاحیہ خاکہ نگاری میں اہم نام بنایا ہے۔ان کے خاکوں کے تین مجموعے''سائے ہمسائے''،''ذکر اختر''اور''علیک سلیک''ہیں۔ان کے علاوہ مولانا عبدالکلام آزاد،صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین،اطہر پرویز،خلیق انجم،وہاب عندلیب نے بھی خاکے لکھے ہیں۔معاصر خاکہ نگاروں میں وہاب عندلیب ایک اہم نام

ہے۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ''قیمت وقامت'' کافی مقبول ہوا۔خاکہ نگاری کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

1.9 فرہنگ

لفظ	:	معنی
مرقع کشی		تصویر کھینچنا
ظاہری وباطنی		حقیقی کرداراوراس کا مظاہرہ
خصائل		خصلت کی جمع
مبالغہ		کسی بات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرنا
توصیفی		خوبی
مزاحیہ		مزاقیہ
طنزیہ		طعنہ دینا
اختصار		کم کرنا،گھٹانا
صناعی		ہنرمند
ہجویہ		مذمت
منکسرالمزاج		مسکین،جس کی طبیعت میں انکسار ہو
مستحکم		پکّا،مضبوط
ٹکسالی		کھرا،جانچا ہوا،رائج

1.10 کتب برائے مطالعہ

(اردو ادب میں خاکہ نگاری،صفحہ:۳۷)

(نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی: فرحت اللہ بیگ)

(چند ہم عصر: مولوی عبدالحق،ص۲۳۱-۲۳۰)

(کندن،مشمولہ ہم نفسان رفتہ از رشید احمد صدیقی۔ص،۱۶۰-۱۵۹،سرسید بک ڈپو علی گڑھ،۱۹۷۴)

اکائی 2: فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری

ساخت

2.1 اغراض و مقاصد
2.2 تمہید
2.3 فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری
2.3.1 فرحت اللہ بیگ کی حالات زندگی
2.3.2 فرحت اللہ بیگ کی ادبی خدمات
2.3.3 فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری
2.3.4 مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی کا مختصر متن
2.3.5 خاکہ 'مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' کا تجزیہ
2.4 آپ نے کیا سیکھا
2.5 اپنا امتحان خود لیجیے
2.6 سوالات کے جوابات
2.7 فرہنگ
2.8 کتب برائے مطالعہ

2.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

فرحت اللہ بیگ کے حالات زندگی اور ادبی خدمات سے متعارف ہوں گے۔

فرحت اللہ بیگ کے خاکہ 'ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' کا جائزہ لیں گے۔

فرحت اللہ بیگ کے خاکہ 'ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' کے ذریعہ استاد اور شاگرد کے رشتے کو سمجھ سکیں گے۔

فرحت اللہ بیگ کے اسلوب پر نظر ڈالیں گے۔

فرحت اللہ بیگ کے اردو ادب میں مرتبہ و مقام کا تعین کریں گے۔

2.2 تمہید

جدید خاکہ نگاروں میں فرحت اللہ بیگ کا نام انتہائی عظمت کا حامل ہے۔ خاکہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں اشاروں کے

ذریعہ اور مختصر طور پر کسی شخص کی سیرت کے کچھ ایسے نقوش ابھارے جاتے ہیں جس سے اس کے کردار کو ایک زندہ اور حقیقی تصور مل سکے۔ جن ادیبوں نے خاکہ نگاری کے فن کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے، ان میں فرحت اللہ بیگ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی تحریروں میں جو سادگی اور سلاست روانی ہے وہ قاری کو اپنی گرفت میں لئے رہتی ہے۔ مولوی نذیر احمد پر لکھے گئے طویل خاکے اس بات کی جیتی جاگتی مثال ہے، جو طویل ہونے کے باوجود اتنے دلکش اور فصاحت رواں ہے کہ طبیعت کہیں بھی بوجھل نہیں ہوتی۔ فرحت اللہ بیگ نے دہلی کی بامحاورہ اور ٹکسالی زبان کو ادبی وقار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خاکہ نگاری کے لئے جس ژرف نگاہی، تنقیدی بصیرت، جس مزاح اور ذوق لطیف کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمام خصوصیات فرحت اللہ بیگ کے یہاں خاص طور سے موجود ہیں۔ انہوں نے شخصی خاکوں کی طرف خصوصی توجہ کی اور شخصی خاکہ نگاری کو ایک مستقل صنف کے درجے پر پہنچا دیا۔ ان کے خاکے بطور نمونے اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، انہوں نے اپنے استاد مولوی نذیر احمد کا خاکہ جس کامیابی اور فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اس کے علاوہ ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' جو ''دہلی کی آخری شمع'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، ان کی اہم تصنیف ہے جو اردو ادب کا شاہکار ہے۔ ''پھول والوں کی سیر'' بھی ان کا اہم مضمون ہے، جو 'مضامین فرحت' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

2.3 فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری

2.3.1 فرحت اللہ بیگ کی حالات زندگی

مرزا فرحت اللہ بیگ کی پیدائش ۱۸۸۳ء میں دلی کے محلے چوڑی والان میں ہوئی۔ ان کا خاندان شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ترکستان سے ہندوستان منتقل ہوا تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ شکل وصورت کے اعتبار سے مغلوں کے مشابہ تھے۔ ان کے جگری دوست غلام یزدانی نے جنہیں وہ پیار سے دانی بھی کہا کرتے تھے ان کے چہرے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

> ''رنگ نہایت سرخ وسپید، جلد صاف، ہونٹ پتلے پتلے۔ دانت چھوٹے اور پیوست چہرہ، نہ لمبا نہ زیادہ گول، آنکھیں البتہ چھوٹی چھوٹی اور ایک آنکھ دبا کر دیکھتے تھے۔''

مرزا فرحت اللہ بیگ نے قرآن اور دینی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اس کے بعد انہیں شاہ جی کے چھتے کے مدرسے میں داخل کیا گیا۔ آگے تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہندو کالج میں داخلہ لیا اور وہیں سے ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں سینٹ اسٹیفن کالج سے بی۔ اے اور پھر اسی کالج سے ایم۔ اے کیا۔ کئی جگہ ملازمت کرنے کے بعد شیشن جج کے عہدے پر فائز ہوئے اور آخری دم تک وہیں رہے۔ لیکن دلی ان کے دل میں بسی رہی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو ۶۴ برس کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

فرحت اللہ بیگ کا پہلا مضمون ۱۹۱۹ء میں رسالہ ''افادہ'' آگرہ میں شائع ہوا۔ ان کو اردو زبان وادب سے خاص دلچسپی تھی۔ ابتدا میں مرزا الم نشرح کے نام سے لکھتے تھے۔ بعد میں عظمت اللہ کی تجویز پر مرزا فرحت اللہ بیگ کے نام سے لکھنے لگے۔ ان کے مضامین ۷ جلدوں میں 'مضامینِ فرحت' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ نظم کا ایک مجموعہ 'میری شاعری' کے عنوان سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس مجموعے میں غزل، رباعی، نظم اور دوسری اصناف بھی شامل ہیں۔ فرحت اللہ بیگ نے افسانہ، تنقید، سوانح حیات اور بھی دوسری صنف پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان کی شہرت کا خاص سبب مرقع نگاری اور ان کا مزاحیہ انداز ہے۔ ان کے انتقال کے ۳۰ سال بعد ان کی ایک اور

کتاب 'مری داستان' شائع ہوئی۔جس کے ناشران کے بڑے بیٹے مرزا شرافت بیگ ہیں۔یہ کتاب دراصل ان کے ۳۴ سالہ دور ملازمت کی روداد ہے، جسے انہوں نے ۳۴ سالہ قید با مشقت سے تعبیر کیا ہے۔

2.3.2 فرحت اللہ بیگ کی ادبی خدمات

مرزا فرحت اللہ بیگ ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔وہ بیک وقت ایک خاکہ نگار، ادبی محقق، طنز و مزاح نگار، قصہ نویس، شاعر، ڈرامہ نگار اور نقاد ہیں۔لیکن اردو ادب میں ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ان کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔انہوں نے دہلی کی تہذیب کی جو تصویر کشی کی ہے اردو ادب میں اس کی دوسری مثال بمشکل نظر آتی ہے۔اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ انہیں دلی اور اس کی تہذیب سے خاص لگاؤ تھا۔انہوں نے دلی میں ایک عرصہ بسر کیا۔ان کے مضمون 'دہلی کا ایک مشاعرہ' جو کہ دیگر عنوانات: دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ اور دہلی کی آخری شمع کے عنوان سے بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔یہ مضمون دہلی کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے۔اس مضمون میں دہلی کے گرد و نواح میں واقع میلے ٹھیلے کی خوبصورت منظر کشی دکھائی پڑتی ہے۔اس مضمون میں دہلی کی ادبی محفلوں وغیرہ کا بیان نہایت مفکرانہ انداز سے پیش کیا ہے۔

فرحت اللہ بیگ نے ادبی تحریروں سے الگ دیگر موضوعات مثلاً تاریخ اور سوانح پر بھی ہاتھ آزمایا ہے۔یہاں پر بھی وہ جگہ جگہ مزاح کا سہارا لیتے ہیں۔ان کی شہرت کا سبب ان کی مزاح نگاری ہے۔یہاں پر بھی ان کے تین مضامین 'دہلی کی آخری شمع' کے علاوہ 'پھول والوں کی سیر' اور 'نذیر احمد کی کہانی ، کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی' ان کی شہرت اور مقبولیت کا خاص حصہ ہیں۔فرحت اللہ بیگ کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے کل سات مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ان مضامین کی خصوصیات فرحت اللہ بیگ کی سادہ و شگفتہ اسلوب ہے۔مرزا صاحب بلا ضرورت ثقیل الفاظ سے اجتناب برتتے ہیں۔دلی کی ٹکسالی زبان اور انداز بیاں ان کی نثر کا طرہ امتیاز ہے۔ان کے مزاج کی بزلہ سنجی اور مزاحیہ انداز بیان ان کی تحریروں میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔مرقع نگاری میں فرحت اللہ بیگ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ان کا خاصہ ہے۔

2.3.3 فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اردو کے مشہور ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ نگاری کی دنیا میں بڑی شان و شوکت سے اپنی موجودگی کا احساس کرایا۔یہ خاکہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔۱۹۲۸ء میں دلی کا یادگار مشاعرہ اور ۱۹۲۹ء میں ایک وصیت کی تعمیل ان کے دیگر مشہور خاکے ہیں۔انہوں نے ان خاکوں کے علاوہ بھی دیگر عنوان سے خاکے لکھے۔لالہ سری رام، نواب عبدالرحمٰن اور حکیم آغا اسی سلسلے کا حصہ ہیں۔مرزا فرحت اللہ بیگ نے مولوی وحیدالدین سلیم سے کئے وعدے کے بنا پر ایک خاکہ 'ایک وصیت کی تعمیل' تحریر فرما کر اپنے وعدے کا پاس رکھا۔اس خاکے کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مولوی وحیدالدین سلیم کے اوصاف کے ساتھ ساتھ ان کی شخصی کمزوریوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔انہوں نے خاکہ لکھتے وقت ذاتی رشتے کے بنا پر جانب داری سے مکمل احتراز کیا ہے۔ایک جانب جہاں ان کی تعریف و توصیف کی گئی ہے وہیں دوسری جانب غیر جانب دارانہ سلوک روا رکھتے ہوئے مولوی وحیدالدین کی کمزوریوں کو بھی زیر قلم رکھا ہے۔خاکہ لکھتے وقت فرحت اللہ بیگ کی باریک بین نظریں ہر بڑی اور چھوٹی چیز کا بنظر غائر جائزہ لیتی ہیں۔مثال کے طور پر وحید

الدین کے گھر کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

''برامدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے۔دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے۔اس پر میلی چاندنی ہے۔دو چار چوہا چکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔۔۔۔سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ کنڈ اٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔دو تین پرانے کھڑنک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔''

اس خاکے میں مولوی وحید الدین کے شخصیات کے تقریباً تمام پہلو منعکس ہوتے ہیں جیسے ان کے عادت و اطوار، پہناوا، چلت پھرت، بات چیت کا انداز وغیرہ وغیرہ۔انہوں نے یہ خاکہ مکمل غیر جانب دار ہو کے لکھا ہے۔

اسی طرح انہوں نے مولوی نذیر احمد کا خاکہ بھی تحریر کیا ہے۔اپنی اس تحریر میں انہوں نے مولوی نذیر احمد کی عادات و اطوار کو پیش کیا ہے جس سے دنیا ناواقف تھی۔اس خاکے کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ

''جو کچھ کانوں سے سنا ہے اور آنکھوں سے دیکھا ہے، لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا۔خواہ کوئی برا مانے یا بھلا۔جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کر دوں گا تا کہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھینچ جائے۔اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائے جو کسی کو خوش کرنے یا جلانے کے لئے لکھی گئی ہو۔''

مندرجہ بالا اقتباس کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی شخصیت کی مرقع نگاری میں کہیں بھی بے اعتدالی سے کام نہیں لیا اور بلاشبہہ ان کی خوبی اور خامی کے درمیان توازن کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔مولوی صاحب کی خوبیاں بیان کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا کہ انسان خواہ کتنا ہی اشرف المخلوقات کیوں نہ ہو لیکن خامیوں کا مجموعہ ہے اور ایک خاکہ نگار کی صلاحیت یہی ہے کہ وہ مرکزی کردار کو انسان کی طرح ہی پیش کرے، نہ کہ فرشتہ بنا کر۔اس لئے ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ مولوی صاحب کو بحیثیت انسان ابھاریں جس سے ان کے بنائے ہوئے کینوس پر نذیر احمد کی شخصیت کے ہر پہلو کی بھر پور عکاسی ہو سکے۔چونکہ مولوی نذیر احمد ان کے استاد ہیں اس لئے مرزا صاحب نے ان کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ بات ملحوظ رکھی ہے کہ ان کی شخصیت مسخ نہ ہونے پائے۔ان کی یہ صلاحیت قاری کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیتی جس کے سبب وہ اس طویل خاکے کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالتا ہے۔

مولوی نذیر احمد ایک خود دار اور جفا کش شخصیت کے مالک تھے۔خوشامد پسندی سے ان کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا یا یوں کہیے کہ وہ ان کے مزاج کا حصہ ہی نہیں تھی۔انہوں نے اردو ادب میں اپنی جو حیثیت قائم کی تھی وہ خود ان کی محنت اور جدو جہد کا نتیجہ تھی۔ان کی اسی کوشش و کاوش سے متاثر ہو کر مرزا فرحت اللہ بیگ ان کا خاکہ لکھنے کو متوجہ ہوئے۔عام طور پر کسی بھی شاگرد کے لئے اپنے استاد کا خاکہ لکھنا بے حد مشکل امر ہے۔فرحت اللہ بیگ بھی ابتدا میں کشمکش کا شکار تھے لیکن مولوی عبدالحق نے ان کی حوصلہ افزائی کی

جس کے سبب مرزا صاحب کو استاد محترم کا خاکہ لکھنے کی ہمت ہوئی۔

مرقع نگاری میں فرحت اللہ بیگ کو خاص مرتبہ حاصل ہے۔لیکن اپنے استاد کا مرقع اتارنے کے لئے قلم اٹھانا ایک نازک ترین مسئلے سے کم نہ تھا کیوں کہ استاد کے لئے ان کے دل میں جو عقیدت واحترام کے جزبات تھے، وہیں وہ اپنے مزاج سے بھی مجبور تھے جس میں بے باکی اور گستاخی دونوں کی بہتات تھی۔لیکن ان کو خاکہ نگاری کے فن کے ساتھ پورا انصاف بھی کرنا تھا جس سے چشم پوشی کرنا ناممکن تھا۔اس لئے خاکہ لکھنے سے قبل وہ اپنے گستاخانہ لب ولہجہ کے لئے معزرت خواہ ہیں۔لکھتے ہیں کہ:

''میں اپنے طرز بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں۔میری شوخی بعض جگہ حدِ تجاوز سے بڑھ گئی ہے لیکن اپنے قارئین کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے۔''

انہوں نے نذیر احمد کی سیرت وشخصیت کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ان کی زندگی، ان کا حلیہ، لباس، اخلاق وعادات، پڑھنے کا انداز، وقت کی پابندی، اندازِ گفتگو، وضعداری وغیرہ کا بیان نہایت وضاحت کے ساتھ کیا ہے جس میں خلوص اور محبت کے ساتھ ساتھ بے تکلفی اور شوخی کے جذبات بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔کسی شخص کا خاکہ کھینچے میں جن لوازمات کی ضرورت درکار ہے وہ فرحت اللہ بیگ کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔انہوں نے مولوی نذیر احمد سے اپنی پہلی ملاقات سے لے کر ان سے تعلیم حاصل کرنے تک کے واقعات کو اس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک فلم سی چل رہی ہے۔مولوی صاحب کے حلیے کے متعلق فرماتے ہیں:

''رنگ سانولہ مگر روکھا۔قد خاصا اونچا تھا۔مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔دہرا بدن گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل، فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا، ورزش چھوڑ دینے سے بدن مرمروں کا تھیلا ہوتا جاتا ہے، بس یہی کیفیت تھی، بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھنگنا معلوم ہونے لگا تھا۔اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا،....سر بہت ہی بڑا تھا۔مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دیئے جاتے تھے ورنہ بالوں کی کلگر سفید مقش کی صورت میں ٹوپی کے کناروں پر جھالر کا نمونہ ہو جاتی تھی۔آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، بھویں آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں۔''

2.3.4 مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی کا مختصر متن

اللہ اللہ! ایک وہ زمانہ تھا کہ میں اور دانی، مولوی صاحب مرحوم کی باتیں سنتے تھے۔ان کی ہمت ہماری ہمت بڑھاتی تھی، ان کا طرز بیان ہماری تحریر کا رہبر ہوتا تھا، ان کی خوش مذاقی خود ان کو ہنساتی اور ہمارے پیٹ میں بل ڈالتی تھی، ان کی تکلیفیں خود ان کو پرنم اور ہم کو تڑپاتی تھیں۔اور آج وہ دن ہے کہ ان کے حالات زبان قلم پر لانے سے سے ڈر لگتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ہستی اخوت

اسلامی کا سبق پڑھے ہوئے تھی۔ اس کو اپنے بل بوتے پر ترقی کرنے پر ناز تھا۔ وہ چھوٹے درجے سے بڑے درجے پر ترقی کرنا اپنا کارنامہ سمجھتی تھی۔ اس نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر دکھایا، وہ کسی کی خوشامد، کسی کی سفارش یا کسی خاندانی وجاہت کے باعث نہ تھا۔ وہ تھا اور دنیا کا وسیع اکھاڑا۔

وہ اپنے دست و بازو کے بھروسے پر اس میدان میں اترا، ہر مصیبت کا سامنا اپنی ذاتی قابلیت و ہمت سے کیا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا، اس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا اور دنیا پر بہ خوبی ثابت کر دیا کہ بے یاری اور مددگاری، ترقی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں نہیں ہیں جو بہ آسانی ہٹائی نہ جا سکیں اور خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی، ایسی چیز نہیں ہے جو مانع ترقی ہو سکے۔ جب کبھی جوش میں آتے تو ہمیشہ I am a self made man کا فقرہ ضرور استعمال کیا کرتے اور جب کبھی اس پہلو پر نصیحت کرتے، تو ہمیشہ یہی فرماتے کہ بیٹا! جو کچھ کرنا ہے خود کرو، باپ دادا کی ہڈیوں کے واسطے سے بھیک نہ مانگتے پھرو۔

انسان، فطرت سے مجبور ہے۔ جب دنیا کی نظریں اس پر پڑنے لگتی ہیں، تو وہ ہمیشہ اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے۔ جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کی نااہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی کو چھپاتی ہے، اسی طرح غریب گھرانوں کی لائق اولاد چاہتی ہے کہ ان کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں۔ یہ ہماری اخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اسلامی سبق سے بے خبری۔ ایک مولوی نذیر احمد خاں تھے، جو اپنے آباء و اجداد کا نقشہ اصلی رنگ میں دکھاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ ان کو اپنی ابتدائی غربت پر ناز تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ ''میاں! اگر لفٹننٹ گورنر کے بیٹے ہو، تو کم سے کم ڈپٹی کمشنر تو ہو جاؤ، دس روپے کے اہل کار ہو کر باپ کو لفٹیننٹ گورنر کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔''

بہر حال یہ فطرت انسانی کا خیال تھا جس نے اب تک مجھے مولوی صاحب مرحوم کے حالات لکھنے سے روکا۔ بہت کچھ لکھ لیا تھا، وہ پھاڑ ڈالا کہ کہیں انجن چھوڑ گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں۔ رہ رہ کر جوش آتا تھا اور ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے مولوی عبدالحق صاحب کا کہ انہوں نے مجھے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالہ قلم کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اب جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا، خواہ کوئی برا مانے یا بھلا۔ جہاں مولوی صاحب مرحوم کی خوبیاں دکھاؤں گا، وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کر دوں گا، تاکہ اس مرحوم کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے اور یہ چند صفحات ایسی سوانح عمری نہ بن جائیں جو کسی کیخوش کرنے یا جلانے کو لکھی گئی ہو۔

میں واقعات کے بیان کرنے میں کوئی سلسلہ بھی قائم نہ کروں گا کیونکہ یہ بناوٹ کی صورت ہے۔جس موقع پر جو کچھ سنایا دیکھا،اس کو جوں کا توں لکھ دوں گا اور ہمیشہ اس امر کی کوشش کروں گا کہ جہاں تک ممکن ہو، واقعات مولوی صاحب کی زبان میں بیان کئے جائیں۔انشاءاللہ واقعات کے اظہار میں مجھ سے غلطی نہ ہوگی، ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض نام بھول جانے کی وجہ سے چھوڑ جاؤں یا غلط لکھ جاؤں۔اب رہا سچ یا جھوٹ تو اس کی مجھے پروا نہیں۔میں اپنے محترم استاد کے حالات لکھ رہا ہوں۔ اگر سچ ہیں،تو میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔اگر جھوٹ ہیں تو وہ خود میدان حشر میں،سود در سود لگا کر تاوان وصول کر لیں گے۔

اب رہا طرز بیان،تو اس میں متانت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہوں، کیونکہ مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں متانت کو دخل دینا ان کا منہ چڑانا ہی نہیں ان کی توہین کرنا ہے، بلکہ یوں کہو کہ سید انشا کو میر اور مارک ٹوئن کو امرسن بنانا ہے۔جب اپنی زندگی میں انہوں نے میری شوخ چشمی کی ہنس ہنس کر داد دی،تو کوئی وجہ نہیں کہ اب وہ اپنی وضع داری کو بدل دیں اور میری صاف گوئی کو گستاخی قرار دے کر دعوے دار ہوں۔۔۔چل رے خامے بسم اللہ۔

1903 میں میاں دانی نے اور میں نے ہندو کالج دہلی سے ایف اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہو گئے۔ایف اے میں میرا مضمون اختیاری سائنس اور دانی کا عربی تھا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بی اے میں عربی لے لو، دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملے گی اور امتحان کی تیاری میں سہولت ہوگی۔مجھے اپنے حافظے پر گھمنڈ تھا، یہ بھی نہ سمجھا کہ اس مضمون کو سنبھال بھی سکوں گا یا نہیں، جھٹ راضی ہو گیا۔القصہ ہم دونوں بی اے کے درجہ ابتدائی میں شریک ہو گئے۔ ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمان صاحب تھے، بڑے اللہ والے لوگ تھے،عربی کا گھنٹا بہ آسانی تصوف کی باتوں میں گزر جاتا تھا، کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے،دانی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں، کمترین تو توتے کی طرح حفظ کر لیتا تھا۔اب رہی صرف ونحو،اس میں تو کورے کا کورا ہی رہا۔

سنتے آئے ہیں کہ مصیبت کہہ کر نہیں آتی، لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ عربی کے پروفیسر کہہ کر نہیں جاتے۔ایک دن جو مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا کہ کمرا خالی ہے۔دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفیٰ دے کر کعبۃ اللہ چل دیے۔پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے تو انہوں نے کورا جواب دے دیا کہ ہم عربی کی جماعت کا بندوبست نہیں کر سکتے ،بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کر لو۔ میں نے دانی سے کہا کہ بھئی تمہارے کہنے سے میں نے عربی لی تھی، اب میرے کہنے پر تم سائنس لے لو۔جس سہولت کی بنا پر تم نے میرا مضمون بدلوایا تھا،اب اسی سہولت کے

مدنظر اپنا مضمون بدلو۔ بہ قول شخصے کہ ''مرتا کیا نہ کرتا'' وہ راضی ہو گئے۔ دفتر جا کر جو لکچروں کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ مضمون تبدیل کرنے کا وقت نہیں رہا، لکچر کم رہ جائیں گے اور اس طرح بجائے دو سال کے تین سال میں شریک امتحان ہونا پڑے گا۔ سنگ آمد و سخت آمد۔

جب ''وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے'' کی صورت آن پڑی، تو دوسرے ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔ دونوں سر ملا کر بیٹھے، مشورے کیے، رزولیوشن پاس ہوئے، آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ ''خاک از تودہ کلاں بردار'' کے مقولے پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہئے۔ دلی میں دو تین بڑے عربی داں مانے جاتے تھے، ایک مولوی محمد اسحاق صاحب، دوسرے شمس العلماء مولوی ضیاء الدین خاں صاحب ایل ایل ڈی، اور تیسرے مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔ پہلے کو تو دیوانگی سے فرصت نہ تھی، اس لیے وہاں تو دال گلتی معلوم نہیں ہوئی، قرعہ دوسرے صاحب کے نام پر پڑا۔

گرمیوں کا زمانہ تھا، مولوی ضیاء الدین صاحب جامع مسجد میں رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے تھے، ہم دونوں نے بھی جا کر شام ہی سے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ڈیرے ڈال دیے۔ آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے۔ مولوی صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ خدا خدا کر کے دروازے سے قندیل نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ہم دونوں بھی ہاتھ پاؤں جھٹک، خوشامد کے فقرے کے فقرے سوچ کھڑے ہو گئے۔

ہم آخری سیڑھیوں پر کھڑے تھے، اس لئے دروازے میں سے پہلے قندیل نکلتی نظر آئی، اس کے بعد جس طرح سمندر کے کنارے سے جہاز آتی دکھائی دیتا ہے اسی طرح پہلے مولوی صاحب کا عمامہ، اس کے بعد ان کا نورانی چہرہ، سرگیں آنکھیں، سفید ریش مبارک، سفید جبہ اور سب سے آخر زرد بانات کی سلیم شاہی جوتیاں نظر آئیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے سیڑھیوں سیا ترنا اور اوپر تلے ہمارے سانس نے چڑھنا شروع کیا۔ ہم سوچتے ہی رہے کہ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں، وہ سٹ سے پاس سے نکل گئے۔

آخر ذرا تیز قدم، چل کر ان کو جا لیا اور نہایت ادب سے دونوں نے جھک کر فرشی سلام کیا۔ وہ سمجھے کوئی راہ گیر ہیں، میری وجاہت کی وجہ سے سلام کر رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھے کی سائل ہیں، ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ وہ تو سلام لیتے ہوئے آگے بڑھے اور ہم نے وہی پہلی والی ترکیب کی کہ چکر کھا کر پھر سامنے آ گئے۔ یہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکے، پوچھا، میں نے آپ صاحبوں کو نہیں پہچانا، کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟ رام کہانی بیان کر کے عرض مدعا زبان پر لائے۔ فرمانے لگے، تم کو معلوم ہے کہ میں

پنجاب یونیورسٹی کا ممتحن ہوں۔ بجنسہ اسی لہجے میں یہ الفاظ ادا کئے جیسے اس زمانے میں کوئی کہے، تم کو معلوم ہے کہ میں سی آئی ڈی کا انسپکٹر ہوں۔ لیکن ہم جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے، عرض کیا کہ ہم امتحان میں رعایت کے طالب نہیں، تعلیم میں مدد چاہتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ تم کو تعلیم دینا اور پھر ممتحن رہنا میرے ایمان کے خلاف ہے، کسی دوسرے کی تلاش کیجئے۔

ممکن ہے کہ یہ مسئلہ کوئی جزو ایمان ہو، ممکن ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی صاحب سے تعلیم نہ دینے کا حلف لے لیا ہو، بہر حال کچھ بھی ہو، انہوں نے ہم دونوں کو سلام علیکم کا ایک زور سے دھکا دے کر نوکر کو حکم دیا کہ آگے بڑھو۔ وہ حکم کا بندہ قندیل اٹھا، آگے چلا اور مولوی صاحب اس کے پیچھے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے روانہ ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں یہ دونوں قطاع الطریق پھر راستہ نہ روک لیں، مگر مولوی صاحب کے طرز عمل اور سلام علیکم کے جھٹکے نے ہم دونوں کو مضمحل کر دیا تھا۔ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور مولوی صاحب رہٹ کے کنویں کی گلی میں گھس، اپنے مکان میں داخل ہو گئے۔ چلو امید نمبر دو پر پانی پھر گیا، لیکن آئندہ کے لئے سبق مل گیا کہ ایسے زبردست دشمن پر کھلے میدان میں حملہ کرنا خطرناک ہے، ایسے رستم کو پکڑنے کے لئے شغاد بننا ضروری ہے۔

وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کونسل ہوئی اور رزولیوشن پاس ہوا کہ مولوی نذیر احمد صاحب پر حملہ عبد الرحمان کی آڑ میں کیا جائے۔ اب میاں عبد الرحمان کا حال بھی سن لیجئے۔ ان کے والد کا نام سراج الدین صاحب تھا۔ نہایت نیک اور پرہیز گار شخص تھے۔ جوتوں کی دکان تھی۔ مولوی نذیر احمد صاحب اس دکان کو ہمیشہ رقمی مدد دیا کرتے تھے اور روزانہ شام کو وہاں آکر بیٹھتے تھے۔ عبد الرحمان میرے ہم جماعت نہ تھے لیکن آپس میں میل جول بہت تھا۔ مولوی صاحب کو ان کی تعلیم کا بہت خیال تھا، چنانچہ انہیں کی وجہ سے عبد الرحمٰن نے بی اے، ایل ایل بی کے امتحانات پاس کیے۔ انہی کی وجہ سے وکالت میں ترقی کی، یہاں تک کہ مولوی صاحب ہی کی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت دہلی میں ان کی ٹکر کا کوئی مسلمان وکیل نہیں ہے۔ اس زمانے میں یہ ایف اے میں پڑھتے تھے۔

بہر حال اسکیم تیار ہو گئی اور دوسرے ہی دن میں نے عبد الرحمان کو گانٹھنا شروع کیا۔ دو ایک روز کے بعد ان سے اظہار مطلب کیا۔ کہنے لگے کہ بھئی مولوی صاحب کو فرصت کم ہے کہیں انکار نہ کر بیٹھیں۔ میں نے کہا کہ میاں عبد الرحمان! تم ان تک ہم کو پہنچا دو، اگر ہو سکے تو ایک دو کلمہ خیر بھی ہمارے حق میں کہہ دو، آگے ہم جانیں اور ہماری قسمت۔ وہ راضی ہو گئے اور کہا کہ شام کو آٹھ بجے دکان پر آجانا، میں مولوی صاحب سے ملوا دوں گا، اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔

ٹھیک آٹھ بجے ہم دونوں سراج الدین صاحب کی دکان پر پہنچے۔ یہ دکان فتح پوری کی مسجد کے قریب تھی۔ جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب بیٹھے سراج الدین سے کچھ رقم کا حساب کر رہے ہیں۔ ہم نے جاتے ہی فرشی سلام کیے اور خاموش تخت کے کونے پر بیٹھ گئے۔ سراج الدین صاحب نے خیریت پوچھی، عبدالرحمان ہمارے پاس آ بیٹھے، مگر مولوی صاحب روپیوں کے حساب کتاب میں اس قدر مشغول تھے کہ انہوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون آیا، کون گیا۔ میں نے سوچا کہ یہاں بھی معاملہ پٹتا معلوم نہیں ہوتا، دھتکار سن کر یہاں سے بھی نکلنا پڑے گا۔ سچ ہے، مایوسی انسان کو ہمت والا بنا دیتی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا، میں نے بھی سوچ لیا کہ آج اس پار یا اس پار۔ مولوی ضیاءالدین صاحب تو بچ کر نکل گئے، لیکن مولوی نذیر احمد صاحب سے دو دو ہاتھ ہو جائیں گے۔

قصہ مختصر، مولوی صاحب حساب سے فارغ ہوئے اور پوچھا کہ یہ دونوں صاحب کون ہیں؟ عبدالرحمان نے ہمارے نام بتائے، کچھ الٹے سیدھے خاندانی حالات بھی بیان کئے، اس کے بعد ہماری مصیبت کا بھی ذرا سا تذکرہ کیا اور خاموش ہو گئے۔ میں نے دل میں کہا، پرائے برتے کھیلا جوا، آج نہ موا کل موا۔ اب میاں عبدالرحمان کو رہنے دو، جو کچھ کہنا ہے خود کہہ ڈالو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں سے بھی بے نیل مرام باضابطہ پسپائی ہو۔ میں نے نہایت رقت آمیز لہجے میں اپنی مصیبت کا تذکرہ شروع کیا۔ فرمانے لگے، تو عربی چھوڑ دو، سائنس پڑھو۔ بیٹا! آج کل مسلمانوں کو سائنس کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں مثل ہے، پڑھیں فارسی بیچیں تیل، یہ دیکھو قدرت کے کھیل۔ فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لو گے، عربی پڑھ کر تیل بیچنا بھی نہ آئے گا۔

2.3.5 خاکہ 'ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' کا تجزیہ

فرحت اللہ بیگ نے اپنے محترم استاد ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ پیش کر کے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ یہ ایک نہایت ہی مشکل کام تھا کیونکہ اس سے قبل خاکہ نگاری کے مثالی نمونے موجود نہیں تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے لئے یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا اور اس کسوٹی پر وہ بالکل کھرے ثابت ہوئے۔ حالانکہ ابتدا میں وہ کشمکش میں رہے لیکن مولوی عبدالحق کی حوصلہ افزائی نے ان کے فن کو تقویت بخشی اور وہ اپنے استاد نذیر احمد کا خاکہ پیش کرنے میں کامیاب رہے۔ اس خاکے میں وہ تمام فنی خوبیاں موجود ہیں جو اسے کامیاب بناتے ہیں اس لئے یہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک طرف فرحت اللہ بیگ کی مضحکہ خیز طبیعت اور دوسری طرف ان کے سادہ اور دلچسپ اندازِ بیان نے اس خاکے میں چار چاند لگا دیے۔ یہی وجہ ہے کہ طویل ہونے کے باوجود بھی ابتدا سے آخر تک یہ قاری کو اپنی گرفت میں لئے رہتا ہے۔ وحدت تاثر شروع سے آخر تک قاری کو پورا خاکہ پڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس سے متعلق ڈاکٹر صابرہ سعید رقم طراز ہیں:

''حلیہ اتار دینا یا یہ ہیئت کی تصویر کشی کرنا کسی اہل قلم کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں لیکن صورت

وجسمانی نقوش کے ساتھ شخصیت ،فطرت،سیرت اور اندازِ فکر کی عکاسی کرنا کہ شخصیت جلوت کے ساتھ خلوت میں بھی بے نقاب ہو جائے انتہائی دشوار ہےلیکن مرزا فرحت اللہ بیگ نے شکل وشباہت کے ساتھ سیرت اور انداز فکر کو اس قدر چابکدستی سے مربوط کرتے ہیں کہ ماضی کی بے جان شخصیت حال کے پردے پر زندہ اور متحرک نظر آتی ہے۔''

(اردو میں خاکہ نگاری: ڈاکٹر صابرہ سعید۔۱۹۷۸ء،مکتبہ شعروحکمت،حیدرآباد،ص۔۱۸۴)

یہ بات بالکل درست ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے مولوی نذیر احمد کی جیتی جاگتی تصویر سپرد قرطاس کر دی۔ان کے جسمانی نقوش،رنگ روپ،عادات واطوار،رکھ رکھاؤ وغیرہ کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ جیسے ان کی چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی ہو:

''رنگ سانولا مگر روکھا۔قد خاصا اونچا تھا۔مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔دہرا بدن گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل،فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا،ورزش چھوڑ دینے سے بدن مرمروں کا تھیلا ہوتا جاتا ہے،بس یہی کیفیت تھی،بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھنگنا معلوم ہونے لگا تھا۔اس کا تکملہ اونچی تر کی ٹوپی سے کر دیا جاتا......آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں بھنویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں۔آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔وہ چمک نہیں جو غصہ کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی،اگر میں ان کو''مسکراتی ہوئی آنکھیں'' کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔کلہ جبڑا بڑا زبردست پایہ تھا چونکہ دہانہ بھی بڑا تھا اور پیٹ کے محیط نے سانس کے لیے گنجائش بڑھا دی تھی،اس لیے نہایت اونچی آواز میں بغیر سانس کھینچے بہت کچھ کہہ جاتے تھے......ناک کسی قدر چھوٹی تھی،اور نتھنے بھاری،ایسی ناک کو گنواروں کی اصطلاح میں گاجر اور دلی والوں کی بول چال میں ''پھلکی'' کہا جاتا ہے،گو متانت چھو کر نہیں گئی تھی لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود متانت پیدا کر دی تھی......

اب رہی لباس کی بحث تو اس کا بھی حال سن لیجیے،جنہوں نے اسٹیج پر ان کو شالی رومال باندھے،کشمیری جبّہ یا ایل۔ایل۔ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے۔انہوں نے عالی جناب شمس العلما مولوی،حافظ ڈاکٹر نذیر احمد خاں صاحب ایل۔ایل۔ڈی مدظلہ العالی کو دیکھا ہے،مولوی نذیر احمد صاحب کو نہیں دیکھا،ان کے گھر کے اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا،اگر ان کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا تو لباس کی حد ہی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی،جب شام کو گھر سے نکلتے تو عموماً تر کی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے،گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن اور سفید کرتہ پائجامہ ہوتا،اور جاڑوں میں کشمیر کی اچکن یا کشمیری کام کا جبّہ چونکہ

سراج الدین صاحب سے لین دین تھا۔اس لیے لال تری کا سلیم شاہی جوتا زیادہ استعمال کرتے تھے۔''

فرحت اللہ بیگ کی سب سے اہم خصوصیت جزئیات نگاری ہے۔ان کی نگاہ اتنی دوررس اور باریک بین ہے کہ وہ جس بھی چیز کا بیان کرتے ہیں اس کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بڑی صفائی سے قاری کے سامنے یوں رکھتے ہیں کہ اس سے اس شئے کی مکمل تفہیم قاری تک ہو جاتی ہے۔ان کی تحریریں اپنی جزئیات نگاری کی وجہ سے قاری کو مکمل باندھے رکھ سکنے میں کامیاب رہ سکتی ہیں۔فرحت اللہ بیگ کی ایک اور خصوصیات ان کا اسلوب بیان اور طرز نگارش ہے۔فرحت اللہ بیگ ان چنندہ قلمکاروں میں سے ہیں جن کا ایک خاص ظریفانہ رنگ ہے جو انہیں ہمعصر انشاپردازوں سے ممتاز کرتا ہے۔ان کی زبان میں ایسی چاشنی ہے جس کا ذائقہ پڑھنے والوں کو کافی دیر تک گدگداتا ہے۔

فرحت اللہ بیگ اپنے مضامین میں محاورات کا خوب خوب استعمال کرتے ہیں۔ان کے محاورے اردو، فارسی اور ہندی سے ماخوذ ہیں۔محاورے کے اس برمحل استعمال سے ان کی تحریروں میں کسی طرح کی لغزش یا کمزوری پیدا نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ ان محاوروں کے ذریعہ وہ اس تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں جو موضوعِ سخن ہے۔سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ:

''فرحت کی زبان شگفتہ، فارسی آمیز اور بعض اوقات تمسخر کچھ اس طرح ملا ہوا ہے جس میں پھول اور کانٹے نظر آئیں۔''

فرحت اللہ بیگ کے مضامین پر کہانی کا گہرا عکس دکھائی پڑتا ہے۔افسانوی انداز بیان کی وجہ سے قاری کی دلچسپی مضمون کے آخر آخر تک بنی رہتی ہے۔اس طرح کے مضامین میں چند مضامین جیسے 'مولوی نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری کچھ ان کی زبانی'، 'دلی کا یادگار مشاعرہ'، 'ایک وصیت کے تکمیل میں'، 'پھول والوں کی سیر' قابل ذکر ہیں۔

2.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

- فرحت اللہ بیگ کے حالات زندگی اور ادبی خدمات سے متعلق جانکاری حاصل کی۔
- فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری کا جائزہ لیا۔
- فرحت اللہ بیگ کا خاکہ 'مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' کا جائزہ لیا۔
- فرحت اللہ بیگ کی اسلوب نگاری کے متعلق معلومات حاصل کی۔
- اردو ادب میں فرحت اللہ بیگ کی اہمیت کو سمجھا۔

2.5 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال:1۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ لیجیے؟

سوال:2۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجئے؟

سوال:3۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا خاکہ 'نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' کا مختصر تجزیہ پیش کیجئے؟

سوال:4۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے زبان و بیان پر روشنی ڈالئے؟

سوال:5۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی جزیات نگاری کی خصوصیات بیان فرمایئے؟

2.6 سوالات کے جوابات

جواب 1۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت ایک خاکہ نگار، ادبی محقق، طنز و مزاح نگار، قصہ نویس، شاعر، ڈرامہ نگار اور نقاد ہیں۔ لیکن اردو ادب میں ایک مزاح نگار کی حیثیت سے ان کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ انہوں نے دہلی کی تہذیب کی جو تصویر کشی کی ہے اردو ادب میں اس کی دوسری مثال بمشکل نظر آتی ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ انہیں دلی اور اس کی تہذیب سے خاص لگاؤ تھا۔ فرحت اللہ بیگ نے ادبی تحریروں سے الگ دیگر موضوعات مثلاً تاریخ اور سوانح پر بھی ہاتھ آزمایا ہے۔ یہاں پر بھی وہ جگہ جگہ مزاح کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کی شہرت کا سبب ان کی مزاح نگاری ہے

جواب 2۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اردو کے مشہور ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ نگاری کی دنیا میں بڑی شان و شوکت سے اپنی موجودگی کا احساس کرایا۔ یہ خاکہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں دلی کا یادگار مشاعرہ اور ۱۹۲۹ء میں ایک وصیت کی تعمیل ان کے دیگر مشہور خاکے ہیں۔ انہوں نے ان خاکوں کے علاوہ بھی دیگر عنوان سے خاکے لکھے۔ لالہ سری رام، نواب عبدالرحمٰن اور حکیم آغا اسی سلسلے کا حصہ ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے مولوی وحیدالدین سلیم سے کئے وعدے کے بنا پر ایک خاکہ 'ایک وصیت کی تعمیل' تحریر فرما کر اپنے وعدے کا پاس رکھا۔ اس خاکے کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مولوی وحید الدین سلیم کے اوصاف کے ساتھ ساتھ ان کی شخصی کمزوریوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے خاکہ لکھتے وقت ذاتی رشتے کے بنا پر جانب داری سے مکمل احتراز کیا ہے۔ ایک جانب جہاں ان کی تعریف توصیف کی گئی ہے وہیں دوسری جانب غیر جانب دارانہ سلوک روا رکھتے ہوئے مولوی وحیدالدین کی کمزوریوں کو بھی زیر قلم رکھا ہے۔ خاکہ لکھتے وقت فرحت اللہ بیگ کی باریک بین نظریں ہر بڑی اور چھوٹی چیز کا بنظر غائر جائزہ لیتی ہیں۔ ان کے مضمون 'دہلی کا ایک مشاعرہ' جو کہ دیگر عنوانات: دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ اور دہلی کی آخری شمع کے عنوان سے بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ مضمون دہلی کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس مضمون میں دہلی کے گرد و نواح میں واقع میلے ٹھیلے کی خوبصورت منظر کشی دکھائی پڑتی ہے۔ اس مضمون میں دہلی کی ادبی محفلوں وغیرہ کا بیان نہایت مفکرانہ انداز سے پیش کیا ہے۔

جواب 3۔ فرحت اللہ بیگ نے اپنے محترم استاد ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ پیش کر کے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ یہ ایک نہایت ہی مشکل کام تھا کیونکہ اس سے قبل خاکہ نگاری کے مثالی نمونے موجود نہیں تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے لئے یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا اور اس کسوٹی پر وہ بالکل کھرے ثابت ہوئے۔ حالانکہ ابتدا میں وہ کشمکش میں رہے لیکن مولوی عبدالحق کی حوصلہ افزائی نے ان کے فن کو تقویت بخشی اور وہ اپنے استاد نذیر احمد کا خاکہ پیش کرنے میں کامیاب رہے۔ اس خاکے میں وہ تمام فنی خوبیاں موجود ہیں جو اسے کامیاب بناتے ہیں اس لئے یہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک طرف

فرحت اللہ بیگ کی مضحکہ خیز طبیعت اور دوسری طرف ان کے سادہ اور دل چسپ اندازِ بیان نے اس خاکے میں چار چاند لگا دیے۔ یہی وجہ ہے کہ طویل ہونے کے باوجود بھی ابتدا سے آخر تک یہ قاری کو اپنی گرفت میں لئے رہتا ہے۔ وحدت تاثر شروع سے آخر تک قاری کو پورا خاکہ پڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

جواب 4۔ فرحت اللہ بیگ نے دہلی کی با محاورہ اور ٹکسالی زبان کو ادبی وقار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ اپنے مضامین میں محاورات کا خوب خوب استعمال کرتے ہیں۔ ان کے محاورے اردو، فارسی اور ہندی سے ماخوذ ہیں۔ محاورے کے اس برمحل استعمال سے ان کی تحریروں میں کسی طرح کی لغزش یا کمزوری پیدا نہیں ہوتی بلکہ بعض دفعہ ان محاوروں کے ذریعہ وہ اس تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں جو موضوعِ سخن ہے۔

جواب 5۔ فرحت اللہ بیگ کی سب سے اہم خصوصیت جزئیات نگاری ہے۔ ان کی نگاہ اتنی دوررس اور باریک بین ہے کہ وہ جس بھی چیز کا بیان کرتے ہیں اس کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بڑی صفائی سے قاری کے سامنے یوں رکھتے ہیں کہ اس سے اس شئے کی مکمل تفہیم قاری تک ہو جاتی ہے۔ ان کی تحریریں اپنی جزئیات نگاری کی وجہ سے قاری کو مکمل باندھے رکھ سکنے میں کامیاب رہ سکتی ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کی ایک اور خصوصیات ان کا اسلوب بیان اور طرز نگارش ہے۔ فرحت اللہ بیگ ان چنندہ قلمکاروں میں سے ہیں جن کا ایک خاص ظریفانہ رنگ ہے جو انہیں ہمعصر انشا پردازوں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی زبان میں ایسی چاشنی ہے جس کا ذائقہ پڑھنے والوں کو کافی دیر تک گدگداتا ہے۔

2.7 فرہنگ

لفظ	:	معنی
فصاحت	:	خوش بیانی، خوش کلامی، کلام کی صلاست اور لطافت
ژرف نگاری	:	دار بینی، باریک بینی، گہری نظر
مرقع	:	تصویر کشی
مزاح	:	ہنسی مزاق کرنا، دل کرنا، ظریفانہ باتیں کرنا
اشرف المخلوقات	:	تمام مخلوقات میں سب سے افضل و اعلیٰ
بذلہ سنجی	:	خوش طبعی، مزاق کرنے والا
احتراز	:	پرہیز، گریز
غائر	:	کسی بلند درجے پر بیٹھنا
توازن	:	برابری، مساوات
ملحوظ	:	لحاظ رکھنا
مسخ	:	اصل حالت سے بدلی ہوئی حالت، خراب حالت
چشم پوشی	:	نظریں چرانا

وضعداری	:	روایتی طریقہ، پرانے روایات کی پاسداری
جزیات نگاری	:	معمولی اور چھوٹی باتوں کا بھی بیان کرنا
اعتدال	:	تناسب،عدل،انصاف، برابری

2.8 کتب برائے مطالعہ

- ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (مرتب) — مضامین فرحت — القلم انٹر پرائزیز اردو بازار، لاہور ۱۹۹۹ء
- ڈاکٹر فرمان فتحپوری — اردو نثر کا فنی ارتقا — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۳ء
- ڈاکٹر صابرہ سعید — اردو میں خاکہ نگاری — مکتبہ شعر و حکمت، حیدرآباد ۱۹۷۸ء

اکائی 3: مولوی عبدالحق اور 'نام دیو مالی'

ساخت

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

3.3.1 مولوی عبدالحق کے حالات زندگی

3.3.2 مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات

3.3.3 مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

3.3.4 مولوی عبدالحق کا خاکہ 'نام دیو مالی' متن

3.3.5 مولوی عبدالحق کا خاکہ 'نام دیو مالی' کا مختصر تجزیہ

3.4 آپ نے کیا سیکھا

3.5 اپنا امتحان خود لیجیے

3.6 سوالات کے جوابات

3.7 فرہنگ

3.8 کتب برائے مطالعہ

3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

مولوی عبدالحق کے حالات زندگی اور ادبی خدمات سے متعارف ہوں گے۔

مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا مختصر جائزہ لیں گے۔

مولوی عبدالحق کے خاکہ 'نام دیو مالی' کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

مولوی عبدالحق کے خاکے کے اسلوب پر نظر ڈالیں گے۔

مولوی عبدالحق کے اردو ادب میں مرتبہ ومقام کا تعین کریں گے۔

3.2 تمہید

بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو ادب کے مایہ ناز مفکر، محقق، ماہر لسانیات، کامیاب نقاد، اعلیٰ درجے کے خاکہ نگار ہیں۔ انجمن

ترقی اردواوراردوکالج کراچی (موجودہ وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون،سائنس اورٹیکنولا جی) کے بانی اوراردوتحقیق میں گراں قدر اضافہ کرنے والے ہیں۔انہوں نے اردوزبان کی ترقی،ترویج اوراشاعت میں اپنی زندگی وقف کردی۔انہوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں اورآخروقت تک اردوتحقیق پر کام کرتے رہے۔عبدالحق بلا شبہ ایک صاحب طرز انشا پرداز ہیں،انہوں نے بہت ساری معروف اور غیر معروف کتابوں کی تحقیق کی،ان کومقدموں اور حواشی کے ساتھ شائع کیا۔یہ مقدمات ان کتابوں کی شناخت بن گئے۔اس میں زیادہ تر دکنی کتابیں ہیں جن کا اہل ادب کے درمیان کوئی تعارف نہیں تھا۔وہ اپنے ہیں مقدمات کے ذریعہ اردوادب میں متعارف ہوئیں۔

جدید خاکہ نگاروں مولوی عبدالحق کا نام انتہائی عظمت کا حامل ہے۔خاکہ نگاری ایک ایسافن ہے جس میں اشاروں کے ذریعہ اورمختصرطور پر کسی شخص کی سیرت کے کچھ ایسےنقوش ابھارے جاتے ہیں جس سے اس کے کردار کوایک زندہ اور حقیقی تصورمل سکے۔جن ادیبوں نے خاکہ نگاری کےفن کوکامیابی کےساتھ برتا ہے،ان میں مولوی عبدالحق کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ان کی تحریروں میں جوسادگی اور سلاست روانی ہے وہ قاری کو اپنی گرفت میں لئے رہتی ہے۔خاکہ نگاری کے لئے جس ژرف نگاہی،تنقیدی بصیرت،جس مزاح اور ذوق لطیف کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمام خصوصیات مولوی عبدالحق کے یہاں خاص طور سے موجود ہیں۔انہوں نے شخصی خاکوں کی طرف خصوصی توجہ کی اور شخصی خاکہ نگاری کوایک مستقل صنف کے درجے پر پہنچا دیا۔

3.3 مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

3.3.1 مولوی عبدالحق کے حالات زندگی

مولوی عبدالحق کی پیدائش ۲۰ اپریل ۱۸۷۰ءکوسراواں (ہاپوڑ) ضلع میرٹھ،اترپردیش میں ہوئی۔ان کے آباؤ اجداد ہاپوڑ کے ہی رہنے والے تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی جس میں عربی اور فارسی شامل ہیں۔۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی۔اے کیا۔نہایت ذہین،جدت طبع اورمحنتی انسان تھے۔تمام عمراردوکی ترقی کے لئےصرف کردی۔قیام علی گڑھ کےدوران سرسیداحمد خان کی آزادخیالی اورروشن دماغی کا مولوی عبدالحق کےمزاج پر گہرااثر پڑا۔۱۸۹۵ءمیں حیدرآباددکن میں ایک اسکول میں ملازمت کی اس کے بعدصدرمہتمم تعلیمات مقرر ہوکراورنگ آبادمنتقل ہوگئے اور۱۹۳۰ءمیں اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

۱۹۰۲ءمیں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کےتحت انجمن ترق اردو کے نام سے ایک علمی شعبہ قائم کیا۔مولانا شبلی نعمانی اس کےسکریٹری رہے تھے۔اس کے بعد ۱۹۰۵ءمیں نواب حبیب الرحمٰن خان شیروانی اور۱۹۰۹ءمیں عزیز مرزااس عہدے پر فائز ہوئے۔عزیز مرزا کے بعد۱۹۱۲ءمیں مولوی عبدالحق سیکریٹری منتخب ہوئے۔انہوں نے انجمن ترقی اردوکوایک فعال ترین علمی ادارہ بنا دیا۔مولوی عبدالحق اورنگ آباد میں ملازم تھے،وہ انجمن کو وہاں اپنے ساتھ لے گئے اوراس طرح حیدرآباد دکن اس کا مرکز بن گیا۔تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئےاوروہاں ۱۶ اگست،۱۹۶۱ءکواپنے مالک حقیقی سے جاملے۔وہ وفاقی یونیورسٹی کراچی کےعبدالحق کیمپس کےاحاطے میں سپردخاک ہیں۔

3.3.2 مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات

مولوی عبدالحق ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔وہ بیک وقت مفکر،محقق،ماہرلسانیات،نقاد،معلم،ادیب اور خاکہ نگار ہیں۔انہوں نے دکن کی بہت ساری معروف اورغیر معروف کتابوں کی نہ صرف تحقیق کی بلکہ ان کو اپنے مقدموں اور حواشی کے ساتھ شائع کیا جن سے ان کی شناخت قائم ہوئی۔۱۹۱۲ء میں جب وہ انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری منتخب ہوئے تب انہوں نے لاکھ سے زیادہ جدید علمی،فنی اور سائنسی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کرایا۔اس کے بعد اردو کے نادر نسخے تلاش کر کر کے چھاپے گئے۔دو سہ ماہی رسائل 'اردو' اور 'سائنس' جاری کیے گئے جس کے تمام مضامین تحقیقی اور ادبی ہوتے تھے۔مضمون نگاری کا شوق زمانہ طالب علمی سے تھا،''اردو زبان کا مستقبل''ان کا بہت مقبول مضمون ہے جو کہ سرسید کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوا تھا جس سے آپ کی زبان دوستی اور زبان نوازی کا پتہ چلتا ہے۔انہوں نے ایک والاقدر کتب خانہ بھی قائم کیا۔حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی انجمن ہی کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔اس یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔انجمن ترقی اردو نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا جہاں سینکڑوں علمی کتابیں تصنیف و ترجمہ ہوئیں۔اس انجمن کے تحت لسانیات،لغت اور جدید علوم پر تقریباً دو سو سے زائد کتابیں شائع ہوئیں۔وہ کتابیں جو مولوی عبدالحق نے لکھیں یا جن کو تحقیق و حواشی کے ساتھ شائع کیا،مندرجہ ذیل ہیں:

نکات اشعرا،قطب مشتری،گلشن عشق،دیوان تاباں،تذکرہ ریختہ گویاں،مخزن شعرا،دیوان اثر،ریاض الفصحا،عقد ثریا،تذکرۂ ہندی،ذکر میر،کہانی رانی کیتکی اور اودھ بھان،چمنستان شعرا،ذکر میر،مخزن نکات،قواعد اردو،باغ و بہار،اردو کے ابتدائی نشو نما میں صوفیائے کرام کا حصہ،معراج العاشقین،قدیم اردو،قوائد اردو،سب رس،سرسید احمد خاں- حالات و افکار،چند ہم عصر،نصرتی - حالات اور کلام پر تبصرہ،مرحوم دہلی کالج،پاکٹ انگریزی اردو ڈکشنری،اسٹوڈینٹ انگریزی اردو ڈکشنری،اردو انگریزی ڈکشنری،اسٹنڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری،دی پاپولر انگلش اردو ڈکشنری،لغت کبیر جلد اول،دریائے لطافت،اردو صرف و نحو،خطبات گارساں دتاسی،افکار حالی،انتخاب کلام میر،انتخاب داغ،گل عجائب،پاکستان کی قومی و سرکاری زبان کا مسئلہ،سرآغا خاں کی اردو نوازی وغیرہ۔

تقسیم ہند کے بعد انہوں نے اس انجمن کے اہتمام میں کراچی،پاکستان اردو آرٹس کالج،اردو سائنس کالج،اردو کامرس کالج اور اردو لا کالج جیسے ادارے قائم کیے۔اپنی ادبی خدمات کے صلے میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایل۔ایل ڈی کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۳۵ء میں جامعہ عثمانیہ کے ایک طالب علم محمد یوسف نے انہیں 'بابائے اردو' کا خطاب دیا جس کے بعد یہ خطاب اتنا مقبول ہوا کہ ان کے نام کا جزو بن گیا۔۱۹۵۹ء کو حکومت پاکستان نے صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

3.3.3 مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

اردو خاکہ نگاری میں جن ہستیوں کو عروج کمال حاصل ہے ان میں مولوی عبدالحق کا نام سرفہرست ہے۔''چند ہم عصر'' ان کا ایک تخلیقی کارنامہ ہے،یہ خاکوں کا مجموعہ ہے جس کی اشاعت ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔اس مجموعہ میں منشی امیر احمد،مرزا حیرت،سید محمود،مولوی چراغ علی،مولوی محمد عزیز مرزا،شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی،خواجہ غلام الثقلین،حکیم امتیاز الدین،مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی،گدڑی کا لال،نور خان،محسن الملک،مولانا محمد علی مرحوم،شیخ غلام قادر گرامی،حالی،سر اس مسعود،میرن صاحب،نام دیو۔مالی،سرسید احمد خان۔ڈاکٹر محمد اقبال،مولانا حسرت موہانی،آہ۔عبدالرحمن صدیقی،درویش پروفیسر۔ ری ہٹ سک،ڈاکٹر عبدالرحمن

بجنوری، نواب عمادالملک، پروفیسر مرزا حیرت اور خالدہ ادیب خانم سمیت کل ۲۴ خاکے موجود ہیں۔ اس مجموعہ میں چند گمنام اور کم شناس اشخاص کے خاکے بھی موجود ہیں۔ حالی کا خاکہ سب سے زیادہ کتاب کی شہرت کا باعث بنا۔ اس میں نام دیو مالی کا خاکہ بھی ملتا ہے جسے ایک نیک دل اور فرض شناس شخص کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

''وہ بہت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور منکسر المزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کے ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی۔ اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔''

(چند ہم عصر: مولوی عبدالحق، ص ۲۳۱۔۲۳۰)

خاکوں کا یہ مجموعہ سب سے پہلے اردو اکیڈمی سندھ نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ ۱۹۵۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ بھارت میں پہلے پہل اس مجموعہ کی اشاعت انجمن ترقی اردو ہند سے ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ مولوی عبدالحق نے اس کتاب میں خاکہ نگاری کے تمام لوازمات کو بطور حسن وخوبی سے برتا ہے۔ کتاب کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ صابرہ سعید اس حوالے سے لکھتی ہیں:

''مولوی صاحب صرف چند ہم عصر ہی لکھتے اور کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی اردو میں ان کا نام ہمیشہ عزت واحترام سے صاحب طرز انشا پردازی کے ساتھ لیا جاتا۔''

(ڈاکٹر صابرہ سعید۔ اردو میں خاکہ نگاری، ۱۹۷۸ء، مکتبہ شعر وحکمت، حیدر آباد)

خاکہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں مصنف کسی شخص کا حلیہ، اس کے عادات واطوار، رہن سہن اور اس کی زندگی کے خاص واقعات کو اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ اس کی زندگی کی مکمل تصویر قاری کی نگاہوں کے سامنے اس طرح پھر جائے گویا اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ خاکہ نگار کے لیے یہ بھی اہم ہے کہ وہ جس کسی کا بھی خاکہ پیش کرے اس کے محاسن کے ساتھ معائب کو بھی پیش نظر رکھے تاکہ اس کے کردار کی سچی تصویر سامنے آسکے۔ یہ بڑی ہی ذمہ داری کا کام ہے، جس میں ذاتی مفاد اور بغض کو درکنار کر کے حق بہ جانب قلم اٹھانا ہے جس سے موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف ہو سکے۔ مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری کے تمام لوازمات مثلاً ایمان داری، قوت مشاہدہ، احساس تناسب اور مصورانہ جہات کو پورے طور پر اس طرح برتا ہے کہ کہیں بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

''چند ہم عصر'' میں مولوی صاحب نے ہر قسم کے افراد کے خاکے شامل کیے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف خاص نامور ہستیوں پر قلم اٹھایا بلکہ معمولی اور عام لوگوں پر بھی اپنی خاص توجہ صرف کی جو ایمان داری، وضعداری، دیانت داری اور انسان دوستی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کتاب میں جہاں ایک طرف انہوں نے ادیب، شاعر، سیاسی رہنما، اکابرین قوم ملت کا ذکر کیا ہے وہیں دوسری جانب حکیم امتیاز الدین، غریب سپاہی نور خان اور نام دیو مالی جیسے عام انسان کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر ادب میں نئے باب کا اضافہ کیا۔ انہوں نے تمام خاکوں میں حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ دیدہ دلیری اور غیر جانب داری سے کام لیا ہے۔ یہ ان کے خاکوں کا سب سے بڑا وصف

ہے۔

خاکہ نگاری کے سب سے اہم جز مرقع نگاری میں مولوی عبدالحق کو درجۂ کمال حاصل ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے صرف ان شخصیتوں کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا جن سے وہ بے حد متاثر تھے اور جن کی زندگی کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی طبیعت میں توازن اور مزاج میں اعتدال تھا جو کہ ایک کامیاب خاکہ نگار کے لیے بے حد ضروری ہے۔ان کی نگاہ دورس اور تجربہ کی صلاحیت نے ان کے فن کو چار چاند لگا دیے جس سے وہ ہر بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور زندگی کے واقعات میں سے اہم واقعات کو منتخب کرنے میں اپنی پختہ ذہنی کا ثبوت دیتے ہیں۔انہوں نے ہر جگہ اختصار سے کام لیا ہے۔''چند ہم عصر'' کی تمام تصویریں ہمارے لیے سیرت نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔

مولوی صاحب کے خاکوں کی کامیابی کی ایک خاص وجہ ان کی اسلوب نگاری ہے جس نے ان کے کرداروں کی تصویر میں رنگ بھر دیے ہیں۔ان کی تحریر میں سادگی،سلاست و روانی ہے جو انہیں دوسرے ہم عصر ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے۔تمام خاکوں کی تحریر میں لطیف مزاح ہے مگر طنز نہیں اور مزاح میں بھی وقار اور سنجیدگی ہے۔ان کا ایک خاص ظریفانہ انداز ہے جو قاری پر اپنے دیرپا نقوش چھوڑ جاتا ہے۔دوستوں کی محفل میں بے تکلفی سے بھی کام لیتے ہیں۔مزاج میں بذلہ سنجی تو ہے لیکن کہیں بھی طنز کے نشتر نہیں چلائے۔انہوں نے ہر شخصیت کو ایک وقار کے ساتھ پیش کیا ہے خواہ وہ سپاہی نور خان ہو یا حالی جیسی ادبی شخصیت۔زبان و بیان میں وہ روانی ہے جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور طبیعت کہیں بھی بوجھل نہیں ہونے پاتی۔روزمرہ کی زبان کا استعمال کرتے ہیں جس میں مشکل الفاظ سے پرہیز کیا ہے اور عبارت میں کہیں جھول نہیں دکھائی پڑتا۔محاورات کا استعمال بڑے سلیقے سے کیا ہے جس سے ان کی عبارت میں مزید دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔

3.3.4 نام دیو مالی کا مختصر متن

نام دیو مقبرہ رابعہ درانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہوگیا ہے۔سچائی،نیکی،حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی

عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔تھانولا

صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھتا۔ پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بیمزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر اسے خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے، پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا پھلتا تھا، ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کے ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لا کر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اسے علاج کے لیے بلا لے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ، تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر، جھاڑنا بہارنا صبح شام روزآنہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم فنیسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسرے سے

بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ یا بیڑی پینے لگے۔ یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہوگئی ہے۔ لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ ''دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار، لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا اور وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھوڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا یوں سمجھئے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آب حیات تھا۔

میں نے اس بیش کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کو پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغبانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا۔ وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے، اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، تہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اونچ تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فنِ باغبانی کی

کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دھن تھی۔ کام سے سچا لگاو؟ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اس کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضبناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ اسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھالا اور منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا لیکن اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا۔ لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے، حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا کہ میں نے جو تجھ میں استعداد ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا ڈھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

3.3.5 خاکہ ’نام دیو مالی‘ کا مختصر تجزیہ

مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف ’چند ہم عصر‘ میں نام دیو مالی کا خاکہ تخلیق کر کے اپنا اعلیٰ انسانی اقدار اور دیانت داری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس دور میں جہاں ادب محض بڑے اور مشہور شاعر و ادیب کے ارد گرد رقص کرتا نظر آتا ہے وہاں ایک ادنیٰ سے مالی کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا اور اس کی چھوٹی سی زندگی کے چند پہلوؤں کو باریک بینی سے پیش کرنا ایک کامیاب فن کار کا ہی کام ہے۔ مولوی صاحب کی نگاہ دوررس جہاں ایک طرف حالی، سرسید، اقبال اور حسرت موہانی جیسی ہمہ جہت شخصیت پر تھی وہیں حکیم امتیاز الدین، نور خاں اور نام دیو مالی جیسے چھوٹے لیکن متاثر کن شخصیت پر بھی تھی۔ انہوں نے نام دیو مالی جیسے چھوٹے سے کردار کو جس طرح ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور اس کی جن صلاحیتوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا ہے وہ ہمارے لیے سبق آموز ہے۔ انہوں نے نام دیو مالی کو ایک نیک دل اور فرض شناس شخص کے طور پر پیش کیا ہے:

> ’’وہ بہت سادہ مزاج، بھولا بھالا اور منکسرالمزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کے ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی۔ اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔‘‘

(چند ہم عصر: مولوی عبدالحق، ص ۲۳۱-۲۳۰)

مزکورہ بالا اقتباس میں مولوی صاحب نے نام دیو مالی کی تصویر کشی کتنے دل کش انداز میں کی ہے۔ مولوی عبدالحق کی ملاقات نام دیو مالی سے قیام اورنگ آباد (دکن) کے دوران ہوئی۔ نام دیو مقبرہ رابعہ درانی کے باغ میں ایک معمولی سا مالی تھا۔ مقبرے کا باغ مولوی صاحب کی نگرانی میں تھا اور ان کی رہائش گاہ بھی اسی باغ کے احاطے میں تھی۔ ان کے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا گیا۔ مولوی صاحب اندر اپنے کمرے میں کام میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی میز کے سامنے ایک بڑی سی کھڑکی تھی جس میں سے باغ صاف نظر آتا تھا۔ وہ کبھی لکھتے لکھتے کھڑکی کے باہر نظر اٹھا کر دیکھتے تو نام دیو کو اپنے کام میں مصروف پاتے۔ اقتباس ملاحضہ ہوں:

> ’’بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھتا۔ پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔‘‘

(چند ہم عصر: مولوی عبدالحق)

مولوی صاحب نے اپنی کتاب 'چند ہم عصر' میں جتنے بھی معاصرین کے خاکے پیش کیے ہیں وہ زندگی کی کسی بھی منزل پر ان سے قریب رہے ہیں اور ان کی نفسیات کا کافی نزدیک سے مطالعہ کیا ہے وہ ان کی سیرت سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ نام دیو جیسی عام شخصیت سے بھی کافی متاثر ہیں جو راست گوئی، جفاکشی، وضعداری اور انسان دوستی کی بہترین مثال ہے۔اس کا معمولی سا کردار کہیں نہ کہیں قابل تقلید ہے۔ وہ اپنے کام کو بڑے سلیقے، دلچسپی اور خوشی سے کرتا ہے۔اس کی لگن، محنت، ایمانداری اور جفاکشی نے مولوی صاحب کو اپنا گرویدہ کرلیا ہے جس سے وہ اس کی سیرت کو اوراق پر منتقل کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بنا دیا۔ مولوی صاحب ایک وسیع حساس قلب، انسان دوست اور غمخوار دل کے مالک ہیں جو اعلیٰ شخصیت سے لے کر ادنیٰ سے مالی کے لیے بھی احساس جگر رکھتے ہیں۔ وہ انسانیت کو دولت، شہرت، رفعت، عظمت، وقار و بلندی اور شان وشوکت ان سب پر فوقیت دیتے ہیں۔ وہ نام سے زیادہ کام کی ستائش کرتے ہیں، ان کے نزدیک صرف امیروں اور بڑے لوگوں کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ کچھ چھوٹے اور غریب لوگ بھی ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہوسکتی ہے۔

ان کا یہ خاکہ اور اس کا کردار نام دیو مالی ہمیں اس بات کا درس دیتے ہیں کہ کام خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کو دلچسپی اور ایمان داری کے ساتھ کرنا چاہیے۔ نام دیو کے کردار میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے کام میں کسی کی مدد کا محتاج نہ تھا، وہ جو کچھ بھی کرتا اپنے ہی سہارے کرتا۔ عبدالحق کو یہی چیز بہت پسند آئی جس کو انہوں نے ''خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت قرار دیا''۔ وہ اس کی شخصیت سے ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔

مرقع نگاری میں مولوی عبدالحق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ویسے تو یہ عام بات ہے کہ خاکہ اتارنے میں مصنف خود کو بھی کینوس پر اتار دیتا ہے لیکن مولوی صاحب نے اس فن میں مہارت حاصل کی۔ انہوں نے خود پوشی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، وہ خود خاکے کے کینوس پر بہت کم نظر آتے ہیں لیکن کسی بھی مصنف کی تصنیف سے اس کے خیالات، جذبات واحساسات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے اس لیے اپنی تحریر، اسلوب اور مضمون نویسی میں ان کی شخصیت کی بھی جھلک کہیں نہ کہیں آ ہی جاتی ہے۔ دوسروں کے معائب ومحاسن کو پیش کرتے کرتے خود ان کے معائب ومحاسن سامنے آجاتے ہیں۔ نام دیو مالی کے کردار کو سامنے لاتے وقت ان کا خود کا کردار بھی سامنے آ گیا۔ انہوں نے نام دیو کے جذبۂ خدمت وایثار کی عکاسی جس طرح سے کی اس سے ان کا کردار بھی صفحۂ قرطاس پر منعکس ہوگیا۔ جس سے ان کی شخصیت کا ایک پہلو اور سامنے آتا ہے، جس میں ان کی خدمت خلق اور ایثار وقربانی کا جذبہ کارفرما ہے۔

مولوی صاحب کی ایک اہم خصوصیت ہے جو ان کے خاکوں کو اور بھی دلچسپ بناتی ہے وہ ہے ان کی اسلوب نگاری۔ ان کی تحریر میں سادگی، سلاست، رنگینی اور وہ فصاحت ہے جو قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتی ہے۔ انداز بیان میں وہ نرمی اور شگفتگی ہے جو مزاح کی مٹھاس کے ساتھ ایک الگ ہی لذت کا احساس کراتا ہے۔ مزاج میں بذلہ سنجی اور بے تکلفی نے تحریر کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر دیا۔ عبارت میں کہیں جھول نہیں ہے اس پر اختصار سے کام لیا جس سے قاری کی دلچسپی دوبالا ہوگئی۔ ان کی تحریر میں لطیف مزاح ہے مگر طنز نہیں اور مزاح میں بھی وقار اور سنجیدگی ہے۔ ان کا ایک خاص ظریفانہ انداز ہے جو قاری پر اپنے دیرپا نقوش چھوڑ جاتا

ہے۔روزمرہ کی زبان اور محاوروں کے برمحل استعمال پر مولوی صاحب کو قدرت حاصل ہے۔وہ محاوروں کو جملوں میں اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ جس سے عبارت میں ایک عجیب سا لطف پیدا ہوجاتا ہے۔اقتباس مندرجہ ذیل ہیں:

''باغ کے داروغہ (عبدالرحیم فنیسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسرے سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔یا بیڑی پینے لگے۔یا سائے میں جا لیٹے۔عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہوگئی ہے۔لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔''دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔''

(چند ہم عصر: مولوی عبدالحق)

جزیات نگاری میں مولوی صاحب کا ثانی مشکل سے ملے گا۔ان کی نگاہ اتنی دوررس اور باریک بین ہے کہ وہ جس بھی چیز کا بیان کرتے ہیں اس کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بڑی صفائی سے قاری کے سامنے یوں رکھتے ہیں کہ اس سے اس شئے کی مکمل تفہیم قاری تک ہوجاتی ہے۔ان کی تحریریں اپنی جزئیات نگاری کی وجہ سے قاری کو مکمل باندھے رکھ سکنے میں کامیاب رہ سکتی ہیں۔

3.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

- مولوی عبدالحق کے حالات زندگی اور ادبی خدمات سے متعلق جانکاری حاصل کی۔
- مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کا جائزہ لیا۔
- مولوی عبدالحق کا خاکہ ''نام دیو مالی'' کا جائزہ لیا۔
- مولوی عبدالحق کی اسلوب نگاری کے متعلق معلومات حاصل کی۔
- اردو ادب میں مولوی عبدالحق کی اہمیت کو سمجھا۔

3.5 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال:1۔ مولوی عبدالحق کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ لیجیے؟

سوال:2۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجئے؟

سوال:3۔ مولوی عبدالحق کا خاکہ ''نام دیو مالی'' کا مختصر تجزیہ پیش کیجئے؟

سوال:4۔ مولوی عبدالحق کی اسلوب نگاری پر روشنی ڈالئے؟

سوال:5۔ مولوی عبدالحق کی جزیات نگاری کی خصوصیات بیان فرمایئے؟

3.6 سوالات کے جوابات

جواب 1۔ مولوی عبدالحق ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔وہ بیک وقت مفکر، محقق، ماہرلسانیات، نقاد، معلم، ادیب اور خاکہ نگار ہیں۔انہوں نے دکن کی بہت ساری معروف اور غیر معروف کتابوں کی نہ صرف تحقیق کی بلکہ ان کو اپنے مقدموں اور حواشی کے ساتھ شائع کیا جن سے ان کی شناخت قائم ہوئی۔۱۹۱۲ء میں جب وہ انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری منتخب ہوئے تب انہوں نے لاکھ سے زیادہ جدید علمی، فنی اور سائنسی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کرایا۔اس کے بعد اردو کے نادر نسخے تلاش کر کر کے چھاپے گئے۔دو سہ ماہی رسائل 'اردو' اور 'سائنس' جاری کیے گئے جس کے تمام مضامین تحقیقی اور ادبی ہوتے تھے۔مضمون نگاری کا شوق زمانہ طالب علمی سے تھا، ''اردو زبان کا مستقبل'' ان کا بہت مقبول مضمون ہے جو کہ سرسید کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوا تھا۔اجس سے آپ کی زبان دوستی اور زبان نوازی کا پتہ چلتا ہے۔انہوں نے ایک والا قدر کتب خانہ بھی قائم کیا۔حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی انجمن ہی کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔اس یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔انجمن ترقی اردو نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا جہاں سینکڑوں علمی کتابیں تصنیف و ترجمہ ہوئیں۔اس انجمن کے تحت لسانیات، لغت اور جدید علوم پر تقریباً دو سو سے زائد کتابیں شائع ہوئیں۔وہ کتابیں جو مولوی عبدالحق نے لکھیں یا جن کو تحقیق و حواشی کے ساتھ شائع کیا، مندرجہ ذیل ہیں:

نکات اشعرا، قطب مشتری، گلشن عشق، دیوان تاباں، تذکرہ ریختہ گویاں، مخزن شعرا، دیوان اثر، ریاض الفصحا، عقد ثریا، تذکرۂ ہندی، ذکرمیر، کہانی رانی کیتکی اور اودھ بھان، چمنستان شعرا، ذکرمیر، مخزن نکات، قواعد اردو، باغ و بہار، اردو کے ابتدائی نشو نما میں صوفیائے کرام کا حصہ، معراج العاشقین، قدیم اردو، قوائد اردو، سب رس، سرسید احمد خاں – حالات و افکار، چند ہم عصر، نصرتی – حالات اور کلام پر تبصرہ، مرحوم دہلی کالج، پاکٹ انگریزی اردو ڈکشنری، اسٹوڈینٹ انگریزی اردو ڈکشنری، اردو انگریزی ڈکشنری، اسٹنڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری، دی پاپولر انگلش اردو ڈکشنری، لغت کبیر جلد اول، دریائے لطافت، اردو صرف ونحو، خطبات گارساں دتاسی، افکار حالی، انتخاب کلام میر، انتخاب داغ، گل عجائب، پاکستان کی قومی وسرکاری زبان کا مسئلہ، سرآغا خاں کی اردو نوازی وغیرہ۔

تقسیم ہند کے بعد انہوں نے اس انجمن کے اہتمام میں کراچی، پاکستان اردو آرٹس کالج، اردو سائنس کالج، اردو کامرس کالج اور اردو لا کالج جیسے ادارے قائم کیے۔اپنی ادبی خدمات کے صلے میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایل۔ایل ڈی کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۳۵ء میں جامعہ عثمانیہ کے ایک طالب علم محمد یوسف نے انہیں 'بابائے اردو' کا خطاب دیا جس کے بعد یہ خطاب اتنا مقبول ہوا کہ ان کے نام کا جزو بن گیا۔۱۹۵۹ء کو حکومت پاکستان نے صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

جواب 2۔ اردو خاکہ نگاری میں جن ہستیوں کو عروج کمال حاصل ہے ان میں مولوی عبدالحق کا نام سرفہرست ہے۔''چند ہم عصر'' ان کا ایک تخلیقی کارنامہ ہے، یہ خاکوں کا مجموعہ ہے جس کی اشاعت ۱۹۳۷ء میں ہوئی۔اس مجموعہ میں منشی امیر احمد، مرزا حیرت، سید محمود، مولوی چراغ علی، مولوی محمد عزیز مرزا، شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی، خواجہ غلام الثقلین،

حکیم امتیاز الدین، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، گدڑی کا لال، نور خان، محسن الملک، مولانا محمد علی مرحوم، شیخ غلام قادر گرامی، حالی، سر اس مسعود، میرن صاحب، نام دیو مالی، سر سید احمد خان، ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا حسرت موہانی، آہ۔عبدالرحمٰن صدیقی، درویش پروفیسر۔ری ہٹ سک، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، نواب عماد الملک، پروفیسر مرزا حیرت اور خالدہ ادیب خانم سمیت کل ۲۴ خاکے موجود ہیں۔اس مجموعہ میں چند گمنام اور کم شناس اشخاص کے خاکے بھی موجود ہیں۔خاکوں کا یہ مجموعہ سب سے پہلے اردو اکیڈمی سندھ نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔۱۹۵۹ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ بھارت میں پہلے پہل اس مجموعہ کی اشاعت انجمن ترقی اردو ہند سے ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔مولوی عبدالحق نے اس کتاب میں خاکہ نگاری کے تمام لوازمات کو بطور حسن وخوبی سے برتا ہے۔کتاب کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔

خاکہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں مصنف کسی شخص کا حلیہ، اس کے عادات واطوار، رہن سہن اور اس کی زندگی کے خاص واقعات کو اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ اس کی زندگی کی مکمل تصویر قاری کی نگاہوں کے سامنے اس طرح پھر جائے گویا اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔خاکہ نگار کے لیے یہ بھی اہم ہے کہ وہ جس کسی کا بھی خاکہ پیش کرے اس کے محاسن کے ساتھ معائب کو بھی پیش نظر رکھے تاکہ اس کے کردار کی سچی تصویر سامنے آ سکے۔یہ بڑی ہی ذمہ داری کا کام ہے، جس میں ذاتی مفاد اور بغض کو درکنار کر کے حق بہ جانب قلم اٹھانا ہے جس سے موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف ہو سکے۔مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری کے تمام لوازمات مثلاً ایمان داری، قوت مشاہدہ، احساس تناسب اور مصورانہ جہات کو پورے طور پر اس طرح برتا ہے کہ کہیں بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

''چند ہم عصر'' میں مولوی صاحب نے ہر قسم کے افراد کے خاکے شامل کیے ہیں۔انہوں نے نہ صرف خاص نامور ہستیوں پر قلم اٹھایا بلکہ معمولی اور عام لوگوں پر بھی اپنی خاص توجہ صرف کی جو ایمان داری، وضعداری، دیانت داری اور انسان دوستی کی نمائندگی کرتے ہیں۔اس کتاب میں جہاں ایک طرف انہوں نے ادیب، شاعر، سیاسی رہنما، اکابرین قوم ملت کا ذکر کیا ہے وہیں دوسری جانب حکیم امتیاز الدین، غریب سپاہی نور خان اور نام دیو مالی جیسے عام انسان کو اپنی توجہ کا مرکز بنا کر ادب میں نئے باب کا اضافہ کیا۔انہوں نے تمام خاکوں میں حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ دیدہ دلیری اور غیر جانب داری سے کام لیا ہے۔یہ ان کے خاکوں کا سب سے بڑا وصف ہے۔

خاکہ نگاری کے سب سے اہم جز مرقع نگاری میں مولوی عبدالحق کو درجۂ کمال حاصل ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے صرف ان شخصیتوں کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا جن سے وہ بے حد متاثر تھے اور جن کی زندگی کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ان کی طبیعت میں توازن اور مزاج میں اعتدال تھا جو کہ ایک کامیاب خاکہ نگار کے لیے بے حد ضروری ہے۔ان کی نگاہ دور س اور تجربہ کی صلاحیت نے ان کے فن کو چار چاند لگا دیے جس سے وہ ہر بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور زندگی کے واقعات میں سے اہم واقعات کو منتخب کرنے میں اپنی پختہ ذہنی کا ثبوت دیتے ہیں۔انہوں نے ہر جگہ اختصار سے کام لیا ہے۔''چند ہم عصر'' کی تمام تصویریں ہمارے لیے سیرت نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔

جواب 3 ۔مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف 'چند ہم عصر' میں نام دیو مالی کا خاکہ تخلیق کر کے اپنا اعلیٰ انسانی اقدار اور دیانت داری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔اس دور میں جہاں ادب محض بڑے اور مشہور شاعر و ادیب کے ارد گرد رقص کرتا نظر آتا ہے وہاں ایک ادنیٰ سے مالی کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا اور اس کی چھوٹی سی زندگی کے چند پہلوؤں کو باریک بینی سے پیش کرنا ایک کامیاب فن کار کا ہی کام ہے۔مولوی صاحب کی نگاہ دور س جہاں ایک طرف حالی، سرسید، اقبال اور حسرت موہانی جیسی ہمہ جہت شخصیت پر تھی وہیں حکیم امتیاز الدین، نور خاں اور نام دیو مالی جیسے چھوٹے لیکن متاثر کن شخصیت پر بھی تھی۔انہوں نے نام دیو مالی جیسے چھوٹے سے کردار کو جس طرح ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور اس کی جن صلاحیتوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا ہے وہ ہمارے لیے سبق آموز ہے۔مولوی عبدالحق کی ملاقات نام دیو مالی سے قیام اورنگ آباد (دکن) کے دوران ہوئی۔نام دیو مقبرہ رابعہ درانی کے باغ میں ایک معمولی سا مالی تھا۔مقبرے کا باغ مولوی صاحب کی نگرانی میں تھا اور ان کی رہائش گاہ بھی اسی باغ کے احاطے میں تھی۔ان کے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا گیا۔مولوی صاحب اندر اپنے کمرے میں کام میں مصروف رہتے تھے۔ان کی میز کے سامنے ایک بڑی سی کھڑکی تھی جس میں سے باغ صاف نظر آتا تھا۔وہ کبھی لکھتے لکھتے کھڑکی کے باہر نظر اٹھا کر دیکھتے تو نام دیو کو اپنے کام میں مصروف پاتے۔

مولوی صاحب نے اپنی کتاب 'چند ہم عصر' میں جتنے بھی معاصرین کے خاکے پیش کیے ہیں وہ زندگی کی کسی بھی منزل پر ان سے قریب رہے ہیں اور ان کی نفسیات کا کافی نزدیک سے مطالعہ کیا ہے وہ ان کی سیرت سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔وہ نام دیو جیسی عام شخصیت سے بھی کافی متاثر ہیں جو راست گوئی، جفاکشی، وضعداری اور انسان دوستی کی بہترین مثال ہے۔اس کا معمولی سا کردار کہیں نہ کہیں قابل تقلید ہے۔وہ اپنے کام کو بڑے سلیقے، دلچسپی اور خوشی سے کرتا ہے۔اس کی لگن ،محنت، ایمانداری اور جفاکشی نے مولوی صاحب کو اپنا گرویدہ کر لیا ہے جس سے وہ اس کی سیرت کو اوراق پر منتقل کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بنا دیا۔مولوی صاحب ایک وسیع حساس قلب، انسان دوست اور غمخوار دل کے مالک ہیں جو اعلیٰ شخصیت سے لے کر ادنیٰ سے مالی کے لیے بھی احساس جگر رکھتے ہیں۔وہ انسانیت کو دولت، شہرت، رفعت، عظمت، وقار و بلندی اور شان و شوکت ان سب پر فوقیت دیتے ہیں۔وہ نام سے زیادہ کام کی ستائش کرتے ہیں، ان کے نزدیک صرف امیروں اور بڑے لوگوں کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ کچھ چھوٹے اور غریب لوگ بھی ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔

ان کا یہ خاکہ اور اس کا کردار نام دیو مالی ہمیں اس بات کا درس دیتے ہیں کہ کام خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کو دلچسپی اور ایمان داری کے ساتھ کرنا چاہیے۔نام دیو کے کردار میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے کام میں کسی کی مدد کا محتاج نہ تھا، وہ جو کچھ بھی کرتا اپنے ہی سہارے کرتا۔عبدالحق کو یہی چیز بہت پسند آئی جس کو انہوں نے ''خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت قرار دیا''۔وہ اس کی شخصیت سے ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔

مرقع نگاری میں مولوی عبدالحق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ویسے تو یہ عام بات ہے کہ خاکہ اتارنے میں مصنف خود کو

بھی کینوس پر اتار دیتا ہے لیکن مولوی صاحب نے اس فن میں مہارت حاصل کی۔ انہوں نے خود پوشی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، وہ خود خاکے کے کینوس پر بہت کم نظر آتے ہیں لیکن کسی بھی مصنف کی تصنیف سے اس کے خیالات، جذبات و احساسات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے اس لیے اپنی تحریر، اسلوب اور مضمون نویسی میں ان کی شخصیت کی بھی مولوی صاحب کی ایک اہم خصوصیت ہے جو ان کے خاکوں کو اور بھی دلچسپ بناتی ہے وہ ہے ان کی اسلوب نگاری۔ ان کی تحریر میں سادگی، سلاست، رنگینی اور وہ فصاحت ہے جو قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتی ہے۔ انداز بیان میں وہ نرمی اور شگفتگی ہے جو مزاح کی مٹھاس کے ساتھ ایک الگ ہی لذت کا احساس کراتا ہے۔ مزاج میں بذلہ سنجی اور بے تکلفی نے تحریر کی خوبصورتی میں مذید اضافہ کر دیا۔ عبارت میں کہیں جھول نہیں ہے اس پر اختصار سے کام لیا جس سے قاری کی دلچسپی دو بالا ہوگئی۔ ان کی تحریر میں لطیف مزاح ہے مگر طنز نہیں اور مزاح میں بھی وقار اور سنجیدگی ہے۔ ان کا ایک خاص ظریفانہ انداز ہے جو قاری پر اپنے دیر پا نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ روزمرہ کی زبان اور محاوروں کے برمحل استعمال پر مولوی صاحب کو قدرت حاصل ہے۔ وہ محاوروں کو جملوں میں اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ جس سے عبارت میں ایک عجیب سا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

جواب 4۔ مولوی صاحب کے خاکوں کی کامیابی کی ایک خاص وجہ ان کی اسلوب نگاری ہے جس نے ان کے کرداروں کی تصویر میں رنگ بھر دیے ہیں۔ ان کی تحریر میں سادگی، سلاست و روانی ہے جو انہیں دوسرے ہم عصر ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے۔ تمام خاکوں کی تحریر میں لطیف مزاح ہے مگر طنز نہیں اور مزاح میں بھی وقار اور سنجیدگی ہے۔ ان کا ایک خاص ظریفانہ انداز ہے جو قاری پر اپنے دیر پا نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ دوستوں کی محفل میں بے تکلفی سے بھی کام لیتے ہیں۔ مزاج میں بذلہ سنجی تو ہے لیکن کہیں بھی طنز کے نشتر نہیں چلائے۔ انہوں نے ہر شخصیت کو ایک وقار کے ساتھ پیش کیا ہے خواہ وہ سپاہی نور خان ہو یا حالی جیسی ادبی شخصیت۔ زبان و بیان میں وہ روانی ہے جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور طبیعت کہیں بھی بوجھل نہیں ہونے پاتی۔ روزمرہ کی زبان کا استعمال کرتے ہیں جس میں مشکل الفاظ سے پرہیز کیا ہے اور عبارت میں کہیں جھول نہیں دکھائی پڑتا۔ محاورات کا استعمال بڑے سلیقے سے کیا ہے جس سے ان کی عبارت میں مزید دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔

جواب 5۔ جزیات نگاری میں مولوی صاحب کا ثانی مشکل سے ملے گا۔ ان کی نگاہ اتنی دوررس اور باریک بین ہے کہ وہ جس بھی چیز کا بیان کرتے ہیں اس کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بڑی صفائی سے قاری کے سامنے یوں رکھتے ہیں کہ اس سے اس شئے کی مکمل تفہیم قاری تک ہو جاتی ہے۔ ان کی تحریریں اپنی جزئیات نگاری کی وجہ سے قاری کو مکمل باندھے رکھ سکنے میں کامیاب رہ سکتی ہیں۔

3.7 فرہنگ

لفظ	:	معنی
محقق	:	تحقیق کرنے والا، حکیم، فلسفی
نقاد	:	پرکھنے والا، تنقید اور تبصرہ کرنے والا

ترویج	:	رواج دینا،اشاعت کرنا
انشاپرداز	:	مضمون نگار،ادیب
شناخت	:	پہچان،تمیز،واقفیت
ژرف نگاہی	:	دور بینی، باریک بینی، گہری نظر
معروف	:	مشہور، پہچانا ہوا
منکسرالمزاج	:	مسکین،جن کی طبیعت مین انکسار ہو
مشاہدہ	:	دیکھنا،معائنہ
وضعداری	:	روایتی طریقہ،، پرانی روایات کی پاسداری
مرقع نگاری	:	تصویرکشی
اعتدال	:	تناسب،عدل،انصاف، برابری
اختصار	:	کم کرنا،گھٹنا،خلاصہ
بذلہ سنجی	:	خوش طبعی،مزاق کرنے والا

3.8 کتب برائے مطالعہ

- چند ہم عصر مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۸۶ء
- ڈاکٹر صابرہ سعید اردو میں خاکہ نگاری مکتبہ شعروحکمت حیدرآباد، ۱۹۷۸ء
- بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خدمات قیام اورنگ آباد کے دوران، ڈاکٹر مسرت فردوس ناز بک ڈپو، لوٹہ کارنجہ اورنگ آباد، مہاراشٹر، ۴۳۱۰۰۱ ۱۹۹۹ء

بلاک:2 انشائیہ

اکائی۴: انشائیہ کا فن، بنیادی خصوصیات، مضمون اور مقالہ کا باہمی رشتہ

اکائی۵: محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری اور نیرنگ خیال

اکائی٦: خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری اور سی پارۂ دل

بلاک 2 کا تعارف

اکائی 4 میں ''انشائیہ کا فن، بنیادی خصوصیات، مضمون اور مقالہ کا باہمی رشتہ'' پر مبنی ہے۔ اس میں صنف انشائیہ کی تعریف، اس کے فن اور خصوصیات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مضمون کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے فن پر بھی مختصراً گفتگو کی گئی ہے۔ نیز مضمون اور مقالہ کے باہمی تعلق پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اکائی 5 ''محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری اور نیرنگ خیال'' پر مبنی ہے۔ اس میں آزاد کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات ''نیرینگ خیال'' کے خصوصی حوالے سے پیش کی گئی ہے۔ نیز ''نیرنگ خیال'' کے مخصوص مضامین کے حوالے سے اردو انشائیہ نگاری میں ان کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 6 ''خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری اور سیپارۂ دل'' پر مبنی ہے۔ اس میں حسن نظامی کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات کا ذکر ''سیپارۂ دل'' کے خصوصی حوالے سے کیا گیا ہے۔ نیز ''سیپارۂ دل'' کے مخصوص مضامین کے حوالے سے اردو انشائیہ نگاری میں ان کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی:4 انشائیہ کا فن، بنیادی خصوصیات، مضمون اور مقالہ کا باہمی رشتہ

4.1 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 انشائیہ کی تعریف

4.3.1 انشائیہ کا فن

4.3.2 انشائیہ کی بنیادی خصوصیات

4.4 مضمون کی تعریف اور اجزائے ترکیبی

4.5 مقالہ کی تعریف وخصوصیات

4.6 مضمون اور مقالہ کا باہمی رشتہ

4.7 آپ نے کیا سیکھا

4.8 اپنا امتحان خود لیجئے

4.9 سوالات کے جواب

4.10 فرہنگ

4.11 کتب برائے مطالعہ

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ہم انشائیہ کی تعریف جانیں گے۔

اس اکائی میں ہم انشائیہ کی خصوصیات کے متعلق جانیں گے۔

اس اکائی میں ہم مقالہ نگاری کے متعلق جانیں گے۔

اس اکائی میں ہم مضمون نگاری پر مختصر گفتگو کریں گے۔

اس اکائی میں ہم انشائیہ اور مضمون کے باہمی رشتے کا جائزہ لیں گے۔

4.2 تمہید

اردو ادب کی نثری اصناف سخن میں انشائیہ کا اہم مقام ہے۔ 1857ء کے بعد ملک کے حالات اور سماجی نظام میں حیرت انگیز تبدیلی

دکھائی دیتی ہے اور اس کی وجہ انگریز قوم کا ہندوستان پر پوری طرح سے تسلط قائم ہو جانا ہے۔ اس دور کے ادب پر نظر ڈالیں تو صرف شعری اصناف کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ جس میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، واسوخت وغیرہ شامل ہیں۔ نثری اصناف کا بہت زیادہ سرمایہ موجود نہیں تھا۔ نثر میں داستان ہی غالب تھی۔ انشائیہ اردو ادب کی ایک مشہور اور جدید صنف ہے جس کا تعلق غیر افسانوی ادب سے ہے۔ اُردو کی تقریباً تمام غیر افسانوی اصناف جن میں سوانح، خاکہ، سفرنامہ، رپورتاژ، مکتوب اور انشائیہ وغیرہ شامل ہیں کا آغاز کافی تاخیر سے یعنی اُنیسویں صدی کی ابتداء سے ہوا۔ اس سے پہلے اردو نثر میں داستان، حکایات اور تمثیلی قصّے وغیرہ ہی پائے جاتے تھے۔ 1857ء کے بعد سے بدلتے ہوئے حالات میں اردو شعراء اور ادباء نے خوابوں اور خیالوں کی افسانوی دنیا سے نکل کر باقاعدہ غیر افسانوی اصناف کو فروغ دیا۔ اس کے بعد سے اردو میں حقیقت نگاری کی شروعات ہوئی اور جدید اصناف میں طبع آزمائی کرنے کا رجحان عام ہوا۔ 1857ء کے غدر کے بعد مضمون، خطوط، انشائیہ، مختصر کہانی، ناول وغیرہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ تمام اصناف مغربی ادب سے مستعار لئے ہوئے ہیں۔ انشائیہ بھی مغرب سے اردو ادب میں آیا ہے لیکن خاص بات یہ ہے کہ انشائیہ پر ہندوستانی تہذیب کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

4.3 انشائیہ کی تعریف

انشائیہ نہ صرف اردو میں بلکہ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی میں بھی موجود ہے۔ عربی میں اسے لفظ 'انشا' سے تعبیر کرتے ہیں جو 'نشا' مادہ سے مشتق ہے۔ فارسی میں بھی اسے انشا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسے ہندی میں 'للت رچنا' کہتے ہیں۔ انگریزی میں ' Essay Light' کہا جاتا ہے جو فرانسیسی لفظ 'Essai' سے ماخوذ ہے۔ اردو میں اس صنف کو اولاً لطیف پارہ، ادب لطیف، لائٹ ایسّے اور پھر انشائیہ کے نام سے شناخت حاصل ہوئی۔ نیز انشا اور انشائیہ میں ایک بہت ہی مہین سا فرق ہوتا ہے ان تمام زبانوں میں انشا کے معنی ومفہوم میں بھی تضاد نہیں پایا جاتا ہے بلکہ دیکھا جائے تو بہت حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ انشا لفظ سے بھی وہی معنی اخذ ہوتے ہیں جو انشائیہ سے بھی عبارت کیے جاتے ہیں۔

اردو زبان کی ابتداء میں بہت سی ادبی اصناف عربی و فارسی کے زیر اثر رائج ہوئیں اور وقت کے ساتھ بہت سی ادبی اصناف انگریزی ادب کے زیر اثر وجود میں آئیں۔ انشائیہ کو اردو میں انگریزی ادب کی دین مانا جاتا ہے۔ انگریزی میں انشائیہ کے لئے ''ایسّے'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جس میں ''پرسنل ایسّے'' اور 'لائٹ ایسّے'' دونوں شامل ہیں۔ اردو میں رائج انشائیہ انگریزی ادب کے لائٹ ایسّے سے قربت رکھتی ہے۔ دراصل انشائیہ کی تعریف بیان کرنا ایک مشکل کام ہے لیکن یہ مشکل اس وقت مزید شدت اختیار کرنے لگتی ہے جب انشائیہ کی کوئی ایک اور جامع تعریف متعین کرنے کو کہا جاتا ہے۔ جس طرح زندگی کی کوئی ایک تعریف پیش کرنا ممکن نہیں اسی طرح انشائیہ کی کوئی ایک اور حتمی تعریف پیش کرنا ممکن نہیں۔ انشائیہ کے لغوی معنیٰ ''عبارت'' کے ہیں۔ انشائیہ غیر افسانوی ادب کی وہ صنف ہے جو مضمون کی مانند لگتی ہے لیکن مضمون سے جُدا ہوتی ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار بلا کسی جھجھک کے موضوع اور ہیئت کی پابندی کے بغیر آزادانہ طور پر اپنے خیالات پیش کرتا ہے۔ انشائیہ میں کوئی مکمل قصہ، کہانی اور فلسفہ نہیں ہوتا بلکہ اس صنف میں انشائیہ نگار بلا کسی خاص نتیجے کے اپنی بات ختم کر دیتا ہے۔ انشائیہ دنیا کے کسی بھی اہم یا غیر اہم موضوع پر شخصی اور انفرادی اظہارِ خیال کا نام ہے جس میں ہر لفظ سے انشائیہ نگار کی جولانی طبع ظاہر ہوتی ہے۔ اسی لئے انشائیہ کو ''من کی ترنگ'' بھی کہا جاتا ہے۔ انشائیہ میں واقعات سے زیادہ تاثرات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ انشائیہ کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی بلکہ کسی بھی موضوع پر انشائیہ نگار ایک منفرد اور اچھوتے انداز میں اپنے خیالات رقم کرسکتا ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار بے ساختہ اور بلا کسی تکلف اپنے ذاتی مشاہدات اور تاثرات بیان کرتا ہے۔ انشائیہ کا مقصد نہ اصلاحی ہوتا ہے اور نہ معلومات بہم پہچانا۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنے دل و

دماغ کی اُتھل پتھل کو مزے لے کر بیان کرتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ ان تحریروں میں ایک نیا پن، تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اختصار، بے ربطی اور انبساط انشائیہ کی پہچان ہے۔

نیاز فتح پوری کے مطابق:

''انشائیہ دیگر اصناف ادب کے مقابلے آسان بھی ہے اور مشکل بھی ہے۔ آسان اس لیے کہ وہ صرف ذہنی اپج ہے اور وہ مشکل اس لیے کہ ہر ذہنی اپج، انشائیہ نہیں بن سکتی، اس لیے محض فکر کافی نہیں بلکہ ذکر بھی درکار ہے اور یہ ذکر آسان نہیں۔ اس کی اولین شرط نفسیات کی مہارت ہے اور ادب میں آکر یہ خاص اسلوب اختیار کر لیتی ہے جس میں فلسفہ، تنقید اور ادب کے تمام شعبے (مع طنز و تعریض، مزاح) ایک دوسرے سے گتھے نظر آتے ہیں۔''

(اردو انشائیہ۔ آدم شیخ۔ برہانی کالج کامرس اینڈ آرٹس، مجگاؤں۔ ص: 17)

مندرجہ بالا تمام تعریفوں کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ دل سے نکلی ہوئی بات دوسرے دل تک اس طور سے پہنچے جو زیادہ پُر اثر ہو۔ دوسری طرف ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کو ایک نثری صنف قبول کرتے ہیں جس میں انشائیہ نگار اپنے اسلوب کی تازہ کاری کو ضروری مانتا ہے کیونکہ اسلوب اگر گھسا پٹا ہوگا تو اس کی تحریر میں کسی بھی قسم کا اثر برقرار نہیں ہوگا۔ انشائیہ کے سلسلہ میں احتشام حسین درست فرماتے ہیں:

''میرے ذہن میں انشائیہ کی کوئی منطقی اور علمی تعریف نہیں ہے تو یقیناً مجھ پر لاعلمی اور جہالت کا الزام نہیں لگایا جائے گا، کیونکہ میں خود ان تمام مشرقی اور مغربی نقادوں کو شک کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں جنھوں نے قطعیت کے ساتھ اس کی تعریف کی ہے اور اس کو صحیح اور مناسب ترین قرار دیا ہے۔''

(صنف انشائیہ، سید محمد حسنین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص: 237)

جب ہم انشائیہ کے فن کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ نگاری بے گانہ روی اور خود مختاری کا فن ہے۔ انشائیہ کسی سنسر شپ کا متحمل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی انشائیہ نگار کا کوئی مخصوص نظریہ اور پالیسی ہوتی ہے۔ انشائیہ کا تعلق ادب لطیف سے ہوتے ہوئے بھی اس میں افسانوی اصناف کی طرح پلاٹ، کردار، قصہ یا مرقع نگاری نہیں پائی جاتی۔ انشائیہ میں کہانی پن کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی جاتی ہے۔ انشائیہ میں داخلیت کے عنصر پائے جاتے ہیں کیوں کہ انشائیہ نگار کا دماغ اور زبان دونوں شاعرانہ ہوتے ہیں۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنی آوارہ خیالی اور بے گانہ روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلم کی باگ کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح جو تحریر وجود میں آتی ہے اسے انشائیہ کہا جاتا ہے۔ دراصل انشائیہ میں بے تکلفانہ فضاء پائی جاتی ہے۔ انشائیہ تحریر کرتے ہوئے قلم سے اور دل سے عقل کی پاسبانی اٹھا دی جاتی ہے تب کہیں جا کر ایک بہترین انشائیہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔

4.3.1 انشائیہ کا فن

انشائیہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ اس کی مثال غزل سے دی جا سکتی ہے کہ جس طرح غزل میں مطلع کے بعد تمام اشعار ایک کے بعد

ایک الگ الگ خیال کے ساتھ وارد ہوتے ہیں اسی طرح انشائیہ کا ہر پیرا گراف اپنے آپ میں مختلف نوعیت کا ہوتا ہے اوراس میں کچھ نہ کچھ نیا مواد قاری کے لئے موجود ہوتا ہے۔انشائیہ کا فن خاص یہ ہے کہ ہر وہ خیال جو انشائیہ نگار کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ معنویت کے ہمراہ کم سے کم الفاظ میں پیش ہونا چاہئے۔

داخلیت

انشائیہ کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شخصی یا داخلی ہوتا ہے۔کیونکہ انشائیہ نگار اپنے ذاتی خیالات، واقعات اور افکار کو پیش کرتا ہے۔ انشائیہ بالکل داخلی اور ذاتی صنف ہے۔اس میں صرف مصنف کی ذات کا عکس نظر آتا ہے۔اس کی کامیابی کا راز اس کے مواد اور ہیئت دونوں میں ہے۔انشائیہ کی خاص خوبی داخلیت اور خودکلامی ہے۔ایک کامیاب انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات سے قارئین کو روشناس کراتا ہے اور کھل کر اپنے مشاہدات کا بیان کرتا ہے۔

بے تکلفی

انشائیہ کے فن کی دوسری اہم بات اس میں پائی جانے والی بے تکلفی اور دوستانہ انداز ہے۔اس میں بے تکلف کلمات جیسے اماں یار سنو، ارے بھائی، سنو سنو، یارو، میرے دل دار، جیسے بے تکلف کلمات کا استعمال کرنے کی آزادی ہوتی ہے اور انشائیہ نگار اپنے خیالات اور خواہشات کا اظہار بنا کسی جھجھک کے کر سکتا ہے۔

موضوع

تازگی انشائیہ کی جان ہے۔تازگی سے مراد یہ ہے کہ موضوع اور نقطۂ نظر میں نیا پن موجود ہو۔انشائیہ نگار کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اس میں کسی نہ کسی نئے پہلو کی تلاش کرتا ہے اور لوگوں کو محظوظ کرنے کا کام کرتا ہے۔موضوع کے اعتبار سے انشائیہ کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس کائنات کے گوشے گوشے میں انشائیہ نگار کے لئے مواد موجود ہے جسے وہ اپنی جدت طبع سے موضوع میں تبدیل کر دیتا ہے۔وہ ادنیٰ سے ادنیٰ موضوع کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بنا سکتا ہے اور اس میں ایسی جدت پیدا کر دیتا ہے کہ قاری کا ذہن کبھی ان گوشوں کی طرف مائل ہی نہیں ہوا ہوتا ہے۔وہ قاری کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا جائزہ لینے کی جانب مائل کرتا ہے۔اچھا انشائیہ نگار جب موضوع میں گہرائی، وسعت اور بلندی تلاش کرتا ہے تو اس موضوع کے نئے زاویے ڈھونڈ نکالتا ہے۔ایک اچھا انشائیہ نگار معمولی سے معمولی بات کو بھی غیر معمولی بنانے کا ہنر جانتا ہے اور یہی صفت انشائیہ کی جان ہے۔

اسلوب

کفایت لفظی انشائیہ کے اسلوب میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔انشائیہ کا اسلوب اس کی کامیابی میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ چونکہ انشائیہ نگار قاری انشائیہ میں قاری سے براہ راست مخاطب ہو جاتا ہے اس لئے اس کا اسلوب نگارش خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔روشن خیال، خوبصورت الفاظ، اچھا انداز گفتگو انشائیہ نگار کا ہنر ہے۔ایک کامیاب انشائیہ نگار کی تحریروں میں لفظوں کی ترتیب، سجاوٹ،، زبان کی شگفتگی اور خیال بندی اس طرح ہوتی ہے جو قاری کو متاثر کر سکے۔انشائیہ ایک تخلیقی قوت ہے اور ایک اچھا انشائیہ نگار ہی اپنی تخلیقی قوت سے مضمون کو سو رنگ سے باندھ سکتا ہے۔حسن بیان، حسن لفظی اور حسن معنوی تینوں انشائیہ میں موجود ہو تو انشائیہ کامیاب کہلاتا ہے۔

اختصار

ایک اچھا انشائیہ اسی کو کہا جائے گا جس میں اختصار اور جامعیت موجود ہو۔انشائیہ میں کسی بھی موضوع کو پیش کرنے کی کوئی خاص

ترتیب نہیں ہوتی بلکہ انشائیہ نگار کے ذہن میں جو بھی موضوع ہوتا ہے اس سے متعلق ذیلی موضوعات کو بھی وہ اپنی تحریر کا حصہ بنالیتا ہے۔لیکن یہ سب بیان کرنے میں وہ اختصار کو ملحوظ رکھتا ہے۔اس کے جملے چھوٹے ہوتے ہیں لیکن معنویت سے بھرپور ہوتے ہیں۔یہی انشائیہ کا فن ہے کہ اس میں بات کو مکمل بھی کیا جاتا ہے اور کم الفاظ کے استعمال سے حسن تحریر بھی باقی رکھا جاتا ہے۔

طنز وظرافت

انشائیہ میں مزاح کی دو قسمیں استعمال کی جاتی ہیں۔ایک ظرافت دوسرا ہجو۔ظرافت اور ہجو دونوں ہی انشائیہ نگاری کا اہم جز ہے۔ان سے انشائیہ میں شگفتگی اور تازگی آجاتی ہے۔طنز وظرافت کے بغیر انشائیہ نامکمل سمجھا جاتا ہے۔ظرافت یعنی کہ انشائیہ میں کوئی مزاحیہ بات کہنا اور ہجو یعنی کی برائی کرنا یا اس پر طنز کرنا۔یہ دونوں جز مل کر انشائیہ کی تکمیل کرتے ہیں۔

دعوت غور وفکر

انشائیہ نگار اپنے مشاہدات اور تصوارت کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔لیکن نہ تو وہ کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے اور نہ ہی کوئی مشورہ دیتا ہے۔اس کا کام صرف یہ ہے کہ موضوع مخصوص کے ان دیکھے پہلوؤں کی جانب قاری کی توجہ مبذول کرانا۔تاکہ قاری خود غور وفکر کر کے نتائج اخذ کر سکے۔

مقصد

انشائیہ کا مقصد قاری کو مسرت وخوشی فراہم کرنا ہے۔اس کے لئے انشائیہ نگار دلچسپ اسلوب تحریر اور شگفتہ انداز بیان کا استعمال کر کے قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے تاکہ قاری محظوظ ہو سکے۔

انشائیہ کے فن کا مختصراً جائزہ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ نگار تمام فکروں سے بے نیاز ہو کر مختصر اور ہلکے پھلکے انداز میں بنا کسی دباؤ کے اپنے خیالات کو دلفریب انداز میں پیش کرتا ہے۔یہ دو کام کرتا ہے ایک تو قاری کو مسرت پہنچاتا ہے دوسرا معاشرتی ناہمواریوں پر بھی چوٹ کرتا ہے۔اس طرح یہ صنف ادب اور سماج دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

4.3.2 انشائیہ کی بنیادی خصوصیات

انشائیہ نگار موضوع کے بارے میں ہلکے پھلکے انداز کو اپناتا ہے۔انشائیہ نگار بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ اپنے تاثرات کو بیان کرتا ہے۔انشائیہ ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں انشائیہ نگار شگفتہ انداز میں اپنا مافی الضمیر قاری تک پہنچاتا ہے۔وہ بعض اوقات طنز ومزاح سے بھی کام لیتا ہے۔انشائیہ نگار زندگی کا مبصر ہوتا ہے اور نقاد بھی۔وہ اپنے انشائیے کے ذریعے سے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کر دیتا ہے۔زندگی اور اس کے مسائل سے پردہ اٹھانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔انشائیہ نگار زندگی کو جس طرح سے برتتا ہے اور جس رنگ میں دیکھتا ہے اسے وہ اپنی تمام تر داخلی کیفیات کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔وہ اختصار سے کام لے کر جامعیت کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔انشائیہ میں کوئی پلاٹ نہیں ہوتا اور نہ یہ مزاحیہ مضمون ہوتا ہے اور نہ افسانہ اور مقالہ۔انشائیہ میں انشائیہ نگار شروع سے اختتام تک خود بھی بے خبر ہوتا ہے۔انشائیہ نگار کا قوت مشاہدہ وسیع اور تیز ہونا ضروری ہے تب ہی وہ انشائیہ کے فن سے انصاف کر سکتا ہے جب وہ الفاظ کو نئے معنی میں اور نئے تناظر میں پرونے کے فن سے واقف کار ہو۔انشائیہ اپنے دور کا اور اپنے عہد کا ترجمان اور عکاس ہوتا ہے۔انشائیہ کے لیے بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں۔انشائیہ کے لیے اختصار، غیر رسمی انداز، اسلوب کی شگفتگی، عدم تکمیل کا احساس، شخصی نقطۂ نظر وغیرہ جیسی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے اور ان ہی اجزاء سے جو فن پارہ تکمیل پائے گا وہ انشائیہ کہلائے گا۔

4.4 مضمون کی تعریف اوراجزائے ترکیبی

اردو اصناف نثر میں مضمون نویسی کی بہت اہمیت ہے۔ انگریزی زبان میں اسے Essay کہتے ہیں۔ لفظ Essay لاطینی لفظ Exigere سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی کسی کام کی کوشش کرنا ہے۔ اس صنف کا شمار غیر افسانوی ادب میں ہوتا ہے۔ کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات وجذبات کو مربوط اور مدلل انداز مین اس طرح صفحۂ قرطاس پر لکھنا کہ پڑھنے والا خیالات سے متاثر ہو سکے۔ یعنی مضمون ہم اسے کہہ سکتے ہیں کس میں کسی ایک مخصوص موضوع یا خیال پر اظہار رائے پیش کی گئی ہو اور اس میں ربط و تسلسل قائم رکھا گیا ہو۔ اس کا آغاز اردو میں دہلی کالج سے ہوتا ہے سر سید احمد خان اور ان کے ساتھیوں نے اس صنف کو بہت فروغ دیا۔ سر سید احمد خان نے مضمون نگاری کے لئے تین شرطوں کو ضروری قرار دیا ہے:

(1) مضمون کا پیرایۂ بیان سادہ ہو۔ پیچیدہ اور پر تکلف اسلوب مضمون کا عیب ہے۔

(2) مضمون کی دوسری شرط یہ ہے کہ جو خیالات اور جو باتیں اس میں پیش کی جائیں ان میں دلکشی ہوں۔ صرف الفاظ اور انداز بیان کا دلکش ہونا مضمون کے لیے کافی نہیں۔

(3) تیسری اور آخری شرط اچھے مضمون کے لیے یہ ہے کہ مضمون نگار کے دل میں جو بات ہو وہ پڑھنے والوں تک من وعن پہنچ سکے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مضمون میں جو خیالات پیش کیے جائیں وہ اس طرح مربوط ہو جس طرح زنجیر کی کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں۔ خیالات میں ربط نہ ہونا اور انتشار کا پایا جانا مضمون کا عیب ہے۔ ہر پیرا گراف اپنے پہلے پیرا گراف سے فکری سطح پر جڑا ہونا چاہیے۔

عام طور پر ہر مضمون کے تین حصے ہوتے ہیں:

(1) تمہید (2) مضمون کا درمیانی حصہ (3) اختتام یا انجام

تمہید: مضمون کی ابتدائی حصہ تمہید کہلاتا ہے۔ اسے خاص طور پر دلچسپ ہونا چاہیے تاکہ پڑھنے والا مضمون کے ابتدائی جملوں کو دیکھ کر پورا مضمون پڑھنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہو جائے۔ تمہید کا حصہ اگر خشک اور غیر دلچسپ ہوگا تو پڑھنے والا اس کے مطالعے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر پائے گا۔ مضمون کے لئے ایک اچھی تمہید مضمون نگار کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس کے لئے فقط انداز بیان کی دلچسپی ہی کافی نہیں بلکہ تمہید میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے انھیں بھی مضمون سے مربوط ہونا چاہیے۔ اچھی تمہید مضمون کو ایک وحدت عطا کرتی ہے اس لئے یہ مضمون کی بنیادی شکل ہے۔

مضمون کا درمیانی حصہ: تمہید کے بعد مضمون نگار ان مسائل کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کے لئے تمہید قائم کی گئی تھی۔ یہ مضمون کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے اور پڑھنے والوں کو زیادہ متوجہ بھی کرتا ہے۔ اسی حصے میں مضمون نگار مضمون سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے اور اس کے حق میں دلائل بھی فراہم کرتا ہے۔ مضمون کا یہ حصہ زیادہ منطقی، فکر انگیز اور خیال افروز ہوتا ہے۔

مضمون نگار اس حصے میں موضوع سے متعلق مختلف تنقیدی جائزہ بھی لیتا ہے۔ اس حصے کی خوبی یہ مانی جاتی ہے کہ اس میں جذباتی پیرایے بیان سے پرہیز کیا جائے اور فقط اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر دلائل قائم کرنے کے بجائے منطقی استدلال کی روشنی میں کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ مضمون کے اس حصے میں اصل مسئلے کے تمام پہلو روشن ہو کر سامنے آجاتا ہے اور پڑھنے والا بھی عقل کی رہنمائی میں رفتہ رفتہ مضمون نگار کا ہم خیال ہو جاتا ہے۔ مضمون کا یہ حصہ باقی حصوں کے مقابلے میں طویل ہوتا ہے اور کئی پیرا گراف پر مشتمل ہوتا ہے۔

اختتام: مضمون کا آخری حصہ اختتامیہ کہلاتا ہے۔ اس حصہ میں مضمون نگار مضمون میں بیان کیے گئے تمام پہلوؤں کو کم سے کم الفاظ میں

سمیٹ کر حاصل کلام بیان کرتا ہے۔مضمون کے درمیانی حصہ میں جو تفصیلات پیش کی گئیں تھیں اور موضوع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا تھا اس سے برآمد ہونے والے نتائج اختتامیہ میں نہایت موثر انداز میں پیش کئے جاتے ہیں۔اختتامیہ کی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس کو پڑھ لینے کے بعد قاری کے ذہن میں کوئی تشنگی باقی نہ رہ جائے اور موضوع کے متعلق قاری مضمون نگار کے خیالات سے پوری طرح اتفاق کرلے۔اختتامیہ میں جو نتائج پیش کیے جاتے ہیں اگر ان کی پیشکش کا انداز واضح ،اطمینان بخش اور موثر نہیں ہوگا تو پڑھنے والا ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جائے گا اور یہ اختتامیہ کا عیب ہے۔پورے مضمون کو چند جملوں میں اس طرح سمیٹ لینا کہ تمام ضروری پہلو سامنے آجائے اگر چہ دشوار ہوتا ہے لیکن ایک اچھے اختتامیہ کی یہ ہی خوبی سمجھی جاتی ہے۔

4.5 مقالہ کی تعریف وخصوصیات

مقالہ یا تحریر،عربی،اردوزبان کا لفظ ہے۔مقالہ کے لغوی قول،مقولہ،کہی ہوئی بات یا کلام کے ہیں۔اصطلاح میں کسی خاص موضوع پر علمی،تحقیقی،ادبی و اخلاقی مضمون یا کسی خاص موضوع پر حقائق کے ساتھ درست تحریری اظہار کو مقالہ کہا جاتا ہے۔مقالہ میں تحقیقی،تنقیدی،ادبی و اخلاقی نوعیت کی زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔مقالے میں سنجیدہ اور عالمانہ گفتگو کی جاتی ہے۔یہ عام قارئین کے لیے نہیں بلکہ خاص لوگوں کے لیے لکھا جاتا ہے۔مقالہ میں کسی بات کو ثابت کرنے کے لیے باقاعدہ تحقیق کرکے درست حوالے دیے جاتے ہیں اور ان پر مدلل بحث کرکے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔عام طور پر مقالہ عام مضامین سے تھوڑے یا زیادہ طویل ہوتے ہیں اور مقالہ کو مضمون بھی کہہ سکتے ہیں۔

مقالہ کو انگریزی میں ڈیزرٹیشن (Dissertation)،تھیسز (Thesis)،ایسے (Essay)،آرٹیکل (Article)،ٹریٹائز (Treatise)،مونوگراف (Monograph) بھی کہا جاتا ہے۔ڈیزرٹیشن یا تھیسز کسی یونیورسٹی یا تعلیمی ادارے سے دیے گئے منتخب موضوع پر لکھا گیا تحقیقی مقالہ ہوتا ہے جس کو لکھنے کے بعد تعلیمی ادارے سے سند عطا کی جاتی ہے۔اسے سندی مقالہ بھی کہا جاتا ہے۔ایسے، آرٹیکل،ٹریٹائز یا مونوگراف کوئی شخص خود اپنی پسند کے موضوع کو منتخب کرکے اس پر تحقیق کرتا ہے اور پھر مقالہ تیار کرتا ہے۔اس کو غیر سندی مقالہ بھی کہا جاتا ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقالہ اس تحریر کو کہتے ہیں جسے کوئی محقق اپنے تحقیقی کام کو تکمیل کے بعد پیش کیا گیا ہو۔

ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:''تحقیقی مقالہ وہ تحریر ہے جس میں زیر تحقیقی موضوع کے متعلق جملہ مواد کو پیش کیا جاتا ہے اور اس کے بعد مناسب نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔''

(گیان چند جین،تحقیق کا فن،صفحہ:67)

علم ایک سمندر ہے،جس کی گہرائی کو مکمل طور پر جاننا انسان کے لئے ممکن نہیں۔انسان کی علمی عظمت کا تمام انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اس سمندر کی گہرائی میں کس حد تک اتر سکتا ہے اور قیمتی علمی نتائج کے کس قدر جواہرات اپنے ساتھ لاکر دنیا کے سامنے پیش کرسکتا ہے۔ہر محقق چاہتا ہے کہ اس کی علمی کوششیں کامیاب ہوں اور بلاشبہ ہر محقق کی خواہش بھی یہی ہوتی ہے۔اس لئے مقالہ کچھ ایسی صفات اور خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے جس کے بغیر تحقیقی سفر کی کامیابی کے خواب کی تعبیر نہیں مل سکتی۔ایک معیاری مقالہ وہ ہوتا ہے جس کی تیاری میں درج ذیل خصوصیات شامل ہوں:

مواد کی ترتیب وتنظیم

مقالہ نگاری کا ایک اصول یہ ہے کہ جس موضوع پر مقالہ لکھنا ہو اس سے متعلق جو مواد جمع کیا گیا ہو اس کو اچھے اسلوب میں مرتب کیا جائے یعنی اچھی ترتیب کے ساتھ لکھا جائے۔مواد کی ترتیب وتنظیم کے مرحلہ پر پہنچ کر محقق کو چاہئے کہ وہ چند باتوں کو ذہن میں رکھے۔

☆وہ اپنے خیالات اور علم کی ایک شکل طے کر لے۔صرف متعلقہ مواد کو خوب احتیاط کے ساتھ منظّم و مرتب کرے۔یہ حقیقت ہے کہ کام کسی بھی نوعیت کا کیوں نہ ہو اس کی ترتیب و تنظیم عمدہ ہو تو وہ کام بہت اچھے طریقہ سے انجام پاتا ہے۔

☆ان مقاصد کے حصول کے لئے یہ ضروری ہے کہ محقق پہلے تحریری شکل میں ایک خاکہ تیار کر لے۔اس طرح مطالعہ کی صورت حال اس کے ذہن میں واضح ہو جائے گی اور اس کے مطابق وہ اس کو خوب صورت انداز میں پیش کر سکے گا۔تحریری خاکہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مقالہ کے مختلف حصوں کا ربط واضح ہو جاتا ہے۔مقالے کا ہر ایک حصہ باہم مربوط ہونا چاہئے۔تب ہی اس کو صحیح معنوں میں معیاری مقالہ کہا جا سکتا ہے۔

☆مواد کی تنظیم و ترتیب میں خاکہ کی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کی روشنی میں سبھی ابواب کے عنوان اور ذیلی سرخیاں بنائی جا سکتی ہیں۔اس کام کو احتیاط سے کرنا چاہئے کیونکہ سرخیاں قاری کے لئے تمام مواد کو ایک نظر میں پیش کرتی ہیں، اس کی مدد کرتی ہیں کہ وہ مقالہ میں اپنے مطلب کی چیز پالے۔

تسوید مقالہ

مقالہ سے متعلقہ مواد کو منظّم و مرتب کر لینے کے بعد اسے لکھنے کی باری آتی ہے۔اصطلاح میں اسے ''تسوید'' کہتے ہیں۔تسوید مقالہ بہت اہم مرحلہ ہوتا ہے۔اس پر پہنچ کر محقق کو اپنے موضوع سے متعلقہ مرتب شدہ مواد کو استعمال کرنا ہوتا ہے۔مواد کی ترتیب کے بعد مقالہ لکھنے کا کام شروع ہوتا ہے۔اس مواد کی تلاش، چھان بین اور ترتیب میں جس محنت، دیانت اور وقت نظر سے کام لیا گیا ہو۔ان سبھی نکات کا اہتمام مقالہ کی تسوید میں ضروری ہے۔واضح فکر، مواد کی منطقی ترتیب، صحیح ترجمانی اور اثر انداز طرز تحریر میں ایک قطعی رشتہ ہے۔جس سے مقالہ کی تحریر میں عالمانہ شان اور محققانہ وقار پیدا ہوتا ہے۔

آغاز تحریر کے اصول

مقالے کی تحریر کا آغاز براہ راست اپنے موضوع سے کرنا ہی اچھا اور سائنسی طریقہ کار سمجھا جاتا ہے۔مقالہ کی قدر و قیمت اس بات سے نہیں جانچی جاتی کہ محقق نے اپنے موضوع کے بارے میں کتنا کہا ہے۔بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے کیا کہا ہے اور کس انداز سے کہا ہے۔براہ راست موضوع سے شروع کرنا مقالہ نگاری کا اہم اصول ہے۔وہ مقالہ جس کی تیاری میں اس اصول کا لحاظ رکھا گیا ہو وہ معیاری کہلاتا ہے۔

اسلوب تحریر

مقالے کے لئے اس کے اسلوب تحریر کا معیاری ہونا لازمی ہے۔اہل علم اس حقیقت کو بخوبی جانتے ہیں کہ ایک اہم اور عمدہ بات کو اگر دلکش انداز میں بیان نہ کیا جائے تو اس کی طرف سامعین اور قارئین متوجہ نہیں ہوتے۔اس کے مقابلہ میں عام سی بات کو اگر اچھے انداز میں پیش کیا جائے تو وہ ان کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔اس مقصد کے لئے محقق کو خوب محنت اور لگن سے کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ جو بات بھی لکھے سوچ سمجھ کر موقع و محل کے مطابق سیدھے سادھے انداز میں لکھے اور قاری کے لئے اس میں دلچسپی و لگن پیدا کرے۔انداز تحریر ہر ایک شخص اور موضوع کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔مقالہ کے اسلوب تحریر کو دو خصوصیات سے مزین ہونا چاہئے ایک سنجیدگی اور دوسرا اثر۔ان دونوں کے ساتھ تکمیل، وحدت اور وضاحت وغیرہ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

مقالے کی زبان

مقالے کی زبان عام فہم، سادہ اور دلکش ہو۔ثقیل اور طویل نوعیت کے جملوں سے گریز کیا جائے۔جس زبان میں مقالہ لکھا جا رہا ہے

اس کے علاوہ کسی دوسری زبان کے الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔ اگر استعمال ضروری ہوتو انہیں بریکٹ میں لکھا جائے۔ معیاری مقالہ وہ ہوتا ہے جس کے جملوں میں عام فہم، سادہ اور مناسب و موزوں الفاظ کا استعمال موقع ومحل کے مطابق کیا گیا ہو۔ زیادہ طویل، مرکب، غیر مستعمل اور فرسودہ الفاظ کے استعمال سے مقالہ کا معنی واضح نہیں ہوتا۔ مقالہ میں مقامی یا بازاری الفاظ کا استعمال بھی ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ ان کے استعمال سے زبان کی سنجیدگی ختم ہو جاتی ہے۔

معیاری مقالہ وہ ہوتا ہے جو کلمات کے تکرار سے خالی ہو یعنی ایک ہی بات کو بار بار نہ کہا جائے۔ کیونکہ مقالہ کا اسلوب کلمات کی تکرار سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے جملوں کی ساخت میں ایسے کلمات کو استعمال کیا جائے جو مروج اور عام فہم ہو۔ جملوں میں ایسے الفاظ اور کلمات کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہئے جو مستعمل نہ ہوں یا متروک ہوں۔

اختصار

اختصار معیاری مقالہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ مقالہ میں جس قدر کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم ادا ہوسکتا ہوا تنا ہی بہتر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس قدر اختصار سے کام لیا جائے کہ مقالہ نگار قاری کو اپنا مافی الضمیر بطریق احسن منتقل نہ کر سکے۔ مقالہ کے جملوں کو مختصر، پُر مغز، سادہ، آسان اور باہم مربوط ہونا چاہئے تا کہ مفہوم کو واضح طور پر سمجھا جا سکے۔

جدت

اچھے مقالے کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں کسی نہ کسی طرح کی جدت اور نیا پن موجود ہو۔ تحقیق کے میدان میں جدت کئی طرح کی ہوسکتی ہے جیسے معلوم اور معروف مواد کو نئے اور مفید اسلوب میں مرتب و مدون کر دیا جائے۔ منتشر مواد کو ایک عنوان کے تحت مدون و مرتب کیا جائے۔ ان طریقوں سے مقالہ میں نیا پن پیدا کیا جا سکتا ہے۔

جملوں اور پیرا گراف میں ربط

ایک کامیاب مقالہ کی تحریری خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے جملے آپس میں مربوط ہوتے ہیں اور اس میں کسی قسم کا انقطاع اور بُعد نہیں ہوتا۔ وہ سادہ، آسان اور واضح ہوتے ہیں۔ اسی طرح پیرا گراف کے درمیان میں بھی ربط پایا جاتا ہے۔ یہ ایسی خوبی ہوتی ہے جو مقالہ کی خوبصورتی اور دلکشی میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

حواشی وحوالہ جات

معیاری مقالہ کہلاتا ہے جس میں مقررہ اصولوں کے مطابق حواشی وحوالہ جات کا اہتمام کیا گیا ہو۔ مقالہ میں چونکہ اقتباسات کو نقل کیا جاتا ہے، اس لئے حاشیہ میں حوالہ کی صورت میں ان کتب کا نام لکھنا ضروری ہوتا ہے جس سے مواد اخذ کیا گیا ہو۔

مصادر ومراجع کی فہرست

کسی بھی تحقیقی مقالے کی ہیئت کا آخری حصہ ہوتا ہے۔ اس میں مقالہ میں استعمال کئے گئے تمام حوالہ جات کے مضامین، کتابوں اور رسالوں کی فہرست بنائی جاتی ہے۔ مصادر ومراجع کی فہرست کی بجائے کچھ محققین کتابیات (Bibliography) لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔

توجہ سے نظر ثانی کرنا

مقالہ پر نظر ثانی کرنا ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے، جو مقالہ کے مسودہ کی تکمیل کے بعد شروع ہوتا ہے۔ محقق کو چاہئے کہ وہ خوب محنت، توجہ اور وقت نظر سے کئی بار اپنے مقالہ پر نظر ثانی کرے۔ اپنے مقالے کا مقصد، اس کی زبان، حوالہ جات، اقتباسات، حواشی اور مواد کی ترتیب سب

پر ایک بار غور سے نظر ڈال کر ہی اس کا اختتام کرے۔

4.6 مضمون اور مقالہ کا باہمی رشتہ

مضمون اور مقالہ میں بہت ساری خوبیاں یکساں پائی جاتی ہیں اور انھیں خوبیوں کی بنا پر دونوں کا باہمی تعلق پیدا ہوتا ہے۔ دونوں کا شمار غیر افسانوی نثر میں ہوتا ہے۔ دونوں کے ابتدائی نقوش 1857ء سے پہلے ادبی کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ دونوں کی ابتدا سر سید تحریک کے زیر اثر ہوئی۔ مضمون کے لئے پہلے سے ہی ایک متعینہ موضوع کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ مقالہ میں بھی طے شدہ موضوع پر سنجیدگی سے غور و فکر کر کے ہی تحریر قلم بند کی جاتی ہے۔ مضمون اور مقالہ میں جو بھی موضوع ہوتا ہے اس کے تمام نکات سلسلہ وار پیش کئے جاتے ہیں۔ مضمون اور مقالہ دونوں ہی اپنی ایک خاص ہیئت میں تحریر کیا جاتا ہے۔ مضمون اور مقالہ میں پیش کردہ باتیں مدلل بیان کی جاتی ہیں اور ان دونوں میں منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ مضمون کا اپنا طریق کار ہے جب مضمون لکھا جاتا ہے تو مضمون کے اجزا کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مقالہ کا بھی اپنا طریقۂ کار ہے۔ اس میں تحقیقی اور استدلالی انداز کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ مضمون اور مقالہ کا مقصد معلومات کی فراہمی ہوتا ہے۔ مضمون میں سادہ معلومات دی جاتی ہے جبکہ مقالہ میں بصیرت اور عرفان کی فراہمی کی جاتی ہے۔ مضمون اور مقالہ دونوں میں زبان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ مضمون میں سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا جاتا ہے جبکہ مقالہ میں بھی زبان کی سادگی کے ساتھ اس کی علمیت کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔

4.7 آپ نے کیا سیکھا

آپ نے انشائیہ کی تعریف جانا۔
آپ نے انشائیہ کی خصوصیات کے متعلق جانا۔
آپ نے مقالہ نگاری کے متعلق معلومات حاصل کیں۔
آپ مضمون نگاری کے فن سے متعارف ہوئے۔
آپ نے انشائیہ اور مضمون کے باہمی رشتے کے متعلق جانا۔

4.8 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ انشائیہ کسے کہتے ہیں؟ اس کے اوصاف بیان کیجئے۔
2۔ مضمون کے متعلق معلومات فراہم کیجئے۔
3۔ مضمون اور انشائیہ پر مختصر نوٹ قلمبند کیجئے۔
4۔ مضمون اور انشائیہ کے باہمی رشتے پر اظہار خیال کیجئے۔
5۔ مضمون اور انشائیہ میں کیا فرق ہے؟ بیان کیجئے۔

4.9 سوالات کے جواب

جواب 1: انشائیہ نہ صرف اردو میں بلکہ عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی میں بھی موجود ہے۔ عربی میں اسے لفظ 'انشا' سے تعبیر کرتے ہیں جو 'نشا' مادہ سے مشتق ہے۔ فارسی میں بھی اسے انشا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسے ہندی میں 'للت رچنا' کہتے ہیں۔ انگریزی میں 'Essay Light' کہا جاتا ہے جو فرانسیسی لفظ 'Essai' سے ماخوذ ہے۔ اردو میں اس صنف کو اولاً لطیف پارہ، ادب لطیف، لائٹ ایسّے اور پھر انشائیہ

کے نام سے شناخت حاصل ہوئی۔ نیز انشا اور انشائیہ میں ایک بہت ہی مہین سا فرق ہوتا ہے ان تمام زبانوں میں انشا کے معنی و مفہوم میں بھی تضاد نہیں پایا جاتا ہے بلکہ دیکھا جائے تو بہت حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔

انشائیہ نگار موضوع کے بارے میں ہلکے پھلکے انداز کو اپناتا ہے۔ انشائیہ نگار بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ اپنے تاثرات کو بیان کرتا ہے۔ انشائیہ ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں انشائیہ نگار شگفتہ انداز میں اپنا مافی الضمیر قاری تک پہنچاتا ہے۔ وہ بعض اوقات طنز و مزاح سے بھی کام لیتا ہے۔ انشائیہ نگار زندگی کا مبصر ہوتا ہے اور نقاد بھی۔ وہ اپنے انشائیے کے ذریعے سے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کر دیتا ہے۔ زندگی اور اس کے مسائل سے پردہ اٹھانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ انشائیہ نگار زندگی کو جس طرح سے برتتا ہے اور جس رنگ میں دیکھتا ہے اسے وہ اپنی تمام تر داخلی کیفیات کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ وہ اختصار سے کام لے کر جامعیت کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔ انشائیہ میں کوئی پلاٹ نہیں ہوتا اور نہ یہ مزاحیہ مضمون ہوتا ہے اور نہ افسانہ اور مقالہ۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار شروع سے اختتام تک خود بھی بے خبر ہوتا ہے۔

جواب2: اردو اصناف نثر میں مضمون نویسی کی بہت اہمیت ہے۔ انگریزی زبان میں اسے Essay کہتے ہیں۔ لفظ Essay لاطینی لفظ Exigere سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی کسی کام کی کوشش کرنا ہے۔ اس صنف کا شمار غیر افسانوی ادب میں ہوتا ہے۔ کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات و جذبات کو مربوط او ع مدلل انداز مین اس طرح صفحۂ قرطاس پر لکھنا کہ پڑھنے والا خیالات سے متاثر ہو سکے۔ یعنی مضمون ہم اسے کہہ سکتے ہیں کس میں کسی ایک مخصوص موضوع یا خیال پر اظہار رائے پیش کی گئی ہو اور اس میں ربط و تسلسل قائم رکھا گیا ہو۔ اس کا آغاز اردو میں دہلی کالج سے ہوتا ہے سر سید احمد خان اور ان کے ساتھیوں نے اس صنف کو بہت فروغ دیا۔ سر سید احمد خان نے مضمون نگاری کے لئے تین شرطوں کو ضروری قرار دیا ہے:

(1) مضمون کا پیرایۂ بیان سادہ ہو۔ پیچیدہ اور پر تکلف اسلوب مضمون کا عیب ہے۔

(2) مضمون کی دوسری شرط یہ ہے کہ جو خیالات اور جو باتیں اس میں پیش کی جائیں ان میں دلکشی ہوں۔ صرف الفاظ اور انداز بیان کا دلکش ہونا مضمون کے لیے کافی نہیں۔

(3) تیسری اور آخری شرط اچھے مضمون کے لیے یہ ہے کہ مضمون نگار کے دل میں جو بات ہو وہ پڑھنے والوں تک من و عن پہنچ سکے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مضمون میں جو خیالات پیش کیے جائیں وہ اس طرح مربوط ہو جس طرح زنجیر کی کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں۔ خیالات میں ربط نہ ہونا اور انتشار کا پایا جانا مضمون کا عیب ہے۔ ہر پیراگراف اپنے پہلے پیراگراف سے فکری سطح پر جڑا ہونا چاہیے۔

جواب3: جواب کے لئے مضمون اور انشائیہ کے حصے کا مطالعہ کیجیے۔

4.10 فرہنگ

الفاظ	معنی
مشتق	لیا گیا، اخذ کیا گیا
ثقیل	بھاری، مشکل، دشوار
منظّم	ترتیب دیا ہوا
مرکب	ترکیب دیا ہوا
غیر مستعمل	جو استعمال میں نہ ہو

فرسودہ	پرانا
مافی الضمیر	غرض،نیت
بطریق احسن	اچھے طریقے سے
انقطاع	الگ ہو جانا
بُعد	فاصلہ
مصادر	نکلنے کی جگہ
مراجع	کسی چیز کے حوالے کے طور پر پیش کرنا
ناہمواری	بے ترتیبی، بدعملی

4.11 کتب برائے مطالعہ

1۔ ڈاکٹر قمر سلیم اختر ،انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1986ء

2۔ وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 2012ء

3۔ محمد اسد اللہ، انشائیہ کی روایت مشرق ومغرب کے تناظر میں، 2015ء

4۔ سید محمد حسنین، انشائیہ اور انشائیے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1997ء

5۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو، اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2013ء

6۔ مولانا آفتاب اظہر صدیقی، فن مضمون نگاری، مکتب العارف، دیوبند، 2016ء

7۔ محمد حسین آزاد، نیرنگ خیال حصہ اول ودوم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 1970ء

8۔ عبدالمغنی، پر محمد حسین آزاد کی انشاء پردازی، ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد، 2007ء

9۔ خواجہ حسن نظامی، سی پارۂ دل، دہلی، 2004ء

10۔ رشید احمد صدیقی، مضامین رشید، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، 1986ء

اکائی:5 محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری اور نیرنگ خیال

5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 محمد حسین آزاد کی شخصیت

5.4 محمد حسین آزاد کے ادبی کارنامے

5.5 محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری

5.5.1 ''نیرنگ خیال'' کا تعارف

5.5.2 ''نیرنگ خیال'' کا تفصیلی مطالعہ

5.5.3 ''نیرنگ خیال'' کا اسلوب

5.6 آپ نے کیا سیکھا

5.7 اپنا امتحان خود لیجئے

5.8 سوالات کے جواب

5.9 فرہنگ

5.10 کتب برائے مطالعہ

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں، ہم محمد حسین آزاد کی شخصیت کے بارے میں جانیں گے۔

اس اکائی میں، ہم محمد حسین آزاد کے ادبی کارناموں کے متعلق جانیں گے۔

اس اکائی میں، ہم تمثیل نگاری کے متعلق جانیں گے۔

اس اکائی میں، ہم محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری پر گفتگو کریں گے۔

اس اکائی میں، ہم ''نیرنگ خیال'' کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

5.2 تمہید

شمس العلماء محمد حسین آزاد کو اردو ادب میں جدید نظم کے بانی کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اردو ادب میں نیچرل شاعری کی ابتداء کو

سہرا نھیں کے سر جاتا ہے۔انھوں نے نہ صرف اردو نثر کو نیا انداز بخشا بلکہ اردو نظم کو بھی ایک نئی شکل وصورت عطا کی۔اسی شخص نے نئی تنقید کی شمع بھی روشن کی۔موضوعی مشاعرے کی بنیاد ڈالی اور مجلسی تنقید کی روایت کا آغاز کیا۔آزاد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو زبان کی پیدائش کا نظریہ پیش کیا اور برج بھاشا کو اردو زبان کا منبع و ماخذ قرار دیا۔آزاد نے اردو شاعری کا مزاج بدلا اور مقصدیت وافادیت سے اس کا رشتہ قائم کیا۔

محمد حسین آزآد نے اردو دنیا کو بہت گران قدر تصنیفات دی ہیں۔انھوں نے ''آب حیات'' کے عنوان سے ایک ایسی تاریخ لکھی کہ اس کی ابدی زندگی کی ضمانت بن گئی۔ان کی تصانیف میں سخن داں فارسی،قصص ہند، دربار اکبری، نگارستان فارس، سیر ایران، دیوان ذوق اور نیرگ خیال کافی اہم ہیں۔ان کے علاوہ نصابی کتابوں میں اردو کی پہلی کتاب، اردو کی دوسری کتاب، اردو کی تیسری کتاب،قواعد اردو اہمیت کی حامل ہیں۔مگر محمد حسین آزآد کو سب سے زیادہ شہرت 'آب حیات' سے ملی کہ یہ واحد ایسی کتاب ہے جس میں اردو شاعری کی صرف تاریخ یا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اہم لسانی مباحث بھی ہیں اور اردو زبان کے آغاز وارتقا پر بحث ہے۔اس کتاب کو اردو تنقید کو نقش اول بھی کہا جاتا ہے۔

5.3 محمد حسین آزاد کی شخصیت

مولانا محمد حسین آزاد کے جدامجد شاہ عالم کا ابتدائی عہد میں ہمدان سے دہلی آئے تھے۔یہ زمانہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا جس وقت مغلیہ سلطنت سمٹ کر دلی تک محدود ہوگئی تھی۔آزاد کے والد کا نام مولانا محمد باقر تھا اور وہ جید عالم اور مجتہد تھے۔ابتداء میں وہ سرکاری عہدوں پر فائز رہے لیکن ان کی شہرت کا سبب دہلی اخبار تھا جو 1836ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔1840ء میں اس کا نام تبدیل کر کے''دہلی اردو اخبار'' رکھا گیا۔1949ء میں محمد حسین آزاد اس اخبار کے منتظم قرار پائے۔یہ اخبار جولائی 1857ء سے''اخبارالظفر'' کے نام سے شائع ہونے لگا تھا۔اس کا آخری شمارہ 13 ستمبر 1857ء کو شائع ہوا۔مولانا محمد باقر باضابطہ جنگ آزادی سے وابستہ رہے اور مولوی عبدالقادر کے ساتھ جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔مولانا محمد باقر انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں 14یا15 ستمبر کو گرفتار کئے گئے اور 16 ستمبر 1857ء کو انہیں شہید کر دیا گیا۔

محمد حسین آزاد 5 مئی 1830ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم تعلیمی دہلی میں ہوئی جہاں نذیر احمد اور مولوی ذکاءاللہ جیسے ذہین ہم جماعت ان کے ساتھ تھے۔آزاد کو وظیفہ بھی ملتا تھا۔اساتذہ بھی ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔وہ جب چار برس کے تھے تو ان کی والدہ امانی خاتم کا انتقال ہوگیا۔ان کی پھوپی نے پرورش کی کچھ وقت کے بعد وہ بھی انتقال کر گئیں۔محمد حسین آزاد کے ذہن پر ان صدموں کا گہرا اثر پڑا۔آزآد دلی کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اس زمانے میں ملک کے حالات بگڑنے لگے۔ان کے والد مولوی محمد باقر کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بعد سے ہی وہ ادھر ادھر چھپتے چھپاتے رہے۔تقریباً دوڈھائی برس بڑی مشکلوں سے گزرے۔اس کے بعد اپنے کنبہ کے ساتھ لکھنؤ میں بھی رہے۔پھر کسی طرح لاہور پہنچے جہاں جنرل پوسٹ آفس لاہور میں سرنوشت دار کے عہدے پر ان کی تقرری ہوگئی۔تین سال کام کرنے کے بعد ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کے دفتر میں انہیں ملازمت مل گئی۔آزاد نے میجر فلر اور کرنل ہالرائڈ کے ساتھ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد ڈالی۔مولانا حالی بھی ان کے شریک کار رہے۔اس انجمن کی تشکیل کے بعد 1867ء سے مضمون نگاری، لکچر اور عنوانات کے تحت نظم لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔یہاں ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا بھرپور موقع ملا۔''انجمن پنجاب'' کے پلیٹ فارم سے انہوں نے بڑے اہم کارنامے انجام دیے۔گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی پروفیسر کی حیثیت سے ان کی عارضی تقرری ہوگئی اور پھر اسی عہدے پر مستقل کر دے گئے۔ایک اچھی ملازمت سے وابستگی نے آزآد کو ذہنی سکون عطا کیا۔اور پھر ان کے سفر کا سلسلہ شروع ہوا۔انھوں نے وسط ایشیا کا سفر کیا۔دوران سفر انھیں بہت کچھ نیا سیکھنے اور سمجھنے کو ملا۔سیاحت نے ان کے ذہنی افق کو بہت وسعت بخشی۔انہوں نے اپنے سفر کے مشاہدات اور تجربات کو قلم بند بھی کیا۔

بحیثیت صحافی اردو اخبار کے ذریعہ نثر و نظم میں بھی پختگی آ گئی تھی۔ ان کی پہلی نظم 24 مئی 1857ء کو انقلاب عبرت افزا کے عنوان سے شائع ہوئی۔ محمد حسین آزاد پر آخری وقت میں جنون اور دیوانگی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ جنون کی حالت میں ہی ان کی شریک حیات کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وجہ سے آزاد کا اضمحلال اور بڑھتا گیا۔ آخر کار 22 جنوری کو وہ لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کا مزار داتا گنج کے قریب واقع ہے۔

5.4 محمد حسین آزاد کے ادبی کارنامے

آزاد کی ہشت پہلو ادبی شخصیت میں تذکرہ نگاری، ادبی تحقیق و تاریخ، انشائیہ نگاری، نظم نگاری اور بچوں کے لئے ان کی درسی کتابیں، ''آب حیات''، ''دربار اکبری''، ''قصص ہند''، ''سخندان فارس'' سبھی شامل ہیں۔ اردو ادب کی وہ منفرد شخصیتیں جنھوں نے شاعری کو ایک نئی جہت دی ان کی شاعری میں بھی رمزیہ اور تمثیلی انداز موجود ہے چنانچہ آزاد کی مثنوی ''صبح امید'' اور ''خواب امن'' میں رزمیہ اور تمثیلی پہلو نمایاں ہیں۔

5.5 محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری

''انشائیہ کے لغوی معنی ہیں 'بات سے بات پیدا کرنا' یا 'عبارت کو سجانا اور آراستہ کرنا'۔ یہ صنف عربی ادب میں موجود تھی۔ عربی کے اہم انشاء پرداز ابن المقفع متوفی، جاحظ متوفی، صاحب بن اور ابن خلدون وغیرہ ہیں۔ ان کے اہم انشائیے ''الادب الصغیر''، ''الادب الکبیر''، ''کتاب النجلا''، ''البیان والیقین'' وغیرہ ہیں۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ انشائیہ مغرب سے مستعار لیا گیا ہے۔ نظیر صدیقی کا خیال ہے کہ انشائیہ کی صنف اردو ادب میں مغرب سے آئی جب کہ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر عصمت اللہ نے انشائیہ کو انگریزی کے Personal essay سے مماثل قرار دیا ہے۔

''نیرنگ خیال'' کے جتنے جدید ایڈیشن موجود ہیں ان سب کے مقدموں میں عموماً انشائیہ کا سلسلہ نسب مون تین سے جوڑا گیا ہے۔ انگریزی کے نقاد مون تین سے اس کا سلسلہ شروع کرتے ہیں اور انگریزی کے انشائیہ نگاروں میں چارلس لیمپ اسٹیونسن، ایڈیسن اور جانسن وغیرہ کے نام لئے جاتے ہیں۔ انگریزی ادب کے ناقدین اسے شخصی مضمون Personal essay کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ اسی زمانہ میں اردو میں ملا وجہی ''سب رس'' میں انشائیے لکھ رہے تھے۔ ''سب رس'' کے انشائیے مختلف موضوعات پر مبنی ہیں اور ان میں سے گیارہ کا موضوع عشق ہے۔ وجہی نے انھیں الگ سے عنوان قائم کر کے نہیں لکھا بلکہ جب عشق کا ذکر آیا تو پھر اس کے تحت لکھتا چلا گیا۔ انشائیہ کی تاریخ سمجھنے کیلئے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ صنف عربی اور پھر فارسی زبان سے ہوتی ہوئی اردو ادب تک پہنچی ہے۔ چنانچہ فارسی میں فتاحی نیشا پوری کی ''دستور العشاق'' میں انشائیے کے نمونے ملتے ہیں جس کا آزاد ترجمہ ملا وجہی نے ''سب رس'' میں پیش کیا ہے۔ دوسری تصنیف ملا رضی تبریزی کی ''حدائق العشاق'' کا آزاد ترجمہ رجب علی بیگ سرور نے ''گلزار سرور'' کے عنوان سے کیا ہے اور اس میں بھی انشائیہ کے نقوش نظر آتے ہیں۔ یہ کارنامے محمد حسین آزاد کی ''نیرنگ خیال'' سے پہلے کے ہیں۔ محمد حسین آزاد کے ہی دور کے سرسید احمد خاں کا انشائیہ ''امید کی خوشی'' انشائیہ کی ساری شرائط پوری کرتا ہے۔ نیرنگ خیال کے پندرہ برس بعد محسن الملک کا انشائیہ ''موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ'' اہم ہے۔

محمد حسین آزاد نے اردو میں پہلی بار باضابطہ طور پر انشائیہ لکھنے کی ابتدا کی۔ اس سے پہلے ملا وجہی کی تصنیف ''سب رس'' میں بھی انشائیہ کے ہلکے نقوش ملتے ہیں۔ آزاد ادبی مورخ بھی تھے اور شاعر بھی۔ انھوں نے بچوں کے لئے درسی کتابیں بھی لکھیں لیکن انشائیہ نگاری میں انھیں الگ مقام حاصل ہے۔

''نیرنگ خیال'' کے انشائیے تمثیلی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ 'تمثیل' کے لغوی معنی ہیں مثال دینا، تشبیہہ دینا یا مطابقت قائم کرنا۔ آسان الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی غیر مادی یا غیر مرئی چیز کو مرئی شکل میں پیش کرنا تمثیل نگاری کہلاتا ہے۔ اس کا استعمال عام طور سے اخلاقی اصلاح کے لئے کیا جاتا ہے جس میں غصہ، لالچ، خودغرضی، حسد، بزدلی، عیاری، غلامی وغیرہ جذبات کو مرئی شکل میں پیش کر انسانوں کو نیکی کا پیغام دیا جاتا ہے۔ تمثیل کا استعمال عہد قدیم سے کیا جا رہا ہے۔ مذہبی واقعات اور دیوی دیتاؤں کے قصے تمثیلی انداز میں پیش کئے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ملا وجہی نے اپنی کتاب ''سب رس'' میں حسن اور دل کا قصہ تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ تمثیل کو انگریزی میں allegory کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ گریک زبان کے لفظ allegoia سے مشتق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ 'کوئی ایسی نظم جس کا مفہوم علامتی اور استعاراتی انداز میں بیان کیا جائے۔

آزاد کے انشائیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تمثیلی انداز اختیار کیا۔ غیر مجرد اشیا اور صفات کو انھوں نے مجسم کر کے اشخاص کی شکل میں پیش کیا۔ ان کے ہاں ڈرامائی انداز بھی ہے اور کہانی کی سی کیفیت بھی ملتی ہے۔ ان کے انشائیے میں ایک مخصوص مقصد پوشیدہ رہتا ہے۔ آزاد یہ چاہتے تھے کہ قوم کے حالات بہتر ہوں اور وہ برائیوں سے گریز کریں تا کہ ان کی زندگی سنور سکے۔ ان کی تحریر میں خیال کی عظمت اور اخلاقی نقطہ نظر غالب نظر آتا ہے جس کو انھوں نے رمز و کنایہ اور استعارے کے ذریعے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

آزاد انشاپرداز پہلے ہیں اور نقاد، مورخ اور محقق بعد میں ہیں۔ ان کی توجہ زبان و بیان کی لطافت پر زیادہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان موجود ہے اور بڑے انشاپرداز میں یہ خصوصیت ہونی بھی چاہئے۔ ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے مہدی افادی نے اپنے مضمون ''اردو لٹریچر میں عناصر خمسہ'' میں آزاد کو ''آقائے اردو'' کے لقب سے نوازا ہے۔ ان کی انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہمیں ''آب حیات'' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ زبان کی نزاکت بیان کی لطافت، تشبیہہ اور استعارات کی رنگینی اور تراکیب کی شگفتگی آزاد کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اردو زبان وادب کی تاریخ ایک خشک موضوع ہے لیکن انھوں نے اپنے انداز بیان سے اسے دلکش بنا دیا ہے۔ شعراء کے حالات زندگی اس طرح بیان کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تمام منظر خود آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھ رہے ہوں۔ ایک محفل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صراحی بھی سرکشی کرتی ہے۔ اس لئے جگر خون ہو کر ٹپکتا ہے۔ کبھی وہ جھکتی ہے اور خندۂ قلقل سے ہنستی ہے۔ کبھی وہ قلقل حق حق ہو کر یاد الٰہی میں مصروف ہوتی ہے۔ مگر پیالہ اپنے کھلے منھ سے ہنستا ہے اور اس کے آگے دامن پھیلاتا ہے۔''

(محمد حسین آزاد، آب حیات، ص:51، اشاعت:1982)

ان کی تصنیف ''دربار اکبری'' ایک تاریخی کتاب ہے جس میں مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر اور اس کے جلیل القدر امرا کے دلچسپ قصے موجود ہیں۔ اس کتاب میں اکبر کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات، اس کے کارنامے، مہمات، تفریحی مشاغل، شادی بیاہ کے قصے، جنگوں کا بیان، شہزادوں اور شہزادیوں کا ذکر، ان کی محفلیں، بیگمات کی زندگی غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے پر دلکش انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

''مینا بازار لگا ہوا تھا۔ بیگمات بڑی پھرتی تھیں جیسے باغ میں قمریاں باہر بادل میں ہرنیاں۔ جہانگیر ان دنوں نوجوان لڑکا تھا۔ بازار میں پھرتا ہوا چمن میں آ نکلا ہاتھ میں کبوتر کا جوڑا تھا۔ سامنے کوئی پھول کھلا ہوا نظر آیا کہ عالم سرور میں بہت بھایا۔ چاہا کہ توڑے۔ دونوں ہاتھ رکے ہوئے تھے، وہیں ٹھہر گیا۔ سامنے سے ایک لڑکی آئی۔ شہزادے نے کہا بوا ذرا ہمارے کبوتر تو لے لو ہم پھول تو توڑ لیں۔ لڑکی نے دونوں کبوتر

لے لئے۔شہزادے نے کیاری میں جا کر چند پھول توڑے۔ پھر لوٹ کر آیا تو دیکھا لڑکی کے ہاتھ میں ایک کبوتر ہے پوچھا دوسرا کبوتر کیا ہوا؟ عرض کیا صاحب عالم وہ تو اڑ گیا۔ پوچھا ہیں! کیونکر اڑ گیا؟ اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسری مٹھی بھی کھول دی کہ حضور یوں اڑ گیا۔ اگر چہ دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے گیا مگر شہزادے کا دل اس انداز پر لوٹ گیا۔''

(بحوالہ ادبی اشارے، سلام سندیلوی، ص:141)

5.5.1 ''نیرنگ خیال'' کا تعارف

نیرنگ خیال آزاد کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ دو حصوں میں شائع ہوا ہے۔ حصہ اول میں آٹھ اور حصہ دوم میں پانچ انشائیے ہیں۔ ابتداء میں دیباچہ اور ''اردو اور انگریزی انشاء پردازی پر کچھ خیالات'' کے عنوان سے ان کا ایک مضمون شامل ہے۔ یہ مضمون ''نیرنگ خیال'' کی اشاعت سے چار سال قبل یعنی 1876ء میں 'انجمن مفید عام' کے رسالے میں شائع ہوا۔ اس مضمون سے آزاد کے اسلوب اور ادبی نظریات کا پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ شاید ترجمہ نہ کئے گئے ہوں لیکن اس میں دو رائے نہیں کہ یہ انگریزی سے مستفاد ہیں۔ ''نیرنگ خیال'' کے دیباچہ میں وہ خود رقم طراز ہیں کہ:

''اے جوہر زبان کے پرکھنے والوں، میں زبان انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں اور اس ناکامی کا مجھے بھی افسوس ہے۔ یہ چند مضمون جو لکھے ہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں سنے سنا فکر مناسب نے زبان کے حوالہ کیا۔ ہاتھوں نے اسے لکھ دیا اب حیران ہوں کہ نکتہ شناس اسے دیکھ کر کیا کہیں گے۔''

(نیرنگ خیال۔حصہ اول دیباچہ)

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آزاد نے انگریزی کے مضامین پڑھوا کر سنے اور معانی و مطالب دریافت کئے۔ خود ان کے کہنے کے مطابق وہ بہت اچھی انگریزی نہیں جانتے لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے مضامین انگریزی کے مشہور مضمون نگار Addison اور Johnson سے ماخوذ ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق نے ان مضامین کے نام کی فہرست دی ہے جن سے آزاد نے استفادہ کیا ہے جو ذیل میں درج ہیں۔

1۔انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

The endeavour of mankind to get rid of their burden a dream by Addison.

2۔شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار

The vision of the table of fame by Addison.

3۔آغاز آفرینش میں عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہوگا

An allegorical history of rest & labour by Addison.

4۔جھوٹ اور سچ کا رزم نامہ

Truth falsehood and fiction an allegory by Johnson

5۔گلشن امید کی بہار

The Garden of hope by Johnson

6۔سیر زندگی

The voyage of life by Johnson.

7۔علوم کی بدنصیبی

The conduct of patronage by Johnson.

8۔علمیت اور ذکاوت کے مقابلے

The allegory of wit and learning by Johnson

اگر یہ مندرجہ بالا مضامین جانسن اور ایڈیسن سے ماخوذ ہیں لیکن اگر ان مصنفین سے مستفاد کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کیونکہ انھیں مکمل طور پر ترجمہ کہنا مناسب نہیں ہے۔مثلاً ''شہرت عام و بقائے دوام کا دربار'' کے سارے کردار ہندوستانی ہیں۔ان میں غالبؔ اور ذوقؔ بھی شامل ہیں۔ظاہر ہے یہ کردار صرف اور صرف محمد حسین آزاد کی انشاء پردازی کا نتیجہ ہیں۔

نیرنگ خیال کے آغاز میں اپنے ''مضمون اردو اور انگریزی انشاء پردازی پر کچھ خیالات'' میں انھوں نے یہ لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں اردو انشاء پردازی پر اعتراض کئے جا رہے تھے۔آزاد کے خیال میں کچھ اعتراضات صحیح تھے مگر کچھ قابل قبول نہیں تھے۔بہر حال انگریزی کے جو مضامین ان کی نظر سے گزرے یا جن کے بارے میں انھوں نے سنا اور متاثر ہوئے انہیں اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لئے ایک اصول کو پیش نظر رکھا۔وہ لکھتے ہیں۔

''جو سرگذشت بیان کرے اس طرح ادا کرے کہ سامنے تصویر کھینچ دے اور نشتر اس کا دل پر کھٹکے۔۔۔بیشک فن انشاء اور لطف زبان تفریح طبع کا سامنا ہے لیکن جس طرح ہمارے متاخرین نے ایک ہی مرض کی دوا سمجھ لیا ہے انگریزی میں ایسا نہیں ہے۔''

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انشائیہ لکھتے ہوئے آزاد کو انشائیہ نگاری کے فن کی نزاکتوں کا احساس تھا۔اسی وجہ سے انھوں نے اس کی بنیاد کسی نہ کسی مقصد پر رکھی ہے۔وہ اپنے ادبی سرمایہ سے بے خبر نہ تھے مگر متاخرین سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔ان کی مجتہدانہ فکر صحیح زبان کے حوالے سے خیالات کو پیش کرنا چاہتی تھی۔انھوں نے انشاء پردازی کا قاعدہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آسان اور سیدھی سادی تشبیہیں اور قریب کے استعارے استعمال کئے جائیں جو سنتے ہی سمجھ میں آ جائیں۔آزاد چاہتے تھے کہ انگریزی کے باغ سے نئے پودے لے کر اپنا گلزار سجانا چاہئے مگر یہ تصرف خوبصورتی کے ساتھ ہو۔وہ اپنی مشرقی روایات کو ترک نہیں کرنا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ خاکے میں اس طرح جان ڈالی جائے کہ ہندوستانیوں کو احساس ہو کہ کہ میر اور سودا کے زمانے نے عمر دوبارہ پائی۔

5.5.2 ''نیرنگ خیال'' کا تفصیلی مطالعہ

''نیرنگ خیال'' حصہ اول کا پہلے انشائیے کا عنوان ''آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا'' ہے۔اس میں آزاد نے مجرد اشیا اور صفات کو جسمانی پیکر عطا کر کے ان کے ذریعے درس و اخلاق اور نصیحت کی باتیں کی ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ ابتداء میں ساری اولاد آدم بے فکری سے زندگی بسر کر رہی تھی۔انسانوں کی زندگی فطرت کے عین مطابق تھی اور قدرتی طور پر انھیں جو عیش و آرام میسر تھے وہ انھیں پر قناعت کرتے تھے اور انھیں سے لطف اندوز ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ جب انسانوں نے ترقی کرنا شروع کر دیا تو اس میں اخلاقی انحطاطی پیدا ہو گئی اور خود غرضی،فریب،سینہ زوری جیسے شیاطین نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا۔جس کے نتیجے میں مصائب و آلام کے طوفان نے انسانوں کو مشکل میں ڈال دیا۔پھر آرام اور محنت کے درمیان جب باہمی توازن پیدا ہوا تو صورت حال میں تبدیلی آئی۔اس انشائیے میں آزاد نے یہ سمجھانے کی

کوشش کی ہے کہ حد سے زیادہ آرام پسندی اور کاہلی قوموں کی تباہی کی وجہ بنتی ہے۔

دوسرے انشائیے کا عنوان ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ'' ہے۔جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ سچ اور جھوٹ کے درمیان آپسی جنگ ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔اس میں آزاد نے سچ اور جھوٹ کے متعلق تمثیلی انداز میں لکھا ہے کہ سچ اور جھوٹ میں روزازل سے کشمکش رہی ہے۔سچ میں جو سختی، تلخی اور کڑواہٹ ہے اس کی وجہ سے جھوٹ کو آگے بڑھنے کا موقع مل جاتا ہے لیکن چونکہ سچ ہمیشہ قائم و دائم رہنے کی طاقت رکھتا ہے لہٰذا ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے اور سچ اس پر غالب آتا ہے۔

تیسرے انشائیے کا عنوان ''گلشن امید کی بہار'' ہے۔اس میں آزاد نے یہ بتایا ہے کہ امید کے سہارے دنیا قائم ہے۔لیکن امید کے ساتھ ساتھ سخت محنت کی بھی ضرورت ہے ورنہ غریبی جڑ پکڑ لیتی ہے۔آزاد نے اس میں امید کی طاقت کو بہت ہی مخصوص انداز سے بیان کیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے محنت کی عظمت کو بھی واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

چوتھے انشائیے کا عنوان ''سیر زندگی'' ہے۔اس میں وہ انسانی زندگی کے سفر مسلسل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔وہ زندگی کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عمر رواں کا جہاز بڑھتا رہتا ہے۔یہ دنیا ایک دارالامتحان ہے۔انسان بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کا سفر کرتا ہے۔زندگی کو انھوں نے دریا سے تشبیہہ دی ہے کہ وہ ایک دریا ہے اور اس میں انسان کا ڈوبنا یعنی موت سے ہم کنار ہونا سب کا مقدر ہے۔کوئی پہلے ڈوبتا ہے اور کوئی بعد میں۔

پانچواں انشائیے کا عنوان ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'' ہے۔اس میں آزاد نے انسانی فطرت کے ایک اہم پہلو کو پیش کیا ہے۔انسان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔اسے اپنی مصیبت بڑی اور دوسروں کی مصیبت کم معلوم ہوتی ہے اور اگر کسی طرح سے اپنی مصیبت سے نجات دلا دی جائے اور دوسروں کی مصیبت کو اس کے سر لاد دیا جائے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی مصیبت ہی بہتر تھی۔

چھٹے انشائیے کا عنوان ''علوم کی بدنصیبی'' ہے جس میں آزاد نے بتایا ہے کہ مختلف علوم کی بدولت انسان زندگی میں آرام و آسائش حاصل کرسکتا ہے لیکن کچھ نااہلوں کی وجہ سے اہل کمال کو مسائل درپیش ہوتے ہیں۔خوشامد اور غرور کی لعنت جب انسان پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو اچھائی ختم ہوجاتی ہے اور برائیاں جنم لینے لگتی ہیں۔خوشامد کے ذریعہ بہت سے نااہل عہدوں پر فائز ہوجاتے ہیں اور غرور میں ڈوب جاتے ہیں۔ لیکن رشک وحسد کی وجہ سے بدنامی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ساتویں انشائیے کا عنوان ''علمیت اور ذکاوت کے مقابلے'' ہے میں آزاد نے یہ وضاحت کردی ہے کہ انہوں نے Learning کے لئے علمیت اور Wit کے لئے ذکاوت کا لفظ استعمال کیا ہے انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ذکاوت میں Wit کا مفہوم پوری طرح نہیں آتا لیکن انھیں کوئی اور لفظ نہ سوجھ سکا۔اس انشائیہ میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ صرف علم یا صرف ذکاوت انسان کے لئے کافی نہیں بلکہ ان دونوں کا امتزاج ضروری ہے تبھی انسان ترقی کی منازل با آسانی طے کرسکتا ہے۔

آٹھواں انشائیہ ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار'' کے عنوان سے درج ہے جو تقریباً طبع زاد ہے۔اس دربار میں انھوں نے ایسے لوگوں کو پیش کیا ہے جنہوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے اور شہرت حاصل کی۔آزاد نے راجہ رام جی اور والمیکی سیاس دربار کا آغاز کیا ہے۔ پھر راجہ بھون اور سنگھاسن بتیسی کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے یونان سے اگر افلاطون ارسطو اور سکندر اٹھایا ہے تو ایران سے شاہنامہ کے ہیرو رستم اور فردوسی کو سامنے لائے ہیں۔فردوسی کا ذکر ہندوستان میں محمود غزنوی کے ساتھ بھی کیا ہے اور بہت ساری اہم شخصیتوں کی خصوصیات کے ساتھ

آخر میں بڑے دلچسپ انداز میں اپنا بھی ذکر کیا ہے۔اس مضمون میں انھوں نے اگر چہ فرضی دربار سجایا ہے لیکن اس میں جن شخصیات کو ن پیش کیا ہے ان کی تصویر کشی اس انداز سے کی ہے کہ ان کے خدوخال ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔اس مضمون میں تشبیہہ،استعارہ اور ایہام کا خوبصورتی اور سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے۔

5.5.3 ''نیرنگ خیال'' کا اسلوب

آزاد کے اسلوب اور ان کی انشاء پردازی کی لاثانی ہے۔انھوں نے انشائیہ پر نہایت عمدہ رنگ وروغن چڑھایا اور اگر ان انشائیوں کو صرف ترجمہ کہا جائے تو معلوم ہوتا ہے ایڈیسن اور جانسن استعاراتی انداز میں مشرقی نغمے سنا رہے ہیں۔آزاد مشرق کی ادبی روایات کے وارث، امین ار پاسدار تھے لیکن انھوں نے مغرب سے بھی اپنے اسلوب کو روشن وتابناک بنانے کے لئے ان کا انداز سخن مستعار لیا۔مہدی افادی نے انھیں 'آقائے اردو' کا خطاب بجا طور پر دیا ہے اور بلاشبہ یہ خطاب ان کے قامت پر صادق آتا ہے۔

آزاد کے ان تمام انشائیوں میں افسانویت پائی جاتی ہے اور افسانویت کا محور تخیل ہے۔یہ تخیل ہی کا کمال ہے کہ وہ غیر مادی اشیا کی تجسیم کرتے ہیں۔مثلاً وہم انسان کی ایک ذہنی کیفیت ہے مگر آزاد نے اسے اس طرح جسم ولباس عطا کیا ہے کہ لگتا ہے جیسے وہم کوئی جیتا جاگتا آدمی ہے:

''ایک شخص سوکھا سہاد بلا پے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بری معلوم ہونے لگتی تھی وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے ہوئے تھا جس کا دامن قیامت سے بندھا ہوا تھا اس پر دیوزادوں اور جناتوں کی تصویریں زردوزی سے کڑھی تھیں اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب وغریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں اس کی آنکھیں وحشیانہ تھیں مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور اس کا نام وہم تھا۔''

مندرجہ بالا اقتباس ڈرامائیت سے بھرپور ہے۔یہ انسان کی ذہنی کیفیت کا بیان بھی ہے اور ایک شخص کا سراپا بھی اور دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا وہم جس طرح سے کام کرتا ہے،استعارے کی لڑیاں اسے واضح کرتی چلی جاتی ہیں۔وہم وحشت ہے اس میں قرار نہیں مگر وہم حقیقت میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔چنانچہ آزاد نے اس کے بے حقیقت ہونے کو افسردگی سے استعارہ کیا ہے۔اس کے سراپا میں جو ڈرامائیت ہے، وہ آزاد کے اسلوب کی اہم خصوصیت ہے۔وہم کے ہاتھ میں آئینے کا ہونا اور چالاکی وپھرتی سے پھرنا وہم کے کردار کو متحرک اور ڈرامائیت سے بھرپور بنا دیتا ہے۔

آزاد کے اسلوب کا ایک اہم وصف ان کی خطابت اور ان کے مکالموں میں خود کلامی کا انداز ہے۔یہ تخیل کی ایسی بلندی ہے جو ہر اسٹیج پر انھیں محو کلام رکھتی ہے۔وہ پرواز تخیل سے ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ تنہا ہوتے ہیں اور تب وہ خود سے محوِ کلام ہوتے ہیں۔مثلاً ''نیرنگ خیال'' کے دیباچہ کی یہ آخری سطر ملاحظہ ہو۔

''سبب یہ کہ ملک میں ابھی اس طرز کا رواج نہیں، خیر آزاد، ناامید نہیں ہونا چاہئے۔''

خود کلامی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

''کیوں آزاد! مجھے تو ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو شہرت کی ہوس یا انعاموں کی طمع پر خاک، گوشہ عافیت میں بیٹھے ہیں اور سب بلاؤں سے محفوظ ہیں، نہ انعام سے خوشی، نہ محرومی سے ناخوش، نہ تعریف کی تمنا، نہ عیب چینی کی پروا، اے خدا دل آزاد دے اور حالت بے نیاز۔''

اسی خود کلامی اور ڈرامائیت کے ذریعے آزاد جذبات واحساسات کو جیتا جاگتا روپ عطا کرتے ہیں۔وہ پہلے کسی خصوصیت یا صفت کو

جسمانی پیکرعطا کرتے ہیں اس کے بعد اس کو ایسی شکل وصورت میں ڈھال دیتے ہیں کہ اس کی ڈرامائیت اور افسانویت بڑھ جاتی ہے اور تاثر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

آزاد کی تحریروں میں ظرافت بھی ہے۔''نیرنگ خیال'' کے ہر انشائیہ میں کہیں نہ کہیں ایک تبسم ہر جگہ موجود رہتا ہے مثلاً ''آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا'' پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے اس میں ایک قوم کا سراپا کھینچا ہے جو کام کرتے کرتے سست پڑ چکے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''سب کے سب ضعف و ناطاقتی سے زمین پر بچھے جاتے تھے۔۔۔ان میں تھکن اور سستی کی وبا پھیلی ہوئی تھی اور ناتوانی ان پر سوار تھی،صورت اس کی یہ کہ آنکھیں بیٹھی ہوئیں، چہرہ مرجھایا ہوا، رنگ زرد، منہ پر جھریاں پڑیں کمر جھکی، گوشت بدن کا خشک، ہڈیاں نکلی ہوئیں، غرض دیکھا کہ سب ہانپتے کانپتے روتے بسورتے آہ آہ کرتے چلے آتے ہیں۔''

آزاد کے اسلوب کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کا قلم ہر جامد منظر کو متحرک بنا کر پیش کرتا ہے۔فضاء آفرینی کی یہ کیفیت یوں تو ان کے ہر کارنامے میں نظر آتی ہے لیکن ''نیرنگ خیال'' میں یہ اپنے عروج پر ہے۔ان کی منظر کشی ادبیت کی چاشنی رکھتی ہے۔انھوں نے چند سطروں میں مرقع کھینچ کر دکھ دیا ہے:

''ایک پیر خرد و دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس جامہ۔۔۔کھڑکی دار بگڑی باندھے جریب ٹیکتے آئے تھے مگر ایک لکھنو کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے بانکے۔۔۔ان سے دست وگریباں ہوجاتے لیکن چار رخا کسارا اور پانچواں تاجداران کے ساتھ تھا یہ بچالیتے تھے۔''

آزاد کے اسلوب میں علم بیان کی آرائش بھی ہے۔استعارات کی طرفگی اور تشبیہات کی دوشیزگی ہے،رمز وتمثیل کے اشارے وکنایے ہیں، نازک خیالی کا طلسم ہے۔ظرافت کی شگفتہ کلیاں ہیں ان تمام گوشوں کے ساتھ اخلاقیات کی آفاقیت بھی ہے اور مشرقیت کی وہ خیال انگیزی بھی ہے جو فکر ونظر کی راہ میں زندگی کے پاکیزہ اصولوں کی مشعلیں روشن کرتی ہے۔

5.6 آپ نے کیا سیکھا

آپ نے محمد حسین آزاد کی شخصیت کے بارے میں جانا۔
آپ نے محمد حسین آزاد کے ادبی کارناموں کے متعلق جانا۔
آپ نے تمثیل نگاری کے متعلق معلومات حاصل کیں۔
آپ نے محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری کے متعلق جانا۔
آپ نے ''نیرنگ خیال'' کا تفصیلی جائزہ لیا۔

5.7 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔محمد حسین آزاد کی ''نیرنگ خیال'' کا تعارف پیش کیجئے۔
2۔آزاد کی شخصیت پر روشنی ڈالیے۔
3۔''نیرنگ خیال'' میں شامل مضامین کے نام لکھئے۔
4۔''نیرنگ خیال'' کے کسی ایک مضمون کا خلاصہ لکھئے۔

5۔محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری پر ''نیرنگ خیال'' کے خصوصی حوالے سے روشنی ڈالیے۔

5.8 سوالات کے جواب

جواب 1: نیرنگ خیال آزاد کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ دو حصوں میں شائع ہوا ہے۔ حصہ اول میں آٹھ اور حصہ دوم میں پانچ انشائیے ہیں۔ ابتداء میں دیباچہ اور ''اردو اور انگریزی انشاء پردازی پر کچھ خیالات'' کے عنوان سے ان کا ایک مضمون شامل ہے۔ یہ مضمون ''نیرنگ خیال'' کی اشاعت سے چار سال قبل یعنی 1876ء میں 'انجمن مفید عام' کے رسالے میں شائع ہوا۔ اس مضمون سے آزاد کے اسلوب اور ادبی نظریات کا پتہ چلتا ہے کہ انشائیہ شاید ترجمہ نہ کئے گئے ہوں لیکن اس میں دورائے نہیں کہ یہ انگریزی سے مستفاد ہیں۔ ''نیرنگ خیال'' کے دیباچہ میں وہ خود رقم طراز ہیں کہ:

''اے جو ہر زبان کے پرکھنے والوں، میں زبان انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں اور اس ناکامی کا مجھے بھی افسوس ہے۔ یہ چند مضمون جو لکھے ہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں سنے سنا فکر مناسب نے زبان کے حوالہ کیا۔ ہاتھوں نے اسے لکھ دیا اب حیران ہوں کہ نکتہ شناس اسے دیکھ کر کیا کہیں گے۔''

جواب 2: محمد حسین آزاد 5 مئی 1830ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم تعلیمی دہلی میں ہوئی جہاں نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ جیسے ذہین ہم جماعت ان کے ساتھ تھے۔ آزاد کو وظیفہ بھی ملتا تھا۔ اساتذہ بھی ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ وہ جب چار برس کے تھے تو ان کی والدہ امانی خاتم کا انتقال ہو گیا۔ ان کی پھوپی نے پرورش کی کچھ وقت کے بعد وہ بھی انتقال کر گئیں۔ محمد حسین آزاد کے ذہن پر ان صدموں کا گہرا اثر پڑا۔ آزاد دلی کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اس زمانے میں ملک کے حالات بگڑنے لگے۔ ان کے والد مولوی محمد باقر کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بعد سے ہی وہ ادھر ادھر چھپتے چھپاتے رہے۔ تقریباً دو ڈھائی برس بڑی مشکلوں سے گزرے۔ اس کے بعد اپنے کنبہ کے ساتھ لکھنؤ میں بھی رہے۔ پھر کسی طرح لاہور پہنچے جہاں جنرل پوسٹ آفس لاہور میں سرنوشت دار کے عہدے پر ان کی تقرری ہو گئی۔ تین سال کام کرنے کے بعد ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کے دفتر میں انہیں ملازمت مل گئی۔ آزاد نے میجر فلر اور کرنل ہالرائڈ کے ساتھ ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد ڈالی۔ مولانا حالی بھی ان کے شریک کار رہے۔ اس انجمن کی تشکیل کے بعد 1867ء سے مضمون نگاری، لکچر اور عنوانات کے تحت نظم لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا بھرپور موقع ملا۔

جواب 3:

1۔انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

The endeavour of mankind to get rid of their burden a dream by Addison.

2۔شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار

The vision of the table of fame by Addison.

3۔آغاز آفرینش میں عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہوگا

An allegorical history of rest & labour by Addison.

4۔جھوٹ اور سچ کا رزم نامہ

Truth falsehood and fiction an allegory by Johnson

5۔گلشن امید کی بہار

The Garden of hope by Johnson

6۔سیر زندگی

The voyage of life by Johnson.

7۔علوم کی بدنصیبی

The conduct of patronage by Johnson.

8۔علمیت اور ذکاوت کے مقابلے

The allegory of wit and learning by Johnson

5.9 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اضملال	کمزوری	مجتہدانہ	غیر معمولی صلاحیت
گلزار	پھلواری	تفریح طبع	طبیعت خوش کرنے کا عمل
دوام	ہمیشہ رہنے والا	مستفاد	فائدہ حاصل کیا ہوا
منبع	سرچشمہ	قصص	قصے، کہانیاں
پاداش	صلہ، بدلا	جید عالم	سب سے بڑا
متاخرین	بعد میں آنے والے	سرگذشت	بیتا ہوا
تصرف	قبضہ	جلیل القدر	معزز
خندہ	تبسم، قہقہہ	قلقل	سراحی میں موجود شراب کی آواز

5.10 کتب برائے مطالعہ

1۔ محمد حسین آزاد، نیرنگ خیال حصہ اول ودوم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 1970ء

2۔ عبدالمغنی، پر محمد حسین آزاد کی انشاء پردازی، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، 2007ء

3۔ محمد اسداللہ، انشائیہ کی روایت مشرق ومغرب کے تناظر میں، 2015ء

4۔ ڈاکٹر قمر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1986ء

5۔ سید محمد حسنین، انشائیہ اور انشائیے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1997ء

6۔ وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 2012ء

7۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو، اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2013ء

اکائی:6 خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری اور سی پارۂ دل

6.1 اغراض و مقاصد
6.2 تمہید
6.3 خواجہ حسن نظامی کی شخصیت
6.4 خواجہ حسن نظامی کے ادبی کارنامے
6.5 خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری
6.5.1 ''سی پارۂ دل'' کا تعارف
6.5.2 ''سی پارۂ دل'' کا تفصیلی مطالعہ
6.5.3 ''سی پارۂ دل'' کا اسلوب
6.6 آپ نے کیا سیکھا
6.7 اپنا امتحان خود لیجئے
6.8 سوالات کے جواب
6.9 فرہنگ
6.10 کتب برائے مطالعہ

6.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں، ہم خواجہ حسن نظامی کی شخصیت کے بارے میں جانیں گے۔
اس اکائی میں، ہم خواجہ حسن نظامی کے ادبی کارناموں کے متعلق جانیں گے۔
اس اکائی میں، ہم خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری پر گفتگو کریں گے۔
اس اکائی میں، ہم ''سی پارۂ دل'' کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔
اس اکائی میں، ہم ''سی پارۂ دل'' کے اسلوب پر گفتگو کریں گے۔

6.2 تمہید

حضرت خواجہ حسن نظامی کی ذات مختلف صفات و کمالات کی حامل تھی۔ وہ اردو زبان کے صاحب طرز انشا پرداز اور ادیب تھے۔ وہ

بڑے صوفی بزرگ، مصنف ومولف بھی تھے اور ساتھ ہی صحافی بھی۔ وہ خدمات گار خلق اور روحانی مرشد کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی سراپا عمل تھی۔ انھوں نے معمولی حالات سے ابھر کر غیر معمولی ترقی کی۔ اور بڑی عظمت وناموری حاصل کی۔ یہ سب کچھ ان کی ذاتی محنت، شوق، لگن، عظیم قوی ارادی اور اعلی درجے کی ذہانت وفطانت اور بصیرت وفراست کا نتیجہ تھا۔ ان میں خود اعتمادی بہت تھی۔ انھوں نے زندگی میں بہت سارے لوگوں کو سہارا دیا۔ حضرت خواجہ صاحب کی جوہر شناسی اور ساتھ ہی انسانی ہمدردی وخیر اندیشی کا یہ عالم تھا کہ بہت سارے لوگوں کی جودت طبع کو چمکایا، ابھارا اور سہارا دیا اور یہ لوگ خاک کمتری سے اٹھ کر اوج کہتری پر پہنچ گئے۔ خواجہ صاحب نے اپنی ذات کی خود تعمیر کی۔ یعنی خود ساختہ وپرداختہ تھے۔ وہ نہایت شیریں زبان تھے۔ ان کی ذات سے معاشرے کا ہر شخص مستفید ہوتا تھا اور اردو ادب کو بھی انھوں نے بڑا قیمتی سرمایہ عطا کیا۔

6.3 خواجہ حسن نظامی کی شخصیت

مصور فطرت شمس العلما خواجہ حسن نظامی کی پیدائش 27 دسمبر 1878 کو اندرون بستی حضرت نظام الدین اولیا، ان کے آبائی مکان، دہلی میں ہوئی تھی۔ یہ مکان آج بھی موجود ہے اور 'املی والا مکان' کہلاتا ہے۔ ان کا شجرہ حضرت علی مرتضیٰ سے ملتا ہے۔ ان کے والد کا نام سید عاشق علی نظامی اور والدہ کا نام سیدہ بیگم تھا۔ ان کی دو بہنیں ایک بھائی سید حسن علی شاہ تھے۔ بہنوں کا انتقال والدین کے سامنے ہو گیا جس کا شدید صدمہ والدہ کو لگا اور جلد ہی وہ بھی رحلت پا گئیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد والد سید عاشق علی نظامی بیمار ہوئے اور 1888 میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ خواجہ حسن نظامی کی کفالت ان کے بڑے بھائی حسن علی شاہ نے کی اور انھیں بہت ہی محبت وشفقت کے ساتھ پالا۔ ان کے اجداد پرتھوی راج چوہان کے زمانے میں بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے اور ان کا خاندان حضرت نظام الدین اولیا سے متعلق چار خاندانوں میں فریق اول نبیرگان کے نام سے معروف ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے پہلے قرآن مجید پڑھا۔ اس کے بعد فارسی کی کچھ ابتدائی کتابیں اور عربی صرف ونحو سیکھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم بستی حضرت نظام الدین اولیا میں حضرت مولانا اسمٰعیل کاندھلوی، حضرت مولانا محمد میاں کاندھلوی اور حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی صاحبان سے حاصل کی۔ انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی کے مدرسہ رشیدیہ گنگوہ سے فراغت حاصل کی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے ابتدائی تعلیم اپنے والدین سے حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ابتدائی درجوں سے لے کر اسلامیات میں بی۔اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد ایک جید عالم اور صاحب طرز ادیب تھے اور والدہ ایک باکمال خاتون تھیں، جس کا اثر ان کی زندگی پر بہت گہرا پڑا اور انھیں بچپن ہی سے ادبی، ثقافتی اور روحانی فضا میں زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ نتیجتاً انھیں بچپن ہی سے دہلی کی ادبی، تہذیبی، ثقافتی، روحانی، مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کی روایات سے ایسی محبت ہوئی کہ زندگی کی آخری سانس تک اس کے سچے امین رہے۔

اٹھارہ سال کی عمر میں ہی ان کی شادی سیدہ حبیب بانو سے ہوئی جو ان کے حقیقی چچا سید معشوق علی کی دختر نیک اختر تھیں۔ خواجہ حسن نظامی کا بچپن بہت تکلیفوں میں گزرا۔ ان کے والد جلد سازی کر کے اپنے گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ خود خواجہ صاحب نے درگاہ کے زائرین کے جوتوں کی حفاظت کر کے گھر والوں کی مدد کی۔ گزراوقات کے لئے خواجہ صاحب نے پھیری لگا کر کتابیں اور دہلی کی عمارتوں کے فوٹو بھی فروخت کئے۔

خواجہ صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ خواجہ حسن ثانی نظامی اپنے والد بزرگوار خواجہ حسن نظامی کا پرتو تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ خلقِ خدا کی علمی، دینی وروحانی خدمات میں گزارا۔ انھوں نے خود کو خدمت خلق میں اتنا محو کر دیا کہ اپنی ذاتی

زندگی بھی تنہائی میں گزاری۔انھوں نے جس سادہ روی کے ساتھ زندگی گزاری وہ ان کے معاصرین اورآنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا تعلق صوفی خاندان سے تھااس لئے انھوں نے بھی خاندانی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے خواجہ غلام فرید کے ہاتھ پر بیعت کی۔ان کے انتقال کے بعد حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی سے بیعت ہوئے۔وہ درگاہ سے وابستہ تھے مگر پیرزادگی انھیں پسند نہ تھی اس لئے معاش کی دوسری راہ نکالی۔اس کے بعد وہ صحافت سے وابستہ ہو گئے۔انھوں نے حلقہ ''نظام المشائخ'' قائم کیا جس کے تحت ''نظام المشائخ'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔اس کے علاوہ اپنے ایک دوست احسان الحق کے ہفتہ وار اخبار ''توحید'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔پھر اپنا رسالہ ''منادی'' بھی جاری کیا۔

خواجہ حسن نظامی کے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ان کے بارے میں دشمنوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ان کے خلاف اخبارات بھی شائع کئے گئے۔خواجہ حسن نظامی نے ان مخالفتوں کی پرواہ نہیں کی اور مسلسل محنت کرتے رہے۔اوراس محنت نے انہیں شہرت اور عظمت عطا کی۔انھوں نے اپنا ایک بھی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ ہمہ وقت کتابوں کی تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے۔ان کتابوں پر ہی ان کی آمدنی کا انحصار تھا۔کتابوں کے کاروبار سے حلال رزق کھاتے تھےاس لئے نذر ونیاز سے دوری بنائے رکھی تھی۔انھوں نے ایک دواخانہ بھی کھول رکھا تھا۔جس میں دوائیاں تیار کی جاتیں۔انھوں نے ایک سرمہ ''اردوسرمہ'' کے نام سے بھی بنایا تھا جس کا اشتہار اپنے رسالہ ''منادی'' میں دیتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ ''آج میں نے ایک سرمہ تیار کیا ہے۔اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس سرمہ کا نام ''اردوسرمہ'' اس لئے تجویز کیا ہے کہ اردو زبان بھی آنکھوں کو ایسا ہی روشن کرتی ہے۔

وہ دوسال ذیابطیس اور امراض قلب کی تکلیف میں شدت سے مبتلا رہے اور آخر میں دومہینہ سخت علیل رہنے کے بعد 31 جولائی 1955ء کو صبح سوا تین بجے اپنے گھر واقع بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں ہمیشہ کے لیے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور خواجہ ہال میں واقع ان کے والد خواجہ حسن نظامی کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔ان کے پسماندگان میں بھتیجے اور بھتیجیاں شامل ہیں۔انھوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شادی نہیں کی تھی۔ان کے انتقال سے دبستان دہلی کی قدیم روایت کا خاتمہ ہو گیا۔

6.4 خواجہ حسن نظامی کے ادبی کارنامے

خواجہ حسن نظامی اردو ادب کی تاریخ میں کئی حیثیتوں کے مالک ہیں۔روزنامچہ کو باقاعدہ ایک صنف کی حیثیت انھوں نے ہی دی۔قلمی چہروں کا سلسلہ بھی انھوں نے ہی شروع کیا۔بحیثیت صحافی ان کا نام بہت بلند ہے کہ ان کی سرپرستی اور ادارت میں سب سے زیادہ روزنامے، ہفتہ وار اخبار اور ماہانہ جرائد شائع ہوئے۔''نظام المشائخ''، ''روزنامہ رعیت''، ''ماہانہ دین دنیا''، ''منادی''، ''ماہنامہ آستانہ'' وغیرہ۔ان تمام اخبارات ورسائل سے خواجہ حسن نظامی کی کسی نہ کسی طور پر وابستگی رہی ہے۔

خواجہ حسن نظامی ایک مورخ بھی تھے۔۱۸۵۷ء کے انقلاب پر ان کی گہری نظر تھی۔انھوں نے اس ضمن میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ تاریخ کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔''بیگمات کے آنسو''، ''غدر کے اخبار''، ''غدر کے فرمان''، ''بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ''، ''غدر کی صبح وشام'' اور ''محاصرہ دہلی کے خطوط'' ان کی نہایت اہم کتابیں ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے ہر موضوع پر لکھا، شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر ان کی کوئی تحریر نہ ملے۔انھوں نے آپ بیتی اور سفرنامے بھی لکھے۔''سفرنامہ حجاز مصر وشام''، ''سفرنامہ ہندوستان'' اور ''سفرنامہ پاکستان''، قابل ذکر کتابیں ہیں۔''گاندھی نامہ'' اور ''یزید نامہ'' بھی ان کی

اہم کتابوں میں شامل ہیں۔خواجہ حسن نظامی نے انشائیے بھی لکھے۔''جھینگر کا جنازہ''،'' گلاب تمہارا کیکر ہمارا''،'' مرغ کی اذان''،''مچھر''، ''مکھی''اور''الو''ان کے مشہور انشائیے ہیں۔خواجہ حسن نظامی کا اسلوب سب سے الگ تھا۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ وہ اپنے اسلوب کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔

خواجہ حسن ثانی نظامی ایک عظیم اہل قلم تھے۔انھوں نے اپنی کتاب 'تصوف'، رسم اور حقیقت میں جس خوبی سے تصوف کے متعلق بحث کی ہے اس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔انھوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کے مجموعے''فوائدالفواد'' کا جیسا ترجمہ کیا، یہ کسی عام آدمی کا کام نہیں، اس لیے کہ جو تصوف میں ڈوبا ہوا ہو وہی اس کی ترجمانی ایک زبان سے دوسری زبان میں کرسکتا ہے۔فوائدالفواد کا ترجمہ پہلی بار انھوں نے کیا تب ان کی عمر محض اکیس سال تھی۔اس کے بعد انھوں نے اس پر نظر ثانی کی اور تصحیح متن کا پر بھی بہت محنت صرف کی۔

6.5 خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری

خواجہ حسن نظامی اپنے دور کے انشائیہ نگاروں اور طنز ومزاح نگاروں میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ان کی نثر میں سادگی اور پُرکاری کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ان کے مضامین میں ظرافت کا رنگ غالب ہے اور ان کی تخلیقات میں الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔خواجہ حسن نظامی نے جہاں کہیں بھی غور وفکر سے کام لیا ہے وہاں ان کی ظرافت میں ایک خاص شان اور انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔خواجہ حسن نظامی ایک ایسے طنز ومزاح نگار ہیں جن کے مضامین کے ذریعہ زندگی کو ایک متصوفانہ روّیے سے دیکھنے کی قابل ستائش کوشش ملتی ہے۔وہ ایک صوفی بزرگ تھے، لہٰذا انھوں نے زندگی کے ہر گوشے میں صوفیانہ نقطۂ نظر سے سامان زیست ڈھونڈنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی ایک سو سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ان کی ذہنی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع اور متنوع تھا۔اردو ادب کے بہت کم ادیبوں کا قلم اتنا زرخیز تھا جتنا کہ خواجہ حسن نظامی کا تھا۔ان کے مجموعے''مضامین حسن نظامی'' اور''سی پارۂ دل'' کے مضامین اپنے اختصار، غیر رسمی انداز، پرلطف اسلوب کی بنا پر طنز ومزاح کی بہت اچھی مثالیں قرار پاتے ہیں۔خواجہ حسن نظامی کا مشاہدہ کافی وسیع اور عمیق تھا۔ان کے پاس علمی بصیرت تھی۔وہ بات بات میں وحدت کی طرف اشارہ کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔جن چیزوں کی جانب لوگوں کی توجہ نہیں جاتی تھی ان میں خواجہ حسن نظامی کی دور رس نگاہیں راستہ تلاش کر لیتی تھیں۔خواجہ حسن نظامی کا مشاہدہ اور تجربہ کافی وسیع تھا اور ان کی صلاحیتوں کا اعتراف سید حامد نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''خواجہ حسن نظامی کے آثار کی مقبولیت، دلبرائی اور توانائی کا ایک بڑا راز ان کا مشاہدہ اور ارضیت ہے۔جس صوفیٔ صافی کا فلک سیر تخیل عرش کی خبر لاتا تھا وہ خود زمین پر پیر گاڑے ہوئے کھڑا تھا۔اس کی ایک آنکھ ارض پر تھی اور دوسری عرش پر۔چنانچہ مضمون کتنا ہی متصوفانہ یا بعد الطبیعاتی ہو وہ اس کا رشتہ ارض تشبیہات اور عام انسان کے مشاہدات اور تجربات سے جوڑتا تھا۔اس لیے جو بات وہ کہتا تھا، دلنشین ہوجاتی تھی۔''

(نگارخانۂ رقصاں: سید حامد، تاج کمپنی دہلی، 1984، ص:340)

6.5.1 ''سی پارۂ دل'' کا تعارف

''سی پارۂ دل'' خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1916ء میں شائع ہوئی۔اس کے دو حصے ہیں۔اس

کتاب کے پہلے حصے میں مضامین کو پانچ منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلی منزل 'عہد ومعبود کے راز و نیاز'' کے نام سے موجود ہے جس کے تحت 16 مضامین ہیں۔دوسری منزل ''ذوق وشوق،عشق ومحبت،سوز وگداز،ارادت وعقیدت'' کےعنوان سے ہے جس کے تحت 20 مضامین شامل ہیں۔تیسری منزل ''سر دلبراں ورحدیث دیگراں'' کےعنوان سے ہیں جس کے تحت 51 مضامین شامل ہیں۔چوتھی منزل ''دین وملت'' کے عنوان سے ہے جس کے تحت 19 مضامین شامل ہیں۔پانچویں منزل ''سیاست، معاشرت، تمدن'' کےعنوان سے ہے جس میں 14 مضامین شامل ہیں۔اس کے بعد ''شذرات'' کےعنوان سے 13 مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

6.5.2 ''سی پارۂ دل'' کا تفصیلی مطالعہ

خواجہ حسن نظامی کا شمار اردو کے صاحب طرز انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔شگفتگی اور دلکشی ان کے اسلوب کا خاصہ ہے۔زندگی کے ہر پہلو پر انھوں نے بہت ہی بے تکلفی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔انھوں نے اپنے مضامین اور انشائیوں میں ہر طرح کے موضوع کو جگہ دی ہے۔زبان و بیان پر انھیں ایسی قدرت حاصل ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ باتیں کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔اکثر بات میں بات پیدا کرنے کے لئے اپنی بات کو لمبا کھینچتے ہیں۔ان کے متعلق مولوی عبدالحق رقم طراز ہیں:

> ''ان مضامین میں خواجہ صاحب کسی سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔کہیں وہ اپنے سے ہم کلام ہیں، کہیں راز و نیاز ہے، کہیں دردِ دل کی داستان ہے اور اپنا اور ہمارا دُکھڑا رو رہے ہیں۔کہیں تخیل کا زور عرش تک لے گیا، کہیں نثر میں وہ شاعری کی شان دکھائی کہ نظم مقفیٰ ہیچ ہے۔''

(مولوی عبدالحق۔مقدمہ سی پارۂ دل۔خواجہ اولاد کتاب گھر، نئی دہلی۔۱۹۶۵ء۔ص:۹۔۱۰)

اردو انشائیہ کی تاریخ میں خواجہ حسن نظامی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے انشائیہ اور طنز ومزاح کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔فنی نقطۂ نظر سے انشائیہ میں جتنی خصوصیات ہو سکتی ہیں وہ سبھی ان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔انشائیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف کی ذات کا انکشاف بھی ہوتا ہے اور جب خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں ہلکے پھلکے انداز میں انکشاف ذات کا فن پایا جاتا ہے۔وہ الفاظ کے استعمال میں کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں۔کم الفاظ میں بہت کچھ کہنے کا فن انھیں خوب آتا تھا۔ان کے مضامین آسان اور سادہ زبان میں ہوتے ہیں اور کبھی مشکل تراکیب کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ادنیٰ سے ادنیٰ باتوں پر ان کی نگاہ رہتی ہے اور وہ ہر چیز کا عمیق مشاہدہ رکھتے ہیں جس میں سمندر جیسی گہرائی بھی موجود ہے۔ان کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے موضوعات میں جدت پائی جاتی ہے۔اپنے مضامین اور اپنے انشائیوں میں اصلاح آدمیت کے لئے کوئی نہ کوئی سبق ضرور دیتے ہیں۔''لالٹین''، ''دیا سلائی''، ''اُلو''، ''مکھی''، ''آنسو کی سرگزشت''، ''الف خان''، ''جھینگر کا جنازہ''، ''گلاب تمہارا کیکر ہمارا'' وغیرہ بہت ہی معمولی اور بظاہر بہت ہی غیر اہم موضوعات ہیں جن کو انھوں نے اس طرح اپنے انشائیوں میں جگہ دی ہے کہ ان کی تمام جزئیات نکل کر سامنے آجاتی ہیں۔ان موضوعات پر انھوں نے ایسے ایسے گوشے تلاشے ہیں جن کی جانب عام طور سے نگاہ یا توجہ نہیں جاتی۔جب ان کا بغور مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان انشائیوں کے موضوعات کی گہرائی کا اندازہ اسی وقت ہوتا ہے۔ان کو پڑھنے کے بعد قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے ان انشائیوں میں فکر وخیال اور جذبہ و بیان کے کیسے کیسے پہلو تلاشے ہیں کہ اس کی تعریف کئے بغیر دل نہیں مان سکتا۔یہ انشائیے اور مضامین اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی چیز بے کار، کمتر اور معمولی نہیں ہے بلکہ قدرت نے ہر شئے میں کوئی نہ کوئی بات

پوشیدہ رکھی ہے۔لامعنی اور معمولی معمولی باتوں میں مطلب کی بات نکالنا اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں گوہر نایاب تلاش کرنا خواجہ حسن نظامی کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔

اپنے انشائیوں میں روزمرہ کے بظاہر ان غیر اہم اور بے معنی چیزوں کو خواجہ حسن نظامی نے بہت ہی غور سے اور قریب سے مشاہدہ کیا۔ ان کے اسی مشاہدے کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کو کمال فن تک پہنچا دیا۔انشائیہ نگار کے بارے میں کہا گیا کہ وہ عام روش سے ہٹ کر ایک انوکھے زاویے سے اشیاء کو دیکھتا اور پرکھتا ہے اور منفی کو مثبت اور مثبت کو منفی بنا کر غیر دلچسپ باتوں میں قاری کے لیے کشش کا سامان مہیا کرتا ہے۔جب ہم خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہی خصوصیات ان کی نگارشات میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔انھوں نے اپنے انشائیوں میں قاری کے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کیا ہے۔وہ ادب میں ادب برائے زندگی کے نظریے کے قائل تھے اور یہی وجہ ہے کہ اپنے منفرد طرز استدلال سے انشائیہ کو زندگی کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔انشائیہ لکھنے کا مقصد خواجہ حسن نظامی خود فرماتے ہیں:

> ’’میں نے جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے وہ محض اس لیے ہے کہ نئی روشنی کے لوگ جو صوفیوں کی پرانی کتابوں کو نہیں پڑھتے یا ان کتابوں کے قدیمی طرز تحریر کے سبب تصوف ہی سے غیر مانوس ہوتے جاتے ہیں، وہ میرے نئے انداز تحریر سے ادھر راغب ہوں اور کیف روحانی سے فائدہ اُٹھائیں۔‘‘
>
> (خواجہ حسن نظامی۔سی پارۂ دل۔خواجہ اولاد کتاب گھر، نئی دہلی۔۱۹۶۵ء۔ص:۱۸)

خواجہ حسن نظامی نے اپنے انشائیوں اور اپنے مضامین کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن پر لوگ توجہ نہیں دیتے ہیں اور نہ ہی انھیں کسی زمرے میں رکھا جاتا ہے۔یعنی ایسے موضوعات جن کو بیکار سمجھا جاتا ہے جیسے ’’اُلو‘‘۔خواجہ حسن نظامی نے ناپسندیدگی کے عمومی روّیہ کے برعکس اُلو کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’جن کو سب لوگ بھول گئے جن کو سب نے چھوڑ دیا ان کو الو نے نہیں بھُلایا اور ساتھ نہیں چھوڑا۔اُلو کی آواز کو منحوس ناحق کہتے ہیں، ذرا دھیان سے سنو اللہ ہو صاف سمجھ میں آئے گا۔بعض دفعہ ہو ہو کہتا ہے اور بعض اوقات پورا اللہ ہو پکارتا ہے۔بنگالی مینا، پیراہن طوطا اور یہ ننھی منھی خوبصورت چڑیاں میٹھی میٹھی بولیوں سے آپ کا جی خوش کرتی ہیں مگر یہ اُلو اپنے نعرۂ حق سے آپ کے دل کو بڑا دیتا ہے۔اس لئے آپ اسے منحوس کہتے ہیں۔نہیں ایسا خیال نہ کرو یہ خوش نوا پرندے دل کو یاد حق سے ہٹا کر مکافات دنیا میں مصروف کرتے ہیں اور اُلو کی جگہ خراش فریاد انجام حیات کو یاد دلاتی ہے۔‘‘
>
> (خواجہ حسن نظامی۔مضمون ’’الو‘‘ مشمولہ سی پارۂ دل۔خواجہ اولاد کتاب گھر، نئی دہلی۔۱۹۶۵ء۔ص:۱۹۰)

خواجہ حسن نظامی کی زندگی تصوف کے نقش و نگار سے آراستہ تھی۔ناقدوں میں اس بات پر اتفاق ہے کہ انشائیہ میں انشائیہ نگار کی شخصیت کا اظہار پایا جاتا ہے۔اس نقطۂ نظر سے خواجہ حسن نظامی کے انشایئے انشائیہ نگاری کے فن پر کھرے اترتے ہیں۔ان کی شخصیت میں تصوف کا رنگ غالب تھا اور یہی رنگ اُن کے انشائیوں میں بھی صاف نظر آتا ہے۔خواجہ حسن نظامی کے تقریباً تمام انشائیوں کا اختتام تصوف کے

کسی پہلو پر ہوتا ہے۔ وہ عصر حاضرہ کی زندگی کے تقاضوں کے مطابق وہی زبان، محاورہ، اسلوب اور انداز اختیار کرتے ہیں جس کے ذریعہ ان کے خیالات کی رسائی دوسروں تک با آسانی ہو سکے۔ اپنے انشائیوں میں وہ گہرے مشاہدے کی بنا پر زندگی کی غواصی کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنے انشائیہ ''جھینگر کا جنازہ'' میں حرکت و عمل سے بے نیاز عالموں پر اس طرح طنز کرتے نظر آتے ہیں:

> ''اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔ ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحاتِ مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر! تو یہاں کیوں آیا؟ اُچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ! تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصّہ ہے۔ بولا واہ! قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بوجھ اُٹھانے والے گدھے ہیں جس پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہے۔ مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی مثال پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔ یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔''

(خواجہ حسن نظامی۔ مضمون ''جھینگر کا جنازہ'' مشمولہ سی پارۂ دل۔ خواجہ اولاد کتاب گھر، نئی دہلی۔ ۱۹۶۵ء۔ ص:۲۹۹)

انشائیہ نگاری کے متعلق میں کہا جاتا ہے کہ انشائیہ نگار اس جگہ بھی معنی تلاش کر لیتا ہے جہاں کوئی معنی موجود نہیں اور وہ اپنی نگاہ کے انوکھے زاویے سے غیر اہم چیزوں کو اہم بنا کر پیش کرتا ہے اور فکر کی جدت سے ان میں وہ معنویت تلاش کر دیتا ہے جس کی طرف اسے پہلے کسی کا ذہن نہ گیا ہو اور اسی ندرت سے انشائیہ میں لطف پیدا ہوتا ہے۔ اس معیار سے اگر خواجہ حسن نظامی کے اس انشائیہ ''جھینگر کا جنازہ'' کا مطالعہ کیا جائے تو یہ خود ان کے ہی نہیں بلکہ اردو کے چند بہترین انشائیوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ موضوع کے پابند رہنے کے باوجود موضوع سے الگ عصری تقاضوں کے مطابق بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے انشائیوں میں ایسا اسلوب اور ایسا طرز انداز اپنایا ہے کہ اپنے مقصد کی ترسیل میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی ادبی حسن بھی برقرار رہتا ہے۔ کہیں کہیں ان کے انشائیوں میں ان کا لہجہ چبھتا بھی ہے لیکن ان کا مقصد قاری کے دل کو ٹھیس پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ ان کے لئے کوئی سبق اور نصیحت کی تلقین ہوتی ہے۔ ''گلاب تمہارا کیکر ہمارا'' خواجہ حسن نظامی کا ایک دلچسپ انشائیہ ہے جس میں ان کے اسلوب بیان اور طرز بیان کی انفرادیت صاف طور پر نظر آتی ہے۔ گلاب اور کیکر میں بظاہر تقابل کا کوئی پہلو موجود نہیں ہے لیکن پھر بھی خواجہ حسن نظامی ان دونوں میں مماثلتوں اور اختلافات کے چند ایسے پہلو تلاش کر کے سامنے لائے ہیں کہ وہ گلاب جو پھولوں میں سب سے زیادہ خوبصورت پھول مانا جاتا ہے اور جسے حسن و رعنائی کا پیکر تصور کیا جاتا ہے، اچانک لوگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے اور گلاب کے

مقابلے میں خواجہ حسن نظامی کیکر کی فضیلت اور برتری ثابت کرتے ہیں۔عہد حاضر کا انسان چیزوں کو خود جانچنے اور پرکھنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ دوسروں کی تقلید کرتے ہوئے ان کے خیالات کو آنکھ بند کرکے تسلیم کر لیتا ہے۔انسان دوسروں کی ہر بات دل سے تسلیم کرنے کا عادی بن چکا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر انسان کا دل کشمکش میں پڑا رہتا ہے۔لوگوں کے دل میں کسی بھی چیز کو لے کر منفی سوچ بیٹھ جاتی ہے۔کسی شخص کو کوئی چیز پسند آئی تو دوسرا شخص بھی اس چیز کی تعریف کرنے لگتا ہے۔کوئی آدمی کسی چیز کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہے تو دوسرا شخص بھی اُس کی حقیقت جانے بغیر اس کو غلط تسلیم کر لیتا ہے۔خواجہ حسن نظامی نے اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو خود چیزوں کی اہمیت اور ان کی افادیت کے بارے میں غور کرنا چاہیے۔یہ انشائیہ ان کے تخلیقی ذہن کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔اس میں خواجہ حسن نظامی نے اپنے طرز بیان اور طرز ادا سے قاری کو غور وفکر کی دعوت دی ہے۔موضوع کے نئے گوشوں کو تلاش کرنا خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کا خاصہ ہے۔انشائیہ ’’گلاب ہمارا کیکر تمہارا‘‘ کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ’’ان سب شاعروں کو سامنے سے ہٹاؤ جو گلاب کے پھولوں پر مرتے ہیں۔ سینکڑوں برس سے ایک ہی چہرے کے طلب گار ہیں، یہ سب لکیر کے فقیر ہیں، مقلد ہیں، سُنی سنائی باتوں پر جان دیتے ہیں۔۔۔سب نے گلاب کے پھول کو تختۂ مشق بنایا ہے۔کوئی اس کی بھینی بھینی بُو پر فدا ہے، کوئی اس کی نازک نازک پتیوں پر نثار ہیں۔کسی کو اس کے رنگ سے رخسارِ محبوب کی یاد پیدا ہوتی ہے۔۔۔بعض ہیں کہ گلاب کے خار سے خار کھائے بیٹھے ہیں۔ خیر یہ جتنی باتیں ہیں، ان میں تو شکایت کا موقع نہیں ہے۔کہنا یہ ہے کہ انھوں نے خدا کی بے شمار مخلوقات کی حق تلفی کی ہے۔ایک ہی دروازے پر ڈیرے ڈال دیئے۔۔۔نصیب یہ نہ ہوا کہ جنگل میں نکل جاتے، خودرو پھولوں کو دیکھتے جن کا مالی خدا ہے، جن کا چمن صحرا ہے جس کی سیرابی قدرتی سیلابی سے ہے۔ان میں ایک کیکر تھا۔‘‘

(خواجہ حسن نظامی۔مضمون ’’گلاب تمھارا کیکر ہمارا‘‘ مشمولہ سی پارۂ دل۔خواجہ اولاد کتاب گھر، نئی دہلی۔۱۹۶۵ء۔ص:۲۰۷)

اپنے انشائیوں میں خواجہ حسن نظامی ہلکے پھلکے اور غیر رسمی انداز میں اپنی باتوں کی ترسیل کرتے ہیں جن کو پڑھ کر قاری کا ذہن منطقی استدال اور فلسفیانہ تفکر کے بغیر اس مقصد کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جہاں انشائیہ نگار کا قلم اس کو پہنچانا چاہتا ہے۔ان انشائیوں میں دلچسپی اور کشش کا اتنا سامان میسر ہے کہ قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ مصنف ان کو کسی خوبصورت جگہ کی سیر کرا رہا ہے اور وہ اس کے ساتھ ایسی وادیوں میں گھوم رہے جہاں ہر شئے سامنے تو موجود ہے لیکن بہت سارے ایسے پہلوؤں پر نظر نہیں گئی تھی جن کی جانب مصنف متوجہ کراتا ہے۔انھیں ان دیکھے پہلوؤں سے قاری لطف اندوز ہوتا نظر آتا ہے۔ان انشائیوں میں نہ صرف لطف وانبساط کا سامان میسر ہے بلکہ ان میں انسانیت کے لیے ایک پیام بھی ہے جو دلوں کی گرہوں کو کھولتا ہے اور غور وفکر کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں اور مضامین کے مطالعے سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ان انشائیوں اور مضامین میں ان کا طنزیہ ومزاحیہ اسلوب بیان قاری کو لطف وانبساط کا سامان مہیا کرتا ہے۔خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں طنز ومزاح کے اوصاف تو موجود ہیں

لیکن اس میں عامیانہ پن نہیں ہے بلکہ ان میں شگفتگی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ محض ہنسانے کے لئے انشائیہ اور مضامین تخلیق نہیں کرتے اور نہ کسی کی خامیوں کو براہ راست اپنی طنز کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ وہ ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں کہ قاری کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے اور طنز کی ہلکی سی چوٹ اُن کے اندر سوچنے اور سمجھنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ شخصی زاویۂ نگاہ اور موضوع کو الٹنے پلٹنے کا رویہ بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ چنانچہ اپنے منفرد اسلوب بیان کی بنا پر خواجہ حسن نظامی اردو ادب میں اپنی الگ اہمیت اور اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں جو ان کے علاوہ بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوئی ہے۔ اپنے دلکش اور پُرکشش اسلوب اور طرز ادا سے اردو انشائیہ کی دنیا میں وہ ہمیشہ یاد رکئے جائیں گے۔

6.5.3 ''سی پارۂ دل'' کا اسلوب

اردو ادب میں نثری ادب کا سلسلہ بہت قدیم زمانے سے قائم ہے۔ حالانکہ ادب میں نثر کی بنسبت نظم کو فوقیت دی جاتی ہے لیکن اردو ادب میں نثر کے ایسے نمونے موجود ہیں جن کو شاعری کے برابر لاکر کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ شعر اور نثر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ شعر تخلیقی اظہار ہے اور نثر تعمیری اظہار۔ شاعری قدیم دور سے ہی ادب کا حصہ رہی لیکن جب نثر کی ایجاد ہوئی تو وہ پہلے شاعری کے سہارے چلی بعد میں اس نے اپنی جگہ خود بنالی۔ اردو ادب میں یوں تو ملا وجہی کی کتاب ''سب رس'' کو اردو نثر کی ابتدا کے طور پر جانا جاتا ہے لیکن جب میر امن نے داستان ''باغ و بہار'' میں سادہ نثر کے جوہر دکھائے تو وہیں سے اردو نثر کا باقاعدہ آغاز مانا جانے لگا۔ اس کے بعد خطوط غالب، سرسید کے مضامین، رسالے، انشائیے وغیرہ نے اردو نثر کو فروغ دیا۔ اس کے بعد داستانوں کی جگہ ناول نے لے لی۔ اس طرح اردو نثر مسلسل فروغ پاتی رہی۔ سرسید کے دور سے باقاعدہ انشائیہ نگاری کی ابتدا ہوتی ہے اور آگے چل کر بہت سارے مصنفین اس صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کا اسلوب نثر بنیادی طور پر میر امن کی روایت سے ملتا ہے۔ ان کے یہاں مولانا محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر اور اکبر الہ آبادی کے اثرات ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کے اثرات ان کی تمثیل اور تجسیم میں نظر آتے ہیں۔ شرر کے عاشقانہ اور شاعرانہ مضامین سے خواجہ حسن نظامی نے فضا بندی سیکھی ہے۔ اکبر الہ آبادی کی شوخی اور بذلہ سنجی ان کے یہاں جا بجا نظر آتی ہے لیکن ان کی نثر کی ساخت میر امن اور غالب کی یاد دلاتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے ''سی پارۂ دل'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

> ''ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میں اچھی اردو سیکھنا چاہتا ہوں، کیا پڑھوں؟ میں نے کہا ''اگر تم صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو اور دلی کی اصل زبان پڑھنا اور سیکھنا چاہتے ہو تو خواجہ حسن نظامی صاحب کی تحریر پڑھو کہ زبان کے مزے کے ساتھ دلی کیفیات اور جذبات کا لطف بھی آئے گا۔''

(مولوی عبدالحق۔ مقدمہ سی پارۂ دل از خواجہ حسن نظامی۔ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء، نئی دہلی ۲۰۰۴ء۔ ص:۱۱)

''سی پارۂ دل'' کے متعدد مضامین یا تو یا تو اخلاقی ہیں یا متصوفانہ۔ ''آنسو''، ''مٹی کا تیل''، ''دیا سلائی''، ''من کہ دھوبی''، ''جھینگر کا جنازہ''، ''آیار چل کے دیکھیں برسات کا تماشہ'' اور ''سیم لا'' جیسے مضامین حکمت اور معرفت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان مضامین میں زبان کی چاشنی، ہندوستان کی خوشبو یہاں کے موسموں، تہواروں، فضا اور ادبی حسن سبھی کچھ موجود ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین میں ہندو مذہب اور اس کے فلسفے کو بھی بہت مفصل انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں رام چندر جی اور کرشن جی کی دینی تعلیمات کو اردو میں پیش کیا ہے۔ ان کے اسلوب کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

''کل چاندنی لرزلرز کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر چل رہی تھی اور میں ہنستا تھا جب وہ پھسل کر غاروں میں لڑھک جاتی تھی۔ غار گود کھولے بنت القمر کی یاد میں بے تاب نظر آتے تھے اور جب اس تابانی کو پاتے تھے تو اپنے اندر کی سب مخفی حالتوں کو نمایاں کر دیتے تھے یعنی روشنی کی چمک میں اپنے اندر کی چیز ظاہر کر دیتے تھے۔''

(خواجہ حسن نظامی۔ مضمون ''سیم لا'' مشمولہ سی پارۂ دل۔ خواجہ اولاد کتاب گھر، نئی دہلی۔ ۱۹۶۵ء۔ ص: ۳۱۰۔۳۱۱)

''اے خاک نشیں تیل ہم کو تیری یہ ادا بھاتی ہے کہ جہاں آگ قریب آئی تو مشتعل ہوا۔ خدا کی قدرت ہے کہ تجھ میں یہ صلاحیت ہے کہ تو آن کی آن میں شعلہ بن کر مقبول ہو جاتا ہے اور انسان کی یہ قسمت کہ برسوں ٹکریں مارتا ہے پہاڑوں، دریاؤں میں سرگرداں پھرتا ہے مگر وہ بجلی نصیب نہیں ہوتی جو وجود خاکی کو جلا کر فنا کر دے۔''

(خواجہ حسن نظامی۔ مضمون ''مٹی کا تیل'' مشمولہ سی پارۂ دل۔ خواجہ اولاد کتاب گھر، نئی دہلی۔ ۱۹۶۵ء۔ ص: ۱۵۴۔۱۵۵)

''اے پروفیسر، اے فلاسفر، اے متوکل درویش، اے نغمہ رہائی گانے والے اقوال! ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا رزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اب چیونٹی کے پیٹ کی قبر میں دفن ہو جا۔ مگر ہم ہمیشہ رزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔''

(خواجہ حسن نظامی۔ مضمون ''جھینگر کا جنازہ'' مشمولہ سی پارۂ دل۔ خواجہ اولاد کتاب گھر، نئی دہلی۔ ۱۹۶۵ء۔ ص: ۳۰۱۔۳۰۲)

''قسم ہے گھونگھر والے بالوں کے بادلوں کے پیچ وخم کی۔ وہ مسلمان کے پیچیدہ احوال سے زیادہ نہیں ہیں۔ قسم ہے کوندنے والی بجلی کی، مسلمانوں کی بیقراری سے بہت بڑھ گئی ہے۔''

(خواجہ حسن نظامی۔ مضمون ''آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا'' مشمولہ سی پارۂ دل۔ خواجہ اولاد کتاب گھر، نئی دہلی۔ ۱۹۶۵ء۔ ص: ۱۱۰)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب کی نثر میں سادگی اور پرکاری موجود ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی بات کو کہتے ہیں اور دلی کی خاص ٹکسالی زبان کا استعمال کرتے ہیں جس میں نرمی کے ساتھ شیرینی بھی ہے۔ خواجہ صاحب کا تخیل معمولی سے معمولی اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیزوں میں کوئی نہ کوئی عظمت، معنویت یا حسن تلاش کر لیتا ہے اور ہمارے سامنے اس کے مختلف رنگوں، بہاروں اور جلوؤں کا نگارخانہ آباد کر دیتا ہے۔ ان کی جزئیات نگاری کی خاصیت یہ ہے کہ رات کا ذکر ہو یا دن کا، امیروں کے محلات ہوں یا غریب کا گھر، باغ کی بہار ہو یا پت جھڑ کا موسم سبھی طرح کی تصویروں میں ایسا رنگ بھرتے ہیں کہ جس پر وقت کی گرد نہیں پڑ سکتی۔ ان کی سادہ اور سلیس نثر پر گہرائی سے غور کیا جائے تو اس میں شعریت بھی ہے اور معنویت بھی۔ اس کی بنیاد سادگی اور سلاست پر ہے لیکن اس کی چاشنی سے کوئی منکر نہیں ہو

سکتا۔خواجہ صاحب نہ صرف اپنے تخیل بلکہ اپنی زبان کے حوالے سے بھی ہمیشہ جانے جائیں گے۔

6.6 آپ نے کیا سیکھا

آپ نے خواجہ حسن نظامی کی شخصیت کے بارے میں جانا۔

آپ نے خواجہ حسن نظامی کے ادبی کارناموں سے واقفیت حاصل کی۔

آپ نے خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری کے اوصاف جانے۔

آپ نے ''سی پارۂ دل'' کا تفصیلی جائزہ لیا۔

آپ نے ''سی پارۂ دل'' کے اسلوب کے متعلق جانا۔

6.7 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔''سی پارۂ د؛ل'' کا تعارف پیش کیجئے۔

2۔خواجہ حسن نظامی کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

3۔خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری پر مضمون لکھئے۔

4۔''سی پارۂ دل'' کے کسی ایک مضمون کا خلاصہ لکھئے۔

5۔خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری پر ''سی پارۂ دل'' کے خصوصی حوالے سے روشنی ڈالیے۔

6.8 سوالات کے جواب

جواب 1: ''سی پارۂ دل'' خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1916ء میں شائع ہوئی۔اس کے دو حصے ہیں۔اس کتاب کے پہلے حصے میں مضامین کو پانچ منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلی منزل 'عہد و معبود کے راز و نیاز'' کے نام سے موجود ہے جس کے تحت 16 مضامین ہیں۔ دوسری منزل ''ذوق وشوق، عشق ومحبت، سوز وگداز، ارادت وعقیدت'' کے عنوان سے ہے جس کے تحت 20 مضامین شامل ہیں۔تیسری منزل ''سر دلبراں در حدیث دیگراں'' کے عنوان سے ہیں جس کے تحت 51 مضامین شامل ہیں۔ چوتھی منزل ''دین و ملت'' کے عنوان سے ہے جس کے تحت 19 مضامین شامل ہیں۔ پانچویں منزل ''سیاست، معاشرت، تمدن'' کے عنوان سے ہے جس میں 14 مضامین شامل ہیں۔اس کے بعد ''شذرات'' کے عنوان سے 13 مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

جواب 2: خواجہ حسن نظامی اردو ادب کی تاریخ میں کئی حیثیتوں کے مالک ہیں۔روزنامچہ کو باقاعدہ ایک صنف کی حیثیت انھوں نے ہی دی۔قلمی چہروں کا سلسلہ بھی انھوں نے ہی شروع کیا۔بحیثیت صحافی ان کا نام بہت بلند ہے کہ ان کی سرپرستی اور ادارت میں سب سے زیادہ روزنامے، ہفتہ وار اخبار اور ماہانہ جرائد شائع ہوئے۔''نظام المشائخ''، ''روزنامہ رعیت''، ''ماہانہ دین دنیا''، ''منادی''، ''ماہنامہ آستانہ''وغیرہ۔ان تمام اخبارات ورسائل سے خواجہ حسن نظامی کی کسی نہ کسی طور پر وابستگی رہی ہے۔

خواجہ حسن نظامی ایک مورخ بھی تھے۔۱۸۵۷ء کے انقلاب پر ان کی گہری نظر تھی۔انھوں نے اس ضمن میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ تاریخ کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔''بیگمات کے آنسو''، ''غدر کے اخبار''، ''غدر کے فرمان''، ''بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ''، ''غدر کی صبح و شام' اور ''محاصرہ دہلی کے خطوط'' ان کی نہایت اہم کتابیں ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے ہر موضوع پر لکھا، شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر ان کی کوئی تحریر نہ ملے۔ انھوں نے آپ بیتی اور سفر نامے بھی لکھے۔ ''سفر نامہ حجاز مصر و شام''، ''سفر نامہ ہندوستان'' اور ''سفر نامہ پاکستان''، قابل ذکر کتابیں ہیں۔ ''گاندھی نامہ'' اور ''یزید نامہ'' بھی ان کی اہم کتابوں میں شامل ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے انشائیے بھی لکھے۔ ''جھینگر کا جنازہ''، ''گلاب تمہارا کیکر ہمارا''، ''مرغ کی اذان''، ''مچھر''، ''مکھی'' اور ''الّو'' ان کے مشہور انشائیے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا اسلوب سب سے الگ تھا۔ وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ وہ اپنے اسلوب کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔

جواب 3: خواجہ حسن نظامی اپنے دور کے انشائیہ نگاروں اور طنز و مزاح نگاروں میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کی نثر میں سادگی اور پُرکاری کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے مضامین میں ظرافت کا رنگ غالب ہے اور ان کی تخلیقات میں الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے جہاں کہیں بھی غور و فکر سے کام لیا ہے وہاں ان کی ظرافت میں ایک خاص شان اور انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ خواجہ حسن نظامی ایک ایسے طنز و مزاح نگار ہیں جن کے مضامین کے ذریعہ زندگی کو ایک متصوفانہ روّیے سے دیکھنے کی قابل ستائش کوشش ملتی ہے۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے، لہٰذا انھوں نے زندگی کے ہر گوشے میں صوفیانہ نقطۂ نظر سے سامان زیست ڈھونڈنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی ایک سو سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ ان کی ذہنی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع اور متنوع تھا۔ اردو ادب کے بہت کم ادیبوں کا قلم اتنا زرخیز تھا جتنا کہ خواجہ حسن نظامی کا تھا۔ ان کے مجموعے ''مضامین حسن نظامی'' اور ''سی پارۂ دل'' کے مضامین اپنے اختصار، غیر رسمی انداز، پرلطف اسلوب کی بنا پر طنز و مزاح کی بہت اچھی مثالیں قرار پاتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا مشاہدہ کافی وسیع اور عمیق تھا۔ ان کے پاس علمی بصیرت تھی۔ وہ بات بات میں وحدت کی طرف اشارہ کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ جن چیزوں کی جانب لوگوں کی توجہ نہیں جاتی تھی ان میں خواجہ حسن نظامی کی دور رس نگاہیں راستہ تلاش کر لیتی تھیں۔

6.9 فرہنگ

الفاظ	معنی
فریق اول	وہ شخص یا گروہ جس نے دعوہ کیا ہو، مدعی
نبیرگان	نواسے یا پوتے
فطانت	عقلمندی، دانائی
بصیرت	آگاہی، عقل و فہم
فراست	بات کو جلدی سمجھنے کی صلاحیت
خیر اندیشی	خیر خواہی، بھلائی
کہتری	چھوٹا پن
اوج	بلندی، اونچائی
پرداختہ	پرورش کیا ہوا
خودساختہ	خود بنایا ہوا
تمثیل	مثال، نظیر

تجسیم	صاحب جسم
بذلہ سنجی	لطیفہ گوئی، خوش طبعی

6.10 کتب برائے مطالعہ

1۔ خواجہ حسن نظامی: حیات اور کارنامے، مرتبہ خواجہ حسن ثانی نظامہ، اردو اکیڈمی، دہلی، 1978ء

2۔ خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات، مرتبہ نثار احمد فاروقی، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، دہلی، 2011ء

3۔ خواجہ حسن نظامی، سی پارۂ دل، حصہ اول، خواجہ اولاد کتاب گھر، دہلی، 1965ء

4۔ محمد اسد اللہ، انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں، 2015ء

5۔ ڈاکٹر قمر سلیم اختر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1986ء

6۔ سید محمد حسنین، انشائیہ اور انشائیے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1997ء

7۔ وزیر آغا، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 2012ء

بلاک:3 سوانح نگاری

اکائی ۷: اردو میں سوانح کی روایت

اکائی ۸: حالی کی سوانح نگاری (یادگار غالب کے حوالے سے)

اکائی ۹: شبلی کی سوانح نگاری (الفاروق کے حوالے سے)

بلاک 3 کا تعارف

اکائی 7 میں ''اردو میں سوانح نگاری کی روایت'' پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں سوانح کی تعریف، اس کے فن اور اردو میں سوانح نگاری کی روایت پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی 8 ''حالؔی کی سوانح نگاری (یادگار غالب کے خصوصی حوالے سے)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔ جس میں حالی کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ''یادگار غالب'' کے خصوصی حوالے سے ان کی سوانح نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 9 ''شبلؔی کی سوانح نگاری (الفاروق کے خصوصی حوالے سے)'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں شبلی کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ''الفاروق'' کے خصوصی حوالے سے ان کی سوانح نگاری کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔

اکائی:07 اردو میں سوانح نگاری کی روایت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 سوانح نگاری کا تعارف اور فن

7.4 سوانح نگاری کے اولین نقوش

7.5 اردو میں سوانح نگاری کا آغاز وارتقا

7.6 آپ نے کیا سیکھا

7.7 اپنا امتحان خود لیجئے

7.8 سوالات کے جوابات

7.9 فرہنگ

7.10 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

☆ سوانح نگاری کے فن سے واقف ہوں گے۔

☆ سوانح نگاری کی خصوصیات سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

☆ سوانح نگاری کے اصول وضوابط کا تعین کرسکیں گے۔

☆ اردو میں فنِ سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش کی معلومات حاصل کریں گے۔

☆ اردو میں سوانح نگاری کی روایت کا جائزہ لے سکیں گے۔

☆ اردو کے اہم سوانح نگاروں اوران کے سوانحی کارناموں سے متعارف ہوں گے۔

7.2 تمہید

نثری فن پاروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب۔افسانوی ادب میں داستان،ناول اورافسانہ اور ڈرامہ شامل ہیں۔جبکہ غیر افسانوی ادب میں دیگر نثری ادب اور ہیئتیں یعنی مضمون نگاری،مکتوب نگاری،خاکہ نگاری،سوانح نگاری،خود نوشت سوانح،سفرنامہ اور رپورتاژ وغیرہ شامل ہیں۔نثر کی وہ اصناف جن میں واقعہ صداقت کا پابند نہ ہو وہ افسانوی ادب کے زمرے میں آتی

ہیں اور نثر کی جن اصناف میں واقعہ صداقت کا پابند ہوا سے غیر افسانوی ادب کہتے ہیں۔

سوانح نگاری کا تعلق غیر افسانوی ادب کی اصناف سے ہے۔اس صنف میں کسی شخص کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔سوانح لکھنے والا موجود اور دستیاب مواد کی روشنی میں ہی سوانح لکھتا ہے۔اس طرح سوانح نگار اپنے زمانے کے مواد کا پابند ہوتا ہے۔

اردو کا ابتدائی زمانہ افسانوی ادب اور خاص طور پر داستانوں سے عبارت ہے لیکن دکنی عہد سے ہی غیر افسانوی ادب کے نقوش صوفیائے کرام کی تحریروں میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔صوفیائے کرام کے یہاں تصوف وروحانیت کے علاوہ سماجی اور اجتماعی زندگی کے متعلق بھی تعلیمات ملتی ہیں۔جو ان کے سماجی شعور پر دلالت کرتی ہیں۔غیر افسانوی ادب کو انگریزوں کی آمد کے بعد زیادہ فروغ ملا۔یہاں تک کہ اردو ادب میں اس کی حیثیت نمایاں ہوتی چلی گئی۔حالؔی، شبلؔی اور ان کے معاصرین مرزا حیرت ،عبدالرزاق کانپوری ،سید افتخار بلگرامی اور محمد سلیمان منصور پوری نے سوانح نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔یہ سلسلہ اردو ادب میں جاری ہے ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی ،غلام رسول مہر، قاضی عبدالغفار، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، صالحہ عابد حسین، حبیب الرحمٰن خاں شروانی ، رئیس احمد امروہوی ، شیخ محمد اکرام ،عبدالمجید سالک، ملا واحدی، خورشید مصطفیٰ رضوی اور شاہ معین احمد ندوی وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔اس اکائی میں ہم سوانح نگاری کے فن اور اردو میں سوانح نگاری کی روایت کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

7.3 سوانح نگاری کا تعارف اور فن

سوانح نگاری غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔سوانح کو کسی شخص کی زندگی کی تاریخ یا تحریری دستاویز کہا جا سکتا ہے۔کیوں کہ اس میں سوانح نگار کسی شخص کی زندگی کے بارے میں لکھتا ہے۔اس صنف میں کسی شخص کی زندگی کو مختلف حقائق اور شواہد کی روشنی میں اس طرح قلم بند کیا جاتا ہے کہ اس کی زندگی کے تمام پہلو روشن ہو جائیں۔انسان کی پیدائش سے لے کر اس کے وفات تک کی شخصیت کا اس طرح احاطہ کیا جاتا ہے کہ اس کی زندگی کے متنوع رنگ سے لوگ واقف ہو سکیں۔سوانح نگاری کے علاوہ اردو کی بعض دیگر اصناف میں بھی سوانحی مواد شامل ہوتے ہیں۔ان اصناف میں خود نوشت نگاری، سفرنامہ نگاری، مکتوب نگاری، آپ بیتی، خاکہ نگاری ، رپورتاژ نگاری وغیرہ شامل ہیں۔ان اصناف سے سوانح نگار فائدہ اٹھاتا ہے۔مرزا غالب کے سوانحی حالات کا ایک اہم ماخذ ان کے مکاتیب رہے ہیں۔حیاتِ شبلی کے مصنف سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کی شخصیت، میلان ومزاج، علمی، تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں کے سلسلے میں ان کے خطوط سے حاصل کئے ہیں۔اسی طرح سے دیگر اصناف یعنی سفرنامہ وغیرہ بھی ہیں جن سے سوانح نگار استفادہ کرتا ہے۔سوانح نگاری کی صنف کو ۱۸۵۷ کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد زیادہ فروغ ملا۔اردو ادب میں خواجہ الطاف حسین حالی کی کتاب 'حیات سعدی' سے سوانح نگاری کے فن کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔خواجہ الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی نے اس فن کو بلندی پر پہنچایا۔

فنِ سوانح نگاری بظاہر کسی ایک شخص کی زندگی اور اس کے کارناموں پر مبنی ہوتی ہے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ اس شخصیت کے تناظر میں اس عہد کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا بھی ذکر ہوتا ہے۔سوانح نگاری کے لیے انگریزی میں Biography کا لفظ مستعمل ہے۔یہ دو لفظ Bio یعنی حیات اور Graphy یعنی تحریر کرنا سے مل کر بنا ہے۔اس طرح اس لفظ کے معنی ہوئے ''تحریر کردہ زندگی کا بیان''۔

سوانح نگاری کے متعلق ڈاکٹر الطاف فاطمہ لکھتی ہیں:

''سوانح نگاری کا فن کسی فرد واحد کی شخصیت کو منظر عام پر اس طرح لانے کا نام ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی

پہلو پوشیدہ نہ رہے۔اس میں لکھنے والا اپنے ذاتی جذبات کوشامل کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ہیرو کے محاسن ومعائب کو پیش کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔''

(اردو ادب میں سوانح نگاری،الطاف فاطمہ،اعتقاد پبلشنگ ہاؤس،ص۱۹۔دہلی ۱۹۷۴)

دانشورانِ ادب نے اس فن کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔

☆ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق سوانح انفرادی زندگی کی تاریخ ہے جو ادب کا ایک شعبہ ہے۔

☆ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں ایڈ ونڈ گوس کے مطابق سوانح زندگی کے مہمات کے ذریعہ روح کی سچی تصویر کشی ہے۔

☆ کارلائل اس صنف کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سوانح عمری ایک انسان کی مکمل زندگی ہے۔

مذکورہ تعریفات کی روشنی میں سوانح کی تعریف کچھ اس طرح بیان کی جاسکتی ہے۔کہ سوانح میں کسی شخص کی زندگی کے حالات اور واقعات کی مکمل تفصیل کے ساتھ دلکش انداز میں صداقت کوملحوظ رکھتے ہوئے مواد کی فراہمی کی خاطر تمام اہم ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ایک خاص اسلوب میں بیان کیا جائے۔

سوانح نگاری کا دائرہ کار سوانح نگار پر منحصر ہے۔بعض سوانح صرف شخصیت کا ہی احاطہ نہیں کرتیں بلکہ وہ اپنے زمانے اور عہد کا بھی کے بارے میں بھی بیان کرتی ہیں۔بیانیہ صنف ہونے کی وجہ سے سوانح نگار کو بظاہر آسانی ہوتی ہے مگر اس کی تخلیقی جہت اہمیت کی حامل ہے کہ سوانح نگار کس طرح اپنے معروضات بیان کرتا ہے۔صداقت اور سچائی کا اظہار وہ کس طرح کرتا ہے یہ لکھنے والے پر ہی منحصر ہے اور یہی چیز اس صنف کے فنی جہت کو منفرد بناتی ہے۔سوانح عمری کی متعدد قسمیں ہیں مگر اس کی کوئی حتمی فہرست تیار نہیں کی جاسکتی ہے کیونکہ اقسام کے سلسلے میں ماہرین کی آرا یکساں نہیں ہیں۔تاریخی سوانح،مذہبی سوانح،سیاسی وسماجی سوانح،افسانوی سوانح عمری اور ادبی وفکری سوانح عمری وغیرہ،سوانح نگاری کی نمایاں قسمیں ہیں۔

سوانح حیات حالات وواقعات کا مجموعہ ہوتی ہے یعنی کسی فرد کی زندگی اور اس کے کارناموں کو ترتیب کے ساتھ بیان کرنا سوانح نگاری ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کسی انسان کی پیدائش،خاندان تعلیم وتربیت زندگی اور وفات کے احوال کا محض بیان سوانح ہے بلکہ کسی شخص کے احوال وآثار،اس کے ظاہر وباطن،مزاج ومیلان،اخلاق وکردار اور اس کی سماجی ومعاشرتی زندگی کے اہم پہلوؤں کی جامع اور معروضی مطالعہ کو سوانح کہا جائے گا۔سوانح دراصل کسی شخص کی ایسی مرقع نگاری سے عبارت ہے جس میں وہ شخص اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ڈرامائی انداز میں حرکت وعمل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔نہ تو اس میں ہیرو پرستی کا عمل کارفرما ہوسکتا ہے اور نہ بے جا تکلف سے ہی کام لیا جاسکتا ہے۔واقعات کی حسنِ ترتیب اور بیان کی ہنرمندی ہی سوانح کو بطور فن بلند کرتی ہے۔یہی معروضی مطالعہ ایک فرد کے توسط سے اس عہد کے عام انسانی رویوں کو بھی سامنے لاتا ہے۔

سوانح اپنے عہد اور زمانے کی ترجمان ہوتی ہے لیکن اس سلسلے میں یہ بھی لازم ہے کہ صرف انھیں واقعات کو شامل کرنا چاہیے جس کا تعلق براہ راست ہیرو سے ہو اور اسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسا تصور بھی قائم ہو جو ہیرو کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہو۔سوانحی ادب میں تاریخ کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے،اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سوانح نگاری ادب کے ساتھ ساتھ تاریخ کا بھی فن ہے۔اسی سبب بعض ادیبوں نے سوانحی سوانحی ادب کو تاریخ کی ایک شاخ قرار دیا ہے،ان کا خیال ہے کہ سوانح میں حالات وواقعات کی حیثیت عمومی نہیں بلکہ دستاویزی ہوتی ہے اور اس کے

حقائق کوتہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس لیے سوانح کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اگر صرف واقعات کی فہرست تیار کر دی جائے تو وہ سوانح سے کہیں زیادہ ایک تاریخی کتاب بن سکتی ہے۔ اسی لیے سوانح نگار زندگی کے اہم واقعات کو اس انداز سے مرتب کرتا ہے کہ ان واقعات میں تسلسل برقرار رہے۔ سوانح میں جہاں ایک طرف تاریخ کا سفر جاری رہتا ہے وہیں زندگی کی رعنائیاں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کا یہی اندازِ بیان اسے تاریخ سے منفرد حیثیت عطا کرتا ہے۔ تاریخ اور سوانح کے حوالے سے ڈاکٹر سید شاہ علی فرماتے ہیں:

''سوانح عمری کا موضوع ایک انسان ہے اور تاریخ کا ایک ملک۔ سوانح نگار کے لیے ہجوم ثانوی اہمیت رکھتا ہے اور تاریخ کے لیے افراد خواہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ مورخ انسانوں کا ایک دور بین کے ذریعے اور سوانح نگار مفرد آدمیوں کا ایک خوردبین کے تحت مشاہدہ کرتا ہے۔ تاریخ ہمیں سرکاری ایوانوں میں لے جاتی ہے، سوانح عمری نجی قیام گاہوں میں۔ تاریخ میں ایک فاتح کی سپاہیانہ صفات اہم ہوتی ہیں اور سوانح نگاری میں اسے بہ حیثیت انسان پیش کیا جاتا ہے۔''

(اردو میں سوانح نگاری، ڈاکٹر سید شاہ علی، کراچی ۱۹۶۱ص ۳۹)

کسی ایک شخص کی زندگی کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کبھی کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ اسی لیے سوانحی ادب کے بعض ناقدین نے اس کے حدود کا تعین بھی کیا ہے۔ واضح رہے کہ سوانح صرف ادبی لوگوں کی نہیں لکھی جاتی بلکہ ادب، سیاست، مذہب اور سماج کے تئیں کارہائے نمایاں انجام دینے والے دیگر لوگوں کی بھی تحریر کی جاتی ہے۔

سوانح کے فن میں موضوع کا انتخاب بھی ایک اہم حصہ ہے۔ اسی لیے اس حوالے سے کہا جاتا ہے کہ موضوع کا انتخاب دانش اور حکمت کے ساتھ کرنا چاہیے اس کی بنیادی وجہ سوانح نگار اور اس شخص میں جس کی سوانح لکھی جارہی ہے افکار و نظریات میں ہم آہنگی پائی جائے کیوں کہ اگر کسی ایسے شخص کا انتخاب کر لیا گیا جس کے نظریات سے کسی طور پر ہم آہنگی نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کی خوبیاں اور کارنامے، برائی اور ناکامی کی صورت میں سامنے آسکتے ہیں۔ اسی لیے بعض ناقدین نے سوانح اور سوانح نگار میں نظریاتی ہم آہنگی کو لازم قرار دیا ہے۔ سوانح نگار کے لیے اپنے موضوع سے دلچسپی اور شوق کا ہونا لازمی ہے تا کہ وہ پوری یکسوئی اور خلوص کے ساتھ اپنے موضوع سے انصاف کر سکے اور اپنی منتخب شخصیت کا معروضی مطالعہ پیش کر سکے۔

موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہی فن سوانح نگاری کے ماہرین اس کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں۔ پہلی قسم میں سوانح نگار اگر ہیرو کا ہم عصر ہو تو اس صورت میں بیشتر بنیادی مواد براہ راست حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہیرو کی شخصیت اور سیرت کو اس کے سماجی، علمی اور تہذیبی پس منظر کے حوالے سے پیش کر سکتا ہے۔ ممکن ہے ایسی صورت میں ہیرو کی تصویر زیادہ بہتر اور واضح طور پر پیش کی جا سکے۔ زمانی قرب اور تعلق کی وجہ سے ایسی سوانح زیادہ جامع اور معلومات پر مبنی ہو سکتی ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ سوانح میں جس صداقت کو ملحوظ رکھنے کی بات کی جاتی ہے۔ پہلی قسم میں اس کے امکان زیادہ روشن ہو جاتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جس میں ہیرو سے سوانح نگار کا کسی طرح کا کوئی قرب نہ ہوا ایسی صورت میں اسے حد درجہ جدوجہد کرنی پڑے گی۔ ایسے میں سوانح نگار خطوط معاصر شہادتیں اور ہیرو کے اقوال واعمال سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ روزنامچے اور یادداشتیں بھی بنیادی حوالہ بنتی ہیں لیکن اس میں بھی مکاتیب کو زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ خطوط کا تعلق شخصیت سے براہ راست ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ خط نصف ملاقات ہوتی ہے۔ اطلاعات کی نئی ٹکنالوجی سے پہلے خوشی وغم اور دیگر اہم مواقع کی ترجمانی

خطوط کے ذریعے ہی ہوتی تھی۔ دلی جذبات واحساسات کی جس قدر بہتر ترجمانی خطوط میں ملتی ہیں دیگر نثری اصناف میں اس کی وضاحت کم ہی ہوتی ہیں اسی لیے سوانح عمریوں میں اس کا کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ حالی نے 'یادگار غالب' میں خطوط کو حسب ضرورت استعمال کیا ہے۔ غالب کے خطوط اپنے عہد کی تہذیبی اور ثقافتی ترجمان ہیں۔ ڈاکٹر سید شاہ علی کا خیال ہے کہ 'سوانح عمریوں کے ادبی وصف کو بڑھانے میں خطوط بہت دخیل رہے ہیں'۔

سوانح میں معلومات کا ایک اور ذریعہ معاصرین کی شہادت کا ہے۔ معاصر افراد اور اخبارات ورسائل اس شخص کے لیے جس کی سوانح لکھی جارہی ہے، پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ موضوع کو سمجھنے میں معاصرین کی شہادتیں ایک بے حد مددگار وسیلہ ہے۔ اس سے سوانح نگار کو مواد کی معروضیت کے پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاصرین کی معلومات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مواد تحریر وتقریر کی مختلف شکلوں میں ہوسکتا ہے۔ گفتگو اور بعض نجی معلومات سوانح کے لیے دستاویزی اہمیت کی حامل قرار پاتی ہیں۔ ہیرو کے اقوال وافعال بھی سوانح میں اہم مواد کا کام کرتے ہیں۔ مرزا غالب کی سوانح میں حالی نے بے شمار لطائف بھی نقل کیے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعی مرزا غالب حیوان ظریف تھے۔ اس طرح اقوال وافعال کے توسط سے سوانح ایک دلچسپ مرقع بن سکتی ہے اور قاری کے لیے بھی یہ ایک مزید دلچسپی کا سامان ہوتا ہے۔

سوانح نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مواد کی تحقیق کے ساتھ ساتھ اس کا مناسب استعمال کرے۔ اہم اور غیر اہم واقعات و حالات کی جانچ پرکھ کے ساتھ اختصار وطوالت پر بھی نظر رکھے۔ سوانح میں جہاں ایک طرف تاریخی ترتیب ضروری ہے وہیں اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ ہیرو کو مافوق الفطرت نہ بنا دیا جائے۔ اس میں ایک انسان کے تمام اوصاف نظر آنے چاہیے۔ سوانح نگاری جذباتی نہیں بلکہ ایک فنی ہنرمندی ہے اور اسی لیے کسی بھی انسان کے مطالعے میں اس کے مختلف اور متضاد عناصر کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔

سوانح عمری کی متعدد قسمیں ہیں لیکن ان کی زمرہ بندی آسان نہیں ہے۔ عام طور پر اس فن کے ناقدین اس بارے میں کوئی واضح موقف نہیں رکھتے۔ انسائکلو پیڈیا برینا ٹکا کا یہ اعتراف ہے کہ سوانح کی متعدد قسمیں ہیں مگر اس کے باوجود یہ آپس میں گڈ مڈ ہو جاتی ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ان کی تقسیم کی ابھی تک کوئی واضح بنیاد نہیں بنائی جاسکی ہے۔ سوانح کو مزید بامعنی اور پرقوت بنانے کے لیے یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے اسے تقسیم کر دیا جائے اور اس طرح اس کے کسی خاص پہلو کو اجاگر کیا جائے۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ اس کے کارناموں کا مکمل احاطہ کیا جاسکے۔ لیکن یہاں ایک مشکل یہ بھی ہے جس کی سوانح مرتب کی جائے ضروری نہیں کہ ہر شخصیت ہمہ جہت اور پہلودار ہو۔ ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے ذکر میں اس قدر طویل مواد جمع نہ ہو سکے۔ بہر حال سوانح کی جو اقسام مضوعاتی طور پر کی جاتی ہیں ان میں مذہبی، تاریخی، سیاسی، سماجی، افسانوی اور ادبی سوانح وغیرہ ہیں۔ مذہبی سوانح عمری دراصل ان اشخاص سے متعلق ہوتی ہے جس میں مصنف کسی شخص کی مذہبی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ سوانح عمری کو تاریخ کی ہی ایک شاخ کہا جاتا ہے۔ اسی لیے تاریخی سوانح عمریاں دراصل ان لوگوں پر مبنی ہوتی ہیں جن کی حیثیت تاریخی ہو۔ اس میں بہت سے فرماں رواؤں اور حکمرانوں کے نام شامل ہیں جنھوں نے اپنے ملک کی تعمیر وترقی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اردو میں تاریخی سوانح عمریوں کا سرمایہ کافی ہے۔ محمد حسین آزاد اور علامہ شبلی کی سوانحی کتابیں اس ذیل میں اہمیت کی حامل ہیں۔ ممتاز سیاسی اور سماجی رہنماؤں کے حالات بیان کئے جائیں تو وہ سیاسی اور سماجی سوانح عمری کہلائیں گی۔ اردو میں اس طرح کی سوانح عمریاں زیادہ تو نہیں لکھی گئی ہیں البتہ تراجم کے ذریعہ اردو کے ذخیرے میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔

افسانوی سوانح عمریاں کم لکھی گئی ہیں۔افسانوی ادب کے اہم اجزا اس طرح کی سوانح عمریوں کا حصہ ہوتے ہیں۔'ابن الوقت'، 'ٹیڑھی لکیر' اور 'امراؤ جان' کا ذکر اسی ذیل میں کیا جاتا ہے۔افسانوی سوانح عمریوں میں سوانح نگار اپنے تخیل کی مدد سے ایک نیا رنگ اور آہنگ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی وجہ سے اس میں افسانوی انداز ِبیان پیدا ہو جاتا ہے۔ادبی خودنوشتوں کا بنیادی سروکار ادب ہی ہوتا ہے، جس میں ادیبوں کے کارنامے رقم ہوتے ہیں اس طرح کے سوانحی سلسلوں میں تہذیبی اور ثقافتی شعور کی کارفرمائی ازخود سامنے آجاتی ہے۔فن سوانح کے ناقدین ادبی سوانح عمریوں کو اسی لیے اہمیت دیتے ہیں کہ ان میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں زیادہ بہتر انداز میں نمایاں ہوسکتی ہیں۔سوانح عمری اگرچہ کسی ایک شخص کی داستان حیات ہوتی ہے مگر اس ایک شخص کے توسط سے اس عہد کے دیگر حالات اور واقعات بھی سامنے آتے ہیں۔ایسی صورت میں ہی یہ ادبی صنف اپنے زمانے اور حالات کا آئینہ ہو جاتی ہے۔

7.4 سوانح نگاری کے اولین نقوش

ابتدا میں اردو سوانح نگاری کو تاریخ کی ایک شاخ تصور کیا جاتا رہا ہے۔سوانحی ادب میں تاریخی عنصر سچائی کی شکل میں نمایاں رہتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے یہ فن اپنے ارتقائی مراحل سے گزرتا رہا یہ بات واضح ہوتی گئی کہ یہ تاریخ نہیں بلکہ ادب کا حصہ ہے خصوصاً تخلیقی ادب کا۔واحد متکلم راوی کی صورت میں بیانیہ کو جو آزادی میسر ہوتی ہے وہ اپنے انداز و اسلوب سے ایک الگ حیثیت اس صنف کو عطا کرتا ہے۔ممتاز فاخرہ کا کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

> ''ادب کی دوسری اصناف کی طرح اگر فن سوانح نگاری کے تدریجی ارتقا کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں کبھی اسے تاریخ کی شاخ تصور کیا گیا تو کبھی اس کے مختلف عناصر کی تلاش تذکروں میں کی گئی۔مغرب میں بھی تاریخ و سوانح میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔لیکن سترہویں صدی کے نصف آخر میں سوانح عمری کو ادب کی ایک مستقل صنف کا درجہ حاصل ہوا۔''

(اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا 1914 تا 1975، ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، دہلی، ص،23، 1984)

سوانح نگاری کے فن کو مغرب میں زیادہ فروغ ملا۔اس کے ابتدائی نقوش یونانی اور لاطینی زبانوں میں اساطیری قصوں، پتھر کی سلوں اور بھوج پتروں میں ملتے ہیں۔یہودیوں کے یہاں سوانحی حالات و روایت باضابطہ طور پر نظر آتی ہے۔مغرب میں ہی اس فن کے باقاعدہ اصول وضوابط طے کیے گئے اور اس کی روشنی میں حقائق کو سامنے رکھ کر سوانح عمریاں تحریر کی گئیں۔یونان میں Memories of Socrates، Parallel Lives وغیرہ اہم ہیں۔جب عیسائیت کا حد درجہ فروغ حاصل ہوا تو انگلینڈ میں مذہبی اور مقصدی سوانح لکھنے کا رواج ہوا۔اس کے لیے انگریزی میں ایک خاص اصطلاح Hagiography مستعمل ہے۔اسی مقصد کے تحت ایڈمر نے سینٹ اینسلم کی سوانح لکھی۔انگلینڈ کے دورِ احیاء میں ہیرو پرستی کا رجحان عام ہوا تو انگریزی میں ولیم روپر، جارج کیونڈش، ٹامس سیراٹ اور برائیڈن نے اس نظریے کی نمائندگی کی۔

مشرقی ادب یعنی عربی و فارسی ادب میں سوانح کی ایک طویل روایت موجود ہے۔عربوں نے اس فن پر زیادہ توجہ کی۔عربی ادب میں زیادہ سوانح عمریاں مذہبی شخصیات پر لکھی گئیں۔ویسے بھی سوانح عمریوں کا ایک بڑا موضوع مذہبی شخصیات ہی رہی ہیں۔سوانح نگاری کے فروغ کا ایک اہم سبب علم حدیث ہے۔چونکہ وہ افراد جن سے احادیث مروی ہیں ان کی زندگی کے مستند حالات کی جمع و ترتیب سوانحی ادب کو فروغ دینے میں زیادہ مددگار ثابت ہوئے۔اسی کے ساتھ ساتھ عربی میں سیرت نگاری کی مستحکم روایت نے بھی اس فن کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ سیرت نگاری میں تحقیق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ایک ایک واقعہ کی تحقیق اور درست نتیجے تک پہنچنے کی جستجو ہی اس فن کا خاصہ ہے اسی لیے کہا

جاتا ہے کہ عربی ادب میں موجود سیرت نگاری نے بعد میں اردو کے سوانحی ادب کے لیے ایک وسیع میدان فراہم کیا۔

پیارے نبی ﷺ کی زندگی ہمارے لیے اسوۂ کامل ہے۔ان کی سیرت وشخصیت اور زندگی کے ایک ایک واقعہ کی اس طرح چھان پرکھ کی گئی کہ علم وتحقیق کی دنیا ایسی کوئی دوسری مثال اب تک نہیں پیش کرسکی اور اسی کے نتیجے میں سیرت کا فن باقاعدہ وجود میں آ گیا جسے سوانح نگاری کی قدیم ترین شاخ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی میں لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دورِخلافت میں اس فن کی بنیاد پڑی۔عربوں میں یہ فن ان کی خاص دلچسپی کے سبب زیادہ پروان چڑھا اور اس کی مختلف صورتیں بھی ملتی ہیں مثلاً سیرت مغازی، طبقات، تذکرہ، حیات، مناقب، تراجم، یادگار و اقوال۔اردو ادب میں اس کے واضح اثرات مرتب ہوئے۔اسلام جب عرب سے ایران پہنچا تو اس کے اثرات صرف اہل ایران کی زندگیوں پر ہی مرتب نہیں ہوئے بلکہ فارسی شعروادب نے بھی اس کا اثر قبول کیا۔اسی کا نتیجہ تھا کہ فارسی میں بھی سوانح عمریاں اسی طرز پر لکھی جانے لگیں۔فارسی ادب میں شیخ علی حزیں اور سیف نعمت اللہ کی سوانح عمریاں خاصی اہم ہیں۔

7.5 اردو میں سوانح نگاری کا آغاز وارتقا

اردو زبان فارسی اور عربی کے مقابلے میں زیادہ قدیم نہیں ہے۔اور اس کا ادبی سلسلہ تو چند صدیوں پر محیط ہے۔اس نے عربی اور فارسی ادب کے اثرات نہ صرف قبول کیے بلکہ ان سے استفادہ بھی کیا۔اردو میں سوانحی ادب کے ابتدائی نقوش دکنی مراثی اور مثنویوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔دکن کے اہم شعرا جن میں ملا وجہی، قلی قطب شاہ، نصرتی، غواصی اور ابن نشاطی کا نام شامل ہے۔ان کی شاعری خصوصاً مثنویوں میں سوانحی عناصر پائے جاتے ہیں۔مثنوی ابراہیم نامہ سے بادشاہ کی زندگی، اس کے معمولات اور بعض دوسری مصروفیات کا پتا چلتا ہے۔نصرتی کی مثنوی گلشن عشق سے سلطان علی عادل شاہ ثانی کے بچپن کے حالات اور نصرتی کے ساتھ اس کے لطف وکرم کا پتا چلتا ہے۔نصرتی کو شخصیت نگاری میں خاصی قدرت حاصل تھی مثنوی سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ نصرتی کے والد شاہی فوج میں اسلحہ داری کے عہدہ پر فائز تھے۔مثنوی علی نامہ سے ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے سلطان کا خاص تقرب حاصل تھا۔اس مثنوی میں بادشاہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز اس میں بعض ایسے واقعات کا ذکر بھی ہے جس سے بادشاہ کی خوش مذاقی کا اندازہ ہوتا ہے۔غواصی کی مثنویوں سے اس کی ابتدائی زندگی اور پریشاں حالی کا اندازہ ہوتا ہے۔اسی طرح ابن نشاطی کی مثنوی سے پتا چلتا ہے کہ اسے علم وادب سے گہری دلچسپی تھی۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ''تذکرہ مخطوطات اردو'' میں سیرت ومناقب کا ایک باب قائم کیا ہے اور اس میں ان مخطوطات کی فہرست دی ہے جو رسول اکرم ﷺ کی سیرت و مناقب اور ان کے اصحاب کرام کی سیرت سے متعلق ہیں۔

اردو میں سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش تذکروں اور یادداشتوں کی شکل میں بھی ملتے ہیں۔تذکرے سوانحی مقصد سے نہیں لکھے گئے تھے لیکن اس کے باوجود ان سے شاعروں کی سیرت اور ان کی زندگی کے مختصر حالات کا پتا چلتا ہے۔بعض تذکروں میں شعرا کی شخصیت سے متعلق بعض لطیف اشارے بھی درج کئے گئے ہیں۔حالاں کہ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ تذکروں میں سوانحی حالات بہت کم ہی نظر آتے ہیں نیز اس میں ذاتی پسند وناپسند کا دخل بھی ہوتا ہے۔مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ تذکروں میں ذاتی حالات کی تفصیل مطلق نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ضمنی طور پر ان میں بعض کام کی باتیں مل جاتی ہیں۔فارسی کی طرح اردو تذکروں میں یہ چیزیں تقریباً یکساں پائی جاتی ہیں۔نکات الشعرا میں میر تقی میر نے شعرا کا حال لکھا ہے۔گردیزی کے تذکرہ 'ریختہ گویاں' میں تقریباً ۱۰۰ شاعروں کے احوال قلم بند کئے گئے ہیں۔اسی طرح قائم چاند پوری اور غلام حسین کے تذکروں میں بھی شعرا کے احوال ملتے ہیں۔شیفتہ کا تذکرہ گلشن بے خار میں بھی سوانحی کوائف موجود ہیں۔تذکرہ نگاری کے ضمن میں آبِ حیات کو مخصوص مقام حاصل ہے۔اس میں محمد حسین آزاد کی انشا پردازی درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔تاریخ کے

ساتھ ساتھ شخصیت نگاری کے عناصر بدرجۂ اَتم موجود ہیں ۔ اس فن کی بعض کمزوریوں کے سبب تذکروں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔سوانح نگاری کے اولین نقوش اور بہت سے شعرا کی ولادت اور وفات کی تاریخیں اسی سے ملتی ہیں۔ نیز تذکرے اپنے عہد کے تہذیبی، معاشرتی، علمی اور ادبی زندگی کی معلومات کا ایک اہم ذریعہ بھی ہیں۔

اردو ادب میں سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز مولانا حالی (۱۸۳۷۔۱۹۱۴) کی سوانح نگاری سے تصور کیا جاتا ہے۔ان سے پہلے سرسید احمد خاں کی کئی تصانیف میں سوانحی عناصر موجود ہیں۔ان میں آثارالصنادید (۱۸۴۸)،خطبات احمدیہ (۱۸۷۰) اور سیرت فریدیہ (۱۸۹۶) وغیرہ شامل ہیں۔اس کے علاوہ بھی اس زمانے کی بعض کتابیں ہیں جن میں مختصر حالاتِ زندگی کا بیان ملتا ہے۔ان کتابوں میں احسن السیر (۱۸۷۷) مراۃ الکونین (۱۸۷۸) روضۃ الادبا (۱۸۷۹) تاریخ الحکماء (۱۹۷۹) کے نام شامل ہیں۔

اردو ادب میں مولانا الطاف حسین حالی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔دیگر ادبی کارناموں کے علاوہ انھوں تین سوانح عمریاں تحریر کی ہیں۔ حیات سعدی (۱۸۸۶) یادگار غالب (۱۸۹۷) اور حیات جاوید (۱۹۰۱)۔ چوں کہ حیات سعدی سے پہلے باقاعدہ اردو میں کوئی سوانح نہیں لکھی گئی تھی اس لیے حالی نے عربی و فارسی اور مغرب میں سوانحی ادب سے متعلق جو کچھ لکھا جا چکا تھا اس سے نہ صرف فائدہ اٹھایا بلکہ سوانحی ادب کو نیکی اور تبلیغِ دین کے پھیلانے کا ذریعہ قرار دیا اور اپنے اس اصلاحی مشن سے اسے اس طرح مربوط کر دیا جو سرسید سے قربت کے نتیجے میں ان کے یہاں پہلے سے موجود تھا۔حالی کی یہ کتابیں صرف سوانح اور کارنامے کی صورت میں ہی نہیں دیکھی جاتیں بلکہ اپنے بزرگوں کے ذکرِ خیر اور ان کے کارناموں کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کا ایک معتبر وسیلہ بھی بنیں۔حیاتِ سعدی کے پہلے باب میں سوانح اور دوسرے باب میں شیخ سعدی کی تصنیفات یعنی ان کے کلام جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں خاتمہ ہے۔سوانحی حصے میں سعدی کے نام و نسب، ولادت اور بچپن کی زندگی کے علاوہ ان کی تعلیم تربیت اور سیرت کا ذکر کیا گیا ہے۔تعلیم کے لیے سعدی کو ترکِ وطن بھی کرنا پڑا۔ حیات سعدی سے پہلے سوانح عمریوں کا مقصد یادگاری یا تاریخی تھا۔حالی نے حیات سعدی لکھ کر سوانح عمریوں کے موضوعات میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔حیات سعدی کو علامہ شبلی نے دلچسپ اور محققانہ سوانح عمری قرار دیا ہے۔

'یادگار غالب' حالی کا ایک اہم سوانحی کارنامہ ہے جس میں مرزا اسداللہ خاں غالب کی زندگی اور ان کے کلام کی تعبیر و تشریح کی گئی ہے۔حالی نے غالب کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ وہ ان کے شاگرد بھی تھے اس لیے ان کی صحبت بھی میسر تھی اور انھیں غالب سے عقیدت و محبت بھی تھی۔غالب کی زندگی کے ذاتی حالات بھی حالی کو معلوم تھے مگر اس کے باوجود مرزا کی تصنیفات اور دوسرے ذرائع سے غالب کے تمام حالات جمع کیے اور ایک عمدہ سوانح عمری تحریر کی۔حالاں کہ یادگارِ غالب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں بعض پہلو تشنہ رہ گئے ہیں۔حالی نے اختصار سے بھی کام لیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اگر مرزا کے تمام ملفوظات جمع کر دیے جائیں تو لطائف و ظرافت کی ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔

حیات جاوید، حالؔی کی تیسری سوانحی کتاب ہے، جو سرسید احمد کی زندگی اور ان کے کارناموں پر مشتمل ہے۔اس میں سرسید کے خاندان، معاشرت، تربیت اور ان کی زندگی کا اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کی شخصیت اپنی تمام تر بوقلمونی کے ساتھ روشن ہو جاتی ہے۔ حالی نے سرسید سے متعلق ہر طرح کے مواد سے استفادہ کیا۔حیات جاوید دراصل ایک ایسے شخص کی سوانح ہے جو اپنی پوری زندگی نہایت سرگرمِ عمل رہا ہے۔اور اس کی شخصیت نے ملک و قوم کے علمی و عملی شعور کو ہی جدید نظریات و تصورات سے روشناس کرایا۔سرسید کی عوامی زندگی کا ایک بڑا حصہ طعن و تنقید کا شکار رہا۔انھوں نے عوام میں تعلیم کے فروغ کے لیے باقاعدہ کوشش کی اور کالج قائم کیا۔ان کی مخالفت اور حمایت میں دونوں طرح کے لوگ شامل تھے۔حالؔی نے شاید اسی لیے حیات جاوید کے پہلے حصے میں سرسید کی زندگی کے تمام گوشوں کو ترتیب سے بیان کیا اور

دوسرے حصے میں ان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔

اردو ادب میں علامہ شبلی نعمانی بحیثیت ناقد و مورخ اور بلند پایہ انشاپرداز کے ساتھ ایک ممتاز سوانح نگار کے طور پر مقبول و مشہور ہیں۔ تاریخ سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا اور اسی لیے انھوں نے بہت سے اہم لوگوں کی سوانح لکھی ہے۔ ان میں المامون (۱۸۸۷)، سیرۃ النعمان (۱۸۹۱)، الفاروق (۱۸۹۹)، الغزالی (۱۹۰۲)، سوانح مولانا روم (۱۹۰۶) اور سیرۃ النبی شامل ہیں۔ المامون دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں عباسیوں کی تاریخ وغیرہ ہے جبکہ دوسرے حصے میں ان کے سوانحی حالات درج کیے گئے ہیں۔ مامون کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور اسے دلکش بنانے کے لیے لطائف و ظرافت کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ خیال بھی عام ہے کہ مامون کی بعض بے اعتدالیوں سے صرف نظر کیا گیا ہے چوں کہ شبلی کے نزدیک ہیرو کی لائف اور اس کے کارناموں کو زیادہ بیان کرنا تھا، شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں وہ سوانح نگار سے کہیں زیادہ مورخ نظر آتے ہیں۔ البتہ شبلی کا دلکش اسلوب جگہ جگہ قاری کو اپنی جانب کھینچتا رہتا ہے۔ سیرۃ النعمان میں امام اعظم ابوحنیفہ بن ثابت کی سوانح بیان کی گئی ہے۔ امام ابوحنیفہ سے خاصی عقیدت و محبت کے باوجود شبلی نے سوانح نگاری کے اصولوں کا خیال رکھا۔ ہیرو پرستی کے بجائے ان کی کمزوریوں کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے نیز امام ابوحنیفہ سے منسوب بعض باتوں کو تحقیق کی روشنی میں غلط ثابت کیا۔ امام ابوحنیفہ کی سوانح میں شبلی مصلح، مجتہد، مورخ اور محدث کے طور پر نظر آتے ہیں۔ یعنی امام اعظم کی مختلف حیثیتوں کو اس طور پر پیش کیا ہے کہ اس سے دونوں کی شان نمایاں ہوتی چلی گئی ہے۔

شبلی کی سوانح عمریوں میں 'الفاروق' کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب سوانحی پہلو سے بہت اہم ہے۔ اس کے مواد کی فراہمی کے لیے شبلی نے روم اور شام کا سفر کیا تاکہ وہاں کی لائبریریوں سے استفادہ کر سکیں۔ پہلے حصے میں حضرت عمر فاروق کی سیرت اور شخصیت اور ان کے منفرد اوصاف کا بیان کیا گیا ہے جس سے ان کے کردار کی بلندی اور شخصیت کا تنوع نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوسرے حصے میں حضرت عمر کی فتوحات اور ان کے کارناموں خصوصاً اپنے دورِ خلافت میں ملکی انتظامات کے تئیں جو کارنامے انھوں نے انجام دیئے اس کا بیان کیا گیا ہے۔ شبلی نے ایک سچے سوانح نگار کی طرح تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ بلاشبہ اردو کے سوانحی ادب میں یہ کتاب ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

شبلی کی تصنیف الغزالی دراصل کلامی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام غزالی کی تعمیر و تشکیل میں تصوف کا نمایاں کردار تھا۔ اس سوانح کے ذریعے شبلی نے عقلی مباحث کو زیادہ پیش کیا ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے فلسفہ کو زیادہ مقبولیت ملی۔ یہ شبلی کی ایک اہم سوانح ہے جس میں امام غزالی اور ان کے کارناموں کی تفہیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سوانح مولانا روم قیام حیدرآباد کی یادگار ہے۔ اس میں مولانا روم کی مثنوی پر بحث کرتے ہوئے شبلی نے یہ ثابت کیا ہے کہ عام طور پر اسے تصوف کی کتاب تصور کیا جاتا ہے مگر درحقیقت یہ علم کلام اور عقائد کی بھی عمدہ کتاب ہے۔ علم کلام کے مسائل پر شبلی کا تبصرہ ان کے عالمانہ رتبے کو بلند کرتا ہے۔

سیرۃ النبی شبلی کی آخری اور معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ اس کتاب کی صرف دو جلدیں ہی تحریر ہوئی تھیں کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ بقیہ جلدیں شبلی کے خاکے کی روشنی میں ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے تحریر کیں۔ یہ کتاب صرف نبی کریم ﷺ کی سیرت ہی نہیں ہے بلکہ ان کی مکمل زندگی کا احاطہ کرتی ہے اس میں ان کے عادات و اخلاق اور سیرت و سوانح کے ساتھ ساتھ فتوحات اور جنگی مہمات کا بھی تذکرہ ہے۔ نیز کتاب کا وہ اہم حصہ بھی جس میں مستشرقین نے آنحضرت ﷺ سے متعلق جو گمراہ کن پروپیگنڈا کیا تھا اس کا مدلل جواب اور تاریخ و حقائق کی روشنی میں اس کی تردید بھی کی گئی ہے۔ سیرۃ النبی شبلی کے محققانہ انداز و اسلوب اور انشاپردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

حالی اور شبلی نے سوانحی ادب کو اپنی گراں قدر خدمات سے ثروت مند بنایا اور اصلاحی جذبے کے تحت بزرگوں کی سوانح عمریاں تحریر

کیں۔اس دور کے بیشتر مصنفین کے یہاں کم وبیش یہی رجحان پایا جاتا ہے۔ان بزرگوں کی تصنیفات آنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ان کے معاصرین میں مرزا حیرت،عبدالرزاق کانپوری،سید افتخار بلگرامی اور محمد سلیمان منصور پوری کے نام اہم ہیں۔البتہ سوانحی ادب کی روایت میں حالی اور شبلی کی طرح اس فن میں کوئی بڑا کارنامہ وجود میں نہیں آسکا۔

علامہ شبلی نعمانی نے سوانحی ادب کی جس روایت کو فروغ دیا بعد میں ان کے ہی قائم کردہ ادارہ دارالمصنفین کے بعض رفیقوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ آگے بڑھایا۔ان میں سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔سید سلیمان ندوی شبلی کے ممتاز طالب علم ہیں۔ان کی حیثیت جانشینِ شبلی کی ہے۔انھوں نے شبلی کے بعض نامکمل کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ان میں سب سے اہم کتاب سیرۃ النبی ہے۔سید سلیمان ندوی محقق و انشا پرداز اور صاحب اسلوب نثر نگار تھے سیرۃ النبی کی آخری چار جلدیں انھوں نے ہی مکمل کی۔بلاشبہ سیرت کے نگارخانے میں یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔واضح رہے کہ ان چار جلدوں میں عبادات وعقائد،معجزات،اسلام کا فلسفۂ اخلاق وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔سیرت کے بنیادی مباحث ابتدائی دو جلدوں میں ہی ملتے ہیں۔'رحمت عالم' سیرت پر ایک مختصر کتاب ہے جو بنیادی طور پر بچوں اور عام لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے۔یہ کتاب اپنے انداز واسلوب اور واقعاتِ سیرت کے انتخاب وترتیب کے اعتبار سے جامعیت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔کتاب سادہ زبان،عام فہم انداز اور دلکش اسلوب میں تحریر کی گئی ہے۔کتاب کے آغاز میں افسانوی طرز کا خاصہ دخل ملتا ہے۔ایک طرف مکی زندگی کے مصائب ومشکلات کا ذکر ہے تو دوسری طرف مدینہ والوں کا پرتپاک خیر مقدم۔سیرت پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں مگر عام لوگوں کے لیے یہ پہلی کتاب ہے جس میں حضور ﷺ کی سیرت وشخصیت کو عام فہم انداز میں بیان کیا گیا،جس سے سوانح نگاری کی روایت کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔سید سلیمان ندوی کی ایک اہم سوانح سیرتِ عائشہ ہے۔ایسا مانا جاتا ہے کہ یہ کتاب خواتین کے لیے اصلاحی جذبے کے تحت لکھی گئی ہے۔سید سلیمان ندوی نے حضرت عائشہ کی زندگی کے مختلف واقعات خصوصاً بچپن کی سرگرمیوں،کھیل کود،امور خانہ داری،ذہانت،جرأت وبہادری،عاجزی وانکساری کا احاطہ کیا ہے۔بعض بشری کمزوریوں کے علی الرغم غیرضروری مباحث کے بجائے شخصیت اور کارنامے کے ہر پہلو کو روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان کی محبت وخلوص اور عاجزی وانکساری کے جذبے،واقعہ افک سے برات کے بعد ان کے انداز تشکر سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے یہاں دین وایمان کے تئیں سرشاری اور جانبازی کا کس قدر جذبہ تھا۔یہ واقعات بجا طور پر خواتین کے لیے قابل فخر ہیں۔سید سلیمان ندوی نے واقعات کے پیش کش اور مواد کی تحقیق میں جس سلیقہ مندی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھی قابل رشک ہے۔عہد نبوی میں حضرت عائشہ سے پہلے کسی کی ابتدائی زندگی کے حالات اور بچپن کی معمولی سے معمولی سرگرمیوں کا احوال اس انداز میں دستیاب نہیں ہے۔

حیات امام مالک (۱۹۱۷) بھی ایک اہم سوانحی کارنامہ ہے۔یہ کتاب امام مالک کی سوانح بھی ہے اور علوم اسلامیہ کی تاریخ بھی،اسی وجہ سے امام صاحب کے کارناموں پر زیادہ گفتگو کی گئی ہے۔امام مالک کی ابتدائی زندگی اور ان کی تعلیم وتربیت کے باب میں ان کی جودت طبع کا بیان بھی کیا گیا ہے۔اس زمانے کے مدینہ کے فقہا کا بھی ذکر ہے۔ساتھ ہی ساتھ علوم اسلامیہ کی تاریخ اور اس کے مسائل کی تشریح وتعبیر بھی کی گئی ہے۔امام مالک کی بارعب شخصیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کی مجلس میں کسی طرح کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔یہاں تک کہ ہارون رشید نے ایک بار عام لوگوں کو ان کی مجلس سے ہٹانا چاہا تو امام مالک نے انھیں منع کر دیا۔حیاتِ امام مالک کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیاتِ امام مالک مصنف کو امام صاحب کی تصنیفات میں زیادہ پسند ہے اور اسی لیے اس کتاب کا ذکر تفصیل سے ہے۔امام صاحب کے کارناموں کے ذیل میں ان کی فکری اجتہادات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔حیات امام مالک اردو میں اپنے موضوع پر پہلی مستند سوانحی کتاب ہے۔

عمر خیام (۱۹۲۳) سید سلیمان ندوی کی ایک مفصل سوانحی کارنامہ ہے۔اس سے پہلے خیام کو ان کی رباعیوں سے جانا جاتا تھا۔سید

سلیمان ندوی نے ان کی تصنیفات کے حوالے سے بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے نیز خیام کی سالا نہ امداد کے واقعہ اور گوشہ نشینی وغیرہ سے متعلق واقعات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔حیاتِ شبلی (۱۹۴۳) علامہ سید سلیمان ندوی کا ایک بڑا سوانحی کارنامہ ہے۔اس میں علامہ شبلی کی شخصیت،سوانح،تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اس عہد کے تاریخی اور سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔علامہ شبلی کی تعلیمی اور تصنیفی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ علی گڑھ اور ندوۃ العلما کی تعلیمی صورت حال بھی سامنے آجاتی ہے۔

علامہ شبلی کے نمایاں شاگردوں میں ایک نام مولانا عبدالسلام ندوی کا ہے۔سیرت عمر بن العزیز سات ابواب پر مشتمل ہے۔جس میں سوانحی زندگی کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔نیز خلافت ملنے کے بعد انھوں نے بنی امیہ کے دوسرے خلفا کے برخلاف سادگی بھری زندگی اختیار کی۔شرعی امور کا جس طرح ان کے عہد میں احیا ہوا اس کو مولانا عبدالسلام ندوی نے بطور خاص پیش کیا ہے۔انھوں نے خوبیوں کے ساتھ ساتھ بعض خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔دوسری کتاب 'اقبال کامل' ہے۔اس کتاب میں مصنف کے پیش نظر اصل مقصد تو کلام اقبال کی تعبیر و تشریح ہے مگر اس سے قبل ابتدائی سو صفحات میں علامہ کے سوانحی گوشوں کا نہایت جامعیت سے بیان کیا گیا ہے۔اس وقت تک اقبال پر مضامین اور مقالے لکھے گئے تھے مگر باقاعدہ کتاب نہیں تھی۔

غلام رسول مہر نے 'غالب' (۱۹۳۶) کے نام سے غالب کی سوانح لکھی۔انھوں نے تمام اہم ماخذ سے استفادہ کرتے ہوئے غالب کے تمام پہلوؤں کا بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا۔انھوں نے توصیفی رنگ کو اختیار کیا ہے۔مغربی سوانح نگاری کے اصولوں کو برتنے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ سیرت سید احمد شہید دو جلدوں پر مشتمل ہے۔پہلی جلد میں ابتدائی زندگی،تعلیم و تربیت اور عنفوانِ شباب کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ دین کی تبلیغ اور جہاد کے معرکوں کی تفصیل درج ہے۔دوسری جلد میں جہادی معرکوں کے اسباب اور جنگوں کا بیان کیا گیا ہے۔

قاضی عبدالغفار نے جمال الدین افغانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح لکھی۔آثار جمال الدین افغانی (۱۹۴۰) تین ادوار پر مشتمل ہے۔خطوط،روزنامچوں،بیانات اور تقاریر اور دیگر ذرائع سے معلومات جمع کر کے سوانح مرتب کی گئی ہے۔البتہ کتاب میں سوانح سے کہیں زیادہ ان کی سیاست کے آفاقی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ابتدائی زندگی اور ان کے اخلاق و عادات کا عمومی ذکر کیا گیا ہے۔آثار ابوالکلام آزاد دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں مولانا آزاد کی علمی اور سیاسی سرگرمیوں کو پیش کیا گیا ہے جبکہ دوسرے حصے میں مولانا آزاد کے مزاج،فطرت،اور ان کے داخلی جذبات و احساسات کو نمایاں کیا گیا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے مولانا اشرف علی تھانوی کی سوانح اور ان کے کارناموں کو حکیم الامت: نقوش و تاثرات کے عنوان سے مرتب کیا۔ایک عمدہ سوانح نگار کی طرح مولانا دریابادی نے ہیرو کی تمام تفصیلات خطوط اور اپنے ذاتی مشاہدے کی روشنی میں بیان کی ہے۔اس کتاب میں صرف ان کی روحانی اور مذہبی شخصیت نہیں ابھاری گئی ہے بلکہ انسان کے طور پر بھی ان کی شخصیت کے واضح نقوش قائم کیے گئے ہیں۔اردو کے سوانحی ادب میں یہ ایک اہم کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ان کی دوسری سوانحی کتاب 'محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند اوراق' ہے۔یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے پہلی جلد ۱۹۵۴ میں اور دوسری جلد ۱۹۵۶ میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ذاتی معلومات ،مشاہدات اور سیاسی و ملکی سرگرمیوں کے تناظر میں مولانا محمد علی جوہر کا ایک دلکش مرقع کھینچا ہے۔

صالحہ عابد حسین کی اہم سوانحی کتاب 'یادگار حالی' ہے۔یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں پیدائش سے آغاز شاعری تک کا ذکر ملتا ہے۔دوسرے حصے میں جوانی کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور آخری حصے میں جو برگ و بار کے نام سے ہے حالی کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔کتاب کا دوسرا حصہ برگ و بار کے نام سے ہے اور یہ بہت ہی اہم اور دلکش حصہ ہے۔جس میں حالی کے اخلاق و کردار اور ابتدائی زندگی کی

چلتی پھرتی تصویر پیش کی گئی ہے۔اردو کے سوانحی سلسلے میں یہ کتاب بھی بہت اہم اور اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔

اس کے علاوہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے ذکرجمیل، نابینا علمائے سلف، سیرت الصدیق کے عنوان سے سوانح عمریاں لکھیں۔مولوی اکرم اللہ ندوی نے حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی فرمائش پر وقارالملک کی سوانح حیات 'وقار حیات' کے نام سے لکھی۔رئیس احمد جعفری نے سیرت محمد علی، رند پارسا (ریاض خیرآبادی کی سوانح) اور حیات محمد علی جناح کے نام سے سوانح عمریاں لکھیں۔شیخ محمد اکرم نے شبلی نامہ اور غالب نامہ کے عنوان سے دو سوانح عمریاں لکھیں۔عبدالمجید سالک نے ذکر اقبال، ملا واحدی نے خواجہ حسن نظامی، خورشید مصطفیٰ رضوی نے حیات ذاکر حسین اور شاہ معین الدین احمد ندوی نے حیات سلیمان، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی سیرت سید احمد شہید، حیات عبدالحیٔ اور سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری، پروفیسر خلیق احمد نظامی کی پانچ جلدوں میں حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور نیر مسعود کے ذریعہ لکھی گئی سوانح عمری 'میر انیس' کافی اہم سوانح عمریاں ہیں۔جن سے فن کے سمت و رفتار کو مزید وسعت اور ترقی عطا کی۔یہ سوانح عمریاں صرف کسی کی شخصیت اور سیرت کی آئینہ دار نہیں ہیں بلکہ علمی و ادبی میلانات اور اپنے عہد کی دیگر سرگرمیوں سے بھی واقفیت کا ذریعہ ہیں۔ان سوانح عمریوں کے علاوہ بھی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں اور مزید لکھی بھی جارہی ہیں، اب کوشش یہ کی جارہی ہے کہ سوانح عمریوں میں بس بنیادی معلومات کے بعد اہم واقعات کے توسط سے نتائج اخذ کئے جائیں اور ان کی بنیاد پر افکار و خیالات کو پیش کیا جائے لیکن دور اول میں ایسا نہیں تھا اس وقت احوال اور واقعات پر زیادہ زور صرف کیا جاتا ہے تاکہ متعلقہ شخص کے گزرے ہوئے ایام ضبط تحریر میں آجائیں۔سوانح عمری کی جدید روش جدید تقاضوں اور سوانح عمری کی جدید شعریات کی بناپر ہے جو فن سوانح نگاری میں خوش گوار تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔

7.6 آپ نے کیا سیکھا

آپ نے سیکھا کہ اردو نثر افسانوی اور غیر افسانوی ادب پر مشتمل ہے۔افسانوی ادب میں داستان، ناول اور افسانہ شامل ہے۔ غیر افسانوی ادب میں مکتوب نگاری، خاکہ نگاری، سوانح نگاری، خودنوشت سوانح، سفرنامہ، مضمون اور رپورتاژ وغیرہ شامل ہیں۔سوانح کسی شخص کی زندگی کی تحریری دستاویز کہا جاسکتا ہے۔اس میں ایک دوسرا شخص کسی کی زندگی کے بارے میں مختلف حقائق اور شہادت کی روشنی میں زندگی کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

آپ نے سیکھا کہ سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش یہودیوں کے یہاں ملتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں مشاہیر کے کارناموں کو جمع کرنے کا رواج تھا۔عیسائی مذہب کی مذہبی کتابوں میں بھی سوانحی حالات ملتے ہیں۔عربوں نے اس فن پر زیادہ توجہ کی۔سوانح عمریوں کا ایک بڑا موضوع مذہبی شخصیات ہی رہی ہیں۔سوانح نگاری کے فروغ کا ایک اہم سبب علم حدیث ہے۔اردو زبان، فارسی اور عربی کے مقابلے میں زیادہ قدیم نہیں ہے۔اس نے عربی اور فارسی ادب کے اثرات قبول کیے ہیں۔

آپ نے سیکھا کہ اردو ادب میں سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز مولانا حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۴) سے ہوتا ہے۔انھوں نے تین سوانح عمریاں لکھیں۔حیات سعدی (۱۸۸۶) یادگار غالب (۱۸۹۷) اور حیات جاوید (۱۹۰۱)۔علامہ شبلی نعمانی نے متعدد سوانح عمریاں لکھیں جن میں المامون (۱۸۸۷)، سیرۃ النعمان (۱۸۹۱)، الفاروق (۱۸۹۹)، الغزالی (۱۹۰۲)، سوانح مولانا روم (۱۹۰۶) اور سیرۃ النبی شامل ہے۔

آپ نے یہ بھی سیکھا کہ حالی اور شبلی نے جس اصلاحی جذبے کے تحت بزرگوں کی سوانح عمریاں لکھیں۔ان کے معاصرین میں مرزا حیرت، عبدالرزاق کان پوری، سید افتخار بلگرامی اور محمد سلیمان منصور پوری نے سوانحی ادب کو آگے بڑھایا۔یہ سلسلہ اردو ادب میں جاری و ساری ہے۔

7.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ سوانح نگاری کا تعارف اور خصوصیات بیان کیجئے؟

2۔ سوانح نگاری کے اولین نقوش پر روشنی ڈالیے۔

3۔ اردو میں سوانحی ادب کے ابتدائی نقوش کی نشاندہی کیجیے۔

4۔ حالی کی سوانح نگاری کی نمایاں خصوصیات قلم بند کیجیے۔

5۔ علامہ شبلی نعمانی کی سوانح نگاری پر مضمون لکھئے۔

7.8 سوالات کے جوابات

جواب نمبر ا: سوانح نگاری غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ سوانح کو کسی شخص کی زندگی کی تاریخ یا تحریری دستاویز کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس میں سوانح نگار کسی شخص کی زندگی کے بارے میں لکھتا ہے۔ اس صنف میں کسی شخص کی زندگی کو مختلف حقائق اور شواہد کی روشنی میں اس طرح قلم بند کیا جاتا ہے کہ اس کی زندگی کے تمام پہلو روشن ہو جائیں۔ انسان کی پیدائش سے لے کر اس کے وفات تک کی شخصیت کا اس طرح احاطہ کیا جاتا ہے کہ اس کی زندگی کے متنوع رنگ سے لوگ واقف ہوسکیں۔ سوانح نگاری کے علاوہ اردو کی بعض دیگر اصناف میں بھی سوانحی مواد شامل ہوتے ہیں۔ ان اصناف میں خودنوشت نگاری، سفرنامہ نگاری، مکتوب نگاری، آپ بیتی، خاکہ نگاری، رپورتاژ نگاری وغیرہ شامل ہیں جن سے سوانح نگار فائدہ اٹھاتا ہے۔ سوانح نگاری کی صنف کو ۱۸۵۷ کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد زیادہ فروغ ملا۔ اردو ادب میں خواجہ الطاف حسین حالی کی کتاب 'حیات سعدی' سے سوانح نگاری کے فن کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی نے اس فن کو بلندی پر پہنچایا۔

فنِ سوانح نگاری بظاہر کسی ایک شخص کی زندگی اور اس کے کارناموں پر مبنی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس شخصیت کے تناظر میں اس عہد کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ سوانح نگاری کے لیے انگریزی میں Biography کا لفظ مستعمل ہے۔ یہ دو لفظ Bio یعنی حیات اور Graphy یعنی تحریر کرنا سے مل کر بنا ہے۔ اس طرح اس لفظ کے معنی ہوئے ''تحریر کردہ زندگی کا بیان''۔

دانشورانِ ادب نے اس فن کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔

☆ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق سوانح انفرادی زندگی کی تاریخ ہے جو ادب کا ایک شعبہ ہے۔

☆ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں ایڈونڈ گوس کے مطابق سوانح زندگی کے مہمات کے ذریعہ روح کی سچی تصویر کشی ہے۔

☆ کارلائل اس صنف کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سوانح عمری ایک انسان کی مکمل زندگی ہے۔

سوانح نگاری کا فن کسی فرد واحد کی شخصیت کو منظر عام پر اس طرح لانے کا نام ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے۔ ان تعریفات کی روشنی میں سوانح کی تعریف کچھ اس طرح بیان کی جاسکتی ہے۔ کہ سوانح میں کسی شخص کی زندگی کے حالات اور واقعات کی مکمل تفصیل کے ساتھ دلکش انداز میں صداقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مواد کی فراہمی کی خاطر تمام اہم ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ایک خاص اسلوب میں بیان کیا جائے۔

جواب نمبر ۲: ابتدا میں اردو سوانح نگاری کو تاریخ کی ایک شاخ تصور کیا جاتا رہا ہے۔ سوانحی ادب میں تاریخی عنصر سچائی کی شکل میں

نمایاں رہتا ہے۔لیکن جیسے جیسے یہ فن اپنے ارتقائی مراحل سے گزرتا رہا یہ بات واضح ہوتی گئی کہ یہ تاریخ نہیں بلکہ ادب کا حصہ ہے خصوصاً تخلیقی ادب کا۔واحد متکلم راوی کی صورت میں بیانیہ کو جو آزادی میسر ہوتی ہے وہ اپنے انداز و اسلوب سے ایک الگ حیثیت اس صنف کو عطا کرتا ہے۔

سوانح نگاری کے فن کو مغرب میں زیادہ فروغ ملا۔اس کے ابتدائی نقوش یونانی اور لاطینی زبانوں میں اساطیری قصوں، پتھر کی سلوں اور بھوج پتروں میں ملتے ہیں۔یہودیوں کے یہاں سوانحی حالات وروایت باضابطہ طور پر نظر آتی ہے۔مغرب میں ہی اس فن کے باقاعدہ اصول وضوابط طے کیے گئے اور اس کی روشنی میں حقائق کو سامنے رکھ کر سوانح عمریاں تحریر کی گئیں۔یونان میں Memories of Socrates، Parallel Lives وغیرہ اہم ہیں۔جب عیسائیت کا حد درجہ فروغ حاصل ہوا تو انگلینڈ میں مذہبی اور مقصدی سوانح لکھنے کا رواج ہوا۔اس کے لیے انگریزی میں ایک خاص اصطلاح Hagiography مستعمل ہے۔اسی مقصد کے تحت ایڈمر نے سینٹ اینسلم کی سوانح لکھی۔انگلینڈ کے دورِ احیاء میں ہیرو پرستی کا رجحان عام ہوا تو انگریزی میں ولیم روپر، جارج کیونڈش، ٹامس سیراٹ اور برائیڈن نے اس نظریے کی نمائندگی کی۔

مشرقی ادب یعنی عربی و فارسی ادب میں سوانح کی ایک طویل روایت موجود ہے۔عربوں نے اس فن پر زیادہ توجہ کی۔عربی ادب میں زیادہ سوانح عمریاں مذہبی شخصیات پر لکھی گئیں۔ویسے بھی سوانح عمریوں کا ایک بڑا موضوع مذہبی شخصیات ہی رہی ہیں۔سوانح نگاری کے فروغ کا ایک اہم سبب علم حدیث ہے۔چونکہ وہ افراد جن سے احادیث مروی ہیں ان کی زندگی کے مستند حالات کی جمع و ترتیب سوانحی ادب کو فروغ دینے میں زیادہ مددگار ثابت ہوئے۔اسی کے ساتھ ساتھ عربی میں سیرت نگاری کی مستحکم روایت نے بھی اس فن کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔سیرت نگاری میں تحقیق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ایک ایک واقعہ کی تحقیق اور درست نتیجے تک پہنچنے کی جستجو ہی اس فن کا خاصہ ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عربی ادب میں موجود سیرت نگاری نے بعد میں اردو کے سوانحی ادب کے لیے ایک وسیع میدان فراہم کیا۔

جواب نمبر ۳:   اردو زبان فارسی اور عربی کے مقابلے میں زیادہ قدیم نہیں ہے۔اور اس کا ادبی سلسلہ تو چند صدیوں پر محیط ہے۔اس نے عربی اور فارسی ادب کے اثرات نہ صرف قبول کیے بلکہ ان سے استفادہ بھی کیا۔اردو میں سوانحی ادب کے ابتدائی نقوش دکنی مراثی اور مثنویوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔دکن کے اہم شعرا جن میں ملا وجہی، قلی قطب شاہ، نصرتی، غواصی اور ابن نشاطی کا نام شامل ہے۔ان کی شاعری خصوصاً مثنویوں میں سوانحی عناصر پائے جاتے ہیں۔مثنوی ابراہیم نامہ سے بادشاہ کی زندگی، اس کے معمولات اور بعض دوسری مصروفیات کا پتا چلتا ہے۔نصرتی کی مثنوی گلشن عشق سے سلطان علی عادل شاہ ثانی کے بچپن کے حالات اور نصرتی کے ساتھ اس کے لطف و کرم کا پتا چلتا ہے۔نصرتی کو شخصیت نگاری میں خاصی قدرت حاصل تھی مثنوی سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ نصرتی کے والد شاہی فوج میں اسلحہ داری کے عہدہ پر فائز تھے۔مثنوی علی نامہ سے ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے سلطان کا خاص تقرب حاصل تھا۔اس مثنوی میں بادشاہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز اس میں بعض ایسے واقعات کا ذکر بھی ہے جس سے بادشاہ کی خوش مذاقی کا اندازہ ہوتا ہے۔غواصی کی مثنویوں سے اس کی ابتدائی زندگی اور پریشاں حالی کا اندازہ ہوتا ہے۔اسی طرح ابن نشاطی کی مثنوی سے پتا چلتا ہے کہ اسے علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ''تذکرہ مخطوطات اردو'' میں سیرت و مناقب کا ایک باب قائم کیا ہے اور اس میں ان مخطوطات کی فہرست دی ہے جو رسول اکرم ﷺ کی سیرت و مناقب اور ان کے اصحاب کرام کی سیرت سے متعلق ہیں۔

اردو میں سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش تذکروں اور یادداشتوں کی شکل میں بھی ملتے ہیں۔تذکرے سوانحی مقصد سے نہیں لکھے گئے تھے لیکن اس کے باوجود ان سے شاعروں کی سیرت اور ان کی زندگی کے مختصر حالات کا پتا چلتا ہے۔بعض تذکروں میں شعرا کی شخصیت سے متعلق بعض لطیف اشارے بھی درج کئے گئے ہیں۔حالاں کہ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ تذکروں میں سوانحی حالات بہت کم ہی نظر آتے ہیں نیز اس میں ذاتی

پسند و ناپسند کا دخل بھی ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ تذکروں میں ذاتی حالات کی تفصیل مطلق نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ضمنی طور پر ان میں بعض کام کی باتیں مل جاتی ہیں۔ فارسی کی طرح اردو تذکروں میں یہ چیزیں تقریباً یکساں پائی جاتی ہیں۔ نکات الشعرا میں میر تقی میر نے شعرا کا حال لکھا ہے۔ گردیزی کے تذکرہ 'ریختہ گویاں' میں تقریباً ۱۰۰ شاعروں کے احوال قلم بند کئے گئے ہیں۔ اسی طرح قائم چاند پوری اور غلام حسین کے تذکروں میں بھی شعرا کے احوال ملتے ہیں۔ شیفتہ کا تذکرہ گلشن بے خار میں بھی سوانحی کوائف موجود ہیں۔ تذکرہ نگاری کے ضمن میں آبِ حیات کو مخصوص مقام حاصل ہے۔ اس میں محمد حسین آزاد کی انشا پرداری درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ شخصیت نگاری کے عناصر بدرجۂ اَتم موجود ہیں۔ سوانح نگاری کے اولین نقوش اور بہت سے شعرا کی ولادت اور وفات کی تاریخیں اسی سے ملتی ہیں۔ نیز تذکرے اپنے عہد کے تہذیبی، معاشرتی، علمی اور ادبی زندگی کی معلومات کا ایک اہم ذریعہ بھی ہیں۔

جواب نمبر ۴: اردو ادب میں مولانا الطاف حسین حالی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ دیگر ادبی کارناموں کے علاوہ انھوں تین سوانح عمریاں تحریر کی ہیں۔ حیات سعدی (۱۸۸۶) یادگار غالب (۱۸۹۷) اور حیات جاوید (۱۹۰۱)۔ حیاتِ سعدی کے پہلے باب میں سوانح اور دوسرے باب میں شیخ سعدی کی تصنیفات یعنی ان کے کلام جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں خاتمہ ہے۔ سوانحی حصے میں سعدی کے نام ونسب، ولادت اور بچپن کی زندگی کے علاوہ ان کی تعلیم تربیت اور سیرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ تعلیم کے لیے سعدی کو ترکِ وطن بھی کرنا پڑا۔ حیات سعدی سے پہلے سوانح عمریوں کا مقصد یادگاری یا تاریخی تھا۔ حالی نے حیات سعدی لکھ کر سوانح عمریوں کے موضوعات میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حیات سعدی کو علامہ شبلی نے دلچسپ اور محققانہ سوانح عمری قرار دیا ہے۔

'یادگار غالب' حالی کا ایک اہم سوانحی کارنامہ ہے جس میں مرزا اسداللہ خاں غالب کی زندگی اور ان کے کلام کی تعبیر وتشریح کی گئی ہے۔ حالی نے غالب کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ وہ ان کے شاگرد بھی تھے اس لیے ان کی صحبت بھی میسر تھی اور انھیں غالب سے عقیدت ومحبت بھی تھی۔ غالب کی زندگی کے ذاتی حالات بھی حالی کو معلوم تھے مگر اس کے باوجود مرزا کی تصنیفات اور دوسرے ذرائع سے غالب کے تمام حالات جمع کیے اور ایک عمدہ سوانح عمری تحریر کی۔ حالاں کہ یادگارِ غالب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں بعض پہلو تشنہ رہ گئے ہیں۔ حالی نے اختصار سے بھی کام لیا ہے۔

حیات جاوید، حالؔی کی تیسری سوانحی کتاب ہے، جو سرسید احمد کی زندگی اور ان کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ اس میں سرسید کے خاندان، معاشرت، تربیت اور ان کی زندگی کا اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کی شخصیت اپنی تمام تر بوقلمونی کے ساتھ روشن ہوجاتی ہے۔ حیات جاوید دراصل ایک ایسے شخص کی سوانح ہے جو اپنی پوری زندگی نہایت سرگرمِ عمل رہا ہے۔ اور اس کی شخصیت نے ملک وقوم کے علمی وعملی شعور کو جدید نظریات وتصورات سے روشناس کرایا۔ سرسید کی عوامی زندگی کا ایک بڑا حصہ طعن وتنقید کا شکار رہا۔ انھوں نے عوام میں تعلیم کے فروغ کے لیے باقاعدہ کوشش کی اور کالج قائم کیا۔ ان کی مخالفت اور حمایت میں دونوں طرح کے لوگ شامل تھے۔ حالؔی نے شاید اسی لیے حیات جاوید کے پہلے حصے میں سرسید کی زندگی کے تمام گوشوں کو ترتیب سے بیان کیا اور دوسرے حصے میں ان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔

جواب نمبر ۵: اردو ادب میں علامہ شبلی نعمانی بحیثیت ناقد ومورخ اور بلند پایہ انشا پرداز کے ساتھ ایک ممتاز سوانح نگار کے طور پر مقبول ومشہور ہیں۔ تاریخ سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا اور اسی لیے انھوں نے بہت سے اہم لوگوں کی سوانح لکھی ہے۔ ان میں المامون (۱۸۸۷)، سیرۃ النعمان (۱۸۹۱)، الفاروق (۱۸۹۹)، الغزالی (۱۹۰۲)، سوانح مولانا روم (۱۹۰۶) اور سیرۃ النبی شامل ہیں۔ المامون دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں عباسیوں کی تاریخ وغیرہ ہے جبکہ دوسرے حصے میں ان کے سوانحی حالات درج کئے گئے ہیں۔ مامون کی شخصیت

کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور اسے دلکش بنانے کے لیے لطائف وظرافت کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے یہ خیال بھی عام ہے کہ مامون کی بعض بے اعتدالیوں سے صرف نظر کیا گیا ہے چوں کہ شبلی کے نزدیک ہیرو کی لائف اور اس کے کارناموں کو زیادہ بیان کرنا تھا، شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں وہ سوانح نگار سے کہیں زیادہ مورخ نظر آتے ہیں۔ سیرۃ النعمان میں امام اعظم ابوحنیفہ بن ثابت کی سوانح بیان کی گئی ہے۔امام ابوحنیفہ سے خاصی عقیدت ومحبت کے باوجود شبلی نے سوانح نگاری کے اصولوں کا خیال رکھا۔ ہیرو پرستی کے بجائے ان کی کمزوریوں کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے نیز امام ابوحنیفہ سے منسوب بعض باتوں کو تحقیق کی روشنی میں غلط ثابت کیا۔

شبلی کی سوانح عمریوں میں 'الفاروق' کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب سوانحی پہلو سے بہت اہم ہے۔اس کے مواد کی فراہمی کے لیے شبلی نے روم اور شام کا سفر کیا تا کہ وہاں کی لائبریریوں سے استفادہ کر سکیں۔ پہلے حصے میں حضرت عمر فاروق کی سیرت اور شخصیت اور ان کے منفرد اوصاف کا بیان کیا گیا ہے جس سے ان کے کردار کی بلندی اور شخصیت کا تنوع نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوسرے حصے میں حضرت عمر کی فتوحات اور ان کے کارناموں خصوصاً اپنے دورِ خلافت میں ملکی انتظامات کے تئیں جو کارنامے انھوں نے انجام دیئے اس کا بیان کیا گیا ہے۔

شبلی کی تصنیف الغزالی دراصل کلامی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام غزالی کی تعمیر وتشکیل میں تصوف کا نمایاں کردار تھا۔اس سوانح کے ذریعے شبلی نے عقلی مباحث کو زیادہ پیش کیا ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے فلسفہ کو زیادہ مقبولیت ملی۔ یہ شبلی کی ایک اہم سوانح ہے جس میں امام غزالی اور ان کے کارناموں کی تفہیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔سوانح مولانا روم قیام حیدرآباد کی یادگار ہے۔اس میں مولانا روم کی مثنوی پر بحث کرتے ہوئے شبلی نے یہ ثابت کیا ہے کہ عام طور پر اسے تصوف کی کتاب تصور کیا جاتا ہے مگر درحقیقت یہ علم کلام اور عقائد کی بھی عمدہ کتاب ہے۔علم کلام کے مسائل پر شبلی کا تبصرہ ان کے عالمانہ رتبے کو بلند کرتا ہے۔

سیرۃ النبی شبلی کی آخری اور معرکتہ الآرا کتاب ہے۔اس کتاب کی صرف دو جلدیں ہی تحریر ہوئی تھیں کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ بقیہ جلدیں شبلی کے خاکے کی روشنی میں ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے تحریر کیں۔ یہ کتاب صرف نبی کریم ﷺ کی سیرت ہی نہیں ہے بلکہ ان کی مکمل زندگی کا احاطہ کرتی ہے اس میں ان کے عادات واخلاق اور سیرت وسوانح کے ساتھ ساتھ فتوحات اور جنگی مہمات کا بھی تذکرہ ہے۔ نیز کتاب کا وہ اہم حصہ بھی جس میں مستشرقین نے آنحضرت ﷺ سے متعلق جو گمراہ کن پروپیگنڈا کیا تھا اس کا مدلل جواب اور تاریخ وحقائق کی روشنی میں اس کی تردید بھی کی گئی ہے۔سیرۃ النبی شبلی کے محققانہ انداز واسلوب اور انشاپردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

7.9 فرہنگ

الفاظ	معانی
تحریر کرنا	لکھنا، قلم بند کرنا
تخیل	خیال۔وہ خیال وتصور جو کسی شے کی تخلیق کا سبب بنتا ہے
معروضی	بے لاگ، بے تعصب
تنوع	بوقلمونی۔قسم قسم کا ہونا۔رنگ برنگ کا ہونا
آمیزش	ملاوٹ
مآخذ	وہ جگہ جہاں سے کوئی چیز لی جائے۔ بنیاد۔اصل
تناظر	ایک دوسرے کو دیکھنا۔مقابلہ کرنا

نفس کشی	نفسانی خواہش کو مارنا
سراغ	نشان
لسانیات	علم زبان/زبان کے الفاظ ولغت ،صرف ونحو جاننے کا علم
عبوری	عارضی، وقتی، ہنگامی

7.10 کتب برائے مطالعہ

1۔ڈاکٹرممتاز فاخرہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا1914 تا1975، دہلی۔1984

2۔ڈاکٹر سید شاہ علی،اردو میں سوانح نگاری، کراچی۔1961

3۔رفیع الدین ہاشمی،اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔2003

4۔آنسہ الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا،اعتقاد پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔1974

5۔ڈاکٹر صبیحہ انور،اردو میں خودنوشت سوانح حیات،ایم۔آر۔پبلی کیشنز،نئی دہلی۔2021

6۔سید سلیمان ندوی،حیات شبلی،دارالمصنفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ۔2008

7۔ڈاکٹر عمر رضا،اردو میں سوانحی ادب،فن اور روایت۔کتابی دنیا، دہلی 2010

اکائی:08 حاؔلی کی سوانح نگاری (یادگارِ غالب کے حوالے سے)

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 حالی کی مختصر سوانح

8.4 حالی کی اہم سوانحی تصانیف کا تعارف

8.5 یادگارِ غالب کا خصوصی مطالعہ

8.6 آپ نے کیا سیکھا

8.7 اپنا امتحان خود لیجئے

8.8 سوالات کے جوابات

8.9 فرہنگ

8.10 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

☆ خواجہ الطاف حسین حالی کی زندگی سے واقف ہوں گے۔

☆ حالی کی سوانحی تصنیفات سے متعارف ہو سکیں گے۔

☆ حالی کی سوانحی خدمات کا جائزہ لے سکیں گے۔

☆ حالی کی سوانح نگاری کے موضوعات کا مطالعہ کر سکیں گے۔

☆ یادگارِ غالب کے موضوع غالب کی زندگی سے متعارف ہوں گے۔

☆ یادگارِ غالب کی ادبی اہمیت وتمیازات کا تعین کر سکیں گے۔

8.2 تمہید

مولانا الطاف حسین حالی اردو میں علمی نثر کے بنیاد گزار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب کی تاریخ میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ۱۸۳۷ کو حالی کی ولادت پانی پت میں خواجہ ایزد بخش انصاری کے یہاں ہوئی۔ پانی پت کرنال ضلع کا ایک تاریخی قصبہ ہے۔ مولانا حالی نے اپنے سلسلہ نسب کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا سلسلہ نسب ۲۶ واسطوں سے حضرت ایوب انصاری تک پہنچتا ہے۔ غیاث الدین بلبن کے زمانے

میں ان کے جدِامجد ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ بلبن نے حالی کے جدِاعلیٰ خواجہ ملک علی کو پانی پت میں چند عاراضی وقف کر دیے تھے۔ حالی نے ابتدائی تعلیم پانی پت میں قاری ممتاز علی سے حاصل کی اور فارسی زبان وادب کا مذاق سید جعفر علی سے سیکھا۔ عربی نحو اور عربی کی ابتدائی کتابیں حاجی ابراہیم انصاری سے پڑھیں۔ حالی نے نذیر حسین محدث ،فیض الحسن اور امیر احمد سے بھی کسب فیض کیا۔ حسین بخش مدرسہ (دلی) میں بھی حالی نے تعلیم حاصل کی۔ قیام دلی کے زمانے میں ہی انھوں نے پہلا رسالہ لکھا۔ 1857 کے ہنگاموں کے بعد جب حالی پانی پت میں تھے تو انھوں نے اپنے یہاں کے بعض مشہور علما سے حدیث، تفسیر، عربی، نظم و نثر اور منطق و فلسفہ کی بھی تعلیم حاصل کی۔

حالی کا شمار اردو کے بلند پایہ ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے تنقید، شاعری، سوانح نگاری اور مکتوب نگاری میں اپنے خوب جوہر دکھائے۔ شاعری میں بھی غزلوں کے علاوہ قطعات، رباعیات، نظمیں اور قصیدہ شامل ہیں۔ شخصی مرثیہ کو انھوں نے ایک نئی جہت دی، اور مدوجزر اسلام یعنی مسدس حالی جیسی شاہ کار نظم لکھی، جو سرسید کو بہت پسند تھی۔

حالی کا شمار اردو کے باقاعدہ پہلے سوانح نگار کے طور پر ہوتا ہے۔ حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید محض ایک شخص کی سوانح نہیں بلکہ علم وادب اور تہذیب و معاشرت کی آئینہ دار بھی ہیں۔ جس طرح ان شخصیات نے اپنے عہد اور زمانے کو متاثر کیا، حالی نے ان کی سوانح لکھ کر ایک پورے عہد کو غور وفکر کی دعوت دی۔ ان کتابوں سے اردو سوانح نگاری کے زریں نقوش وابستہ ہیں۔ اس اکائی میں ہم حالی کی سوانح نگاری اور یادگارِ غالب کے خصوصی مطالعے کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

8.3 حالی کی مختصر سوانح

خواجہ الطاف حسین حالی انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں پیدا ہوئے۔ یہ دور استعماری نظامِ حکومت کے جبر وظلم تھا۔ حالی کی ولادت ۱۸۳۷ء کو پانی پت میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام خواجہ عزت بخش انصاری تھا۔ والدہ سیدانی تھیں اور والدہ کا شجرہ نسب حضرت ابوایوب انصاری سے ملتا ہے۔ پانی پت حالی کے بزرگوں کا سات آٹھ سو سال سے وطن تھا اور یہیں ان کی پرورش اور تربیت ہوئی۔

حالی جب نو سال کے تھے تو ان کے والد خواجہ عزت بخش کا انتقال ہو گیا۔ والدہ بھی علیل رہتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد وہ بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ حالی کے بڑے بھائی امداد حسین نے ان کی پرورش و پرداخت کی۔ حالی نے ابتدائی تعلیم معاشرے میں رائج تعلیم کے مطابق ہی حاصل کی۔ انھوں نے فارسی اور عربی زبان سید جعفر علی اور ابراہیم حسین سے سیکھی جب کہ بقیہ تعلیم ذاتی طور پر اپنے شوق سے حاصل کرتے رہے۔ ان کو باقاعدگی سے علم حاصل کرنے کا موقع نصیب نہ ہو سکا۔ سترہ سال کے عمر میں ہی حالی کی شادی ان کے ماموں زاد بیٹی اسلام النساء سے ہو گئی۔ حالی اپنی شادی کے بعد کسی کو بتائے بغیر دہلی چلے آئے۔ وہاں اس دور کے ایک عالم نوازش علی سے حالی نے صرف ونحو اور منطق کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مسجدوں میں ہی رہتے ہوئے حالی نے نوازش علی کے علاوہ مولوی فیض حسن، مولوی امیر احمد اور سید نذیر حسین سے بھی فیض حاصل کیا۔ اس زمانے میں دلی میں شاعری کی فضا بہت سازگار تھی۔ حاؔلی بھی شعر کہنے لگے اور ابتدا میں اپنا تخلص خستؔہ رکھا۔ دہلی میں قیام کے دوران ان کی ملاقات مرزا غالب سے ہوئی اور وہ ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

دہلی میں قیام کے دوران انھوں نے عربی کا ایک چھوٹا سا رسالہ تصنیف کیا جس میں وہابی نقطۂ نظر کی تائید ملتی تھی جسے ان کے استاد نے جو حنفی مسلک ہونے کے سبب غصے میں آ کر پھاڑ دیا۔ ڈیڑھ سال کا وقفہ دلی میں گزارنے کے بعد حالی پانی پت واپس چلے گئے۔ ذریعہ معاش کے لیے حصار میں ملازمت کر لی۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی شروع ہو گئی اور چاروں طرف ایک ہنگامہ اور قتل و غارت گری کا ماحول گرم ہو گیا۔ جب حالات سازگار ہوئے تو حالی پھر سے دہلی آ گئے۔ جہاں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہوئی۔

شیفتہ غالب کے دوست ، جہاں گیرآباد ریاست کے رئیس تھے۔ حالؔی کے کردار اور شخصیت کو دیکھ کر انھوں نے جہاں گیرآباد میں اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ حالی نے شیفتہ سے آٹھ برس تک شاعری میں فیض حاصل کیا۔ شیفتہ چوں کہ مومن کے بھی شاگرد تھے اس طرح شیفتہ اور مومن دونوں کا ہی رنگ حالی کی شاعری میں در آیا۔ دہلی کے دورانِ قیام حالی کی ملاقات سرسید ہوئی اور جلد یہ ملاقات رفاقت میں تبدیل ہوگئی۔

حالی سرسید کے تمام افکار وتصورات سے متفق تھے لہٰذا وہ سرسید کے تعلیمی اور سماجی مشن میں شریک ہو گئے۔ اور سرسید نے بھی اس مشن کے تحت حالی سے علمی اور ادبی کام لیے۔ مسدس مد و جزر اسلام اس کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ حالی نے پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں کتابوں کی تصحیح کے لیے ملازم بھی رہے۔ جہاں وہ انگریزی سے ہونے والے اردو ترجموں کی تصحیح کرتے تھے۔ حالی انجمن پنجاب لاہور کے مشاعرے میں بھی شامل ہوئے۔ جس سے نیچرل شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ غزل گوئی کے مقابلے میں نظم نگاری کو ترقی ملی جس سے مقصدی ادب وجود میں آیا۔

حیدرآباد سے وظیفہ ملنے کے بعد حالی پانی پت منتقل ہو گئے اور وہی پر انھوں نے ساری سوانح عمریاں لکھیں۔ 1898ء میں سرسید کا انتقال ہوا تب بھی حالی سرسید کی سوانح عمری حیات جاوید لکھنے میں مصروف تھے۔ یہ تصنیف ۱۹۰۱ء میں منظرِ عام پر آئی۔ حالی کے انتقال سے دس برس قبل ۱۹۰۴ء میں انھیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔ زندگی کے آخری ایم میں وہ مستقل علیل رہنے لگے تھے اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں ہی الطاف حسین حالی کا انتقال ہو گیا۔

8.4 حالی کی اہم سوانحی تصانیف کا تعارف

حالی اردو سوانح نگاری کے بنیاد گذار ہیں۔ انھوں نے سعدی شیرازی، مرزا غالب، اور سرسید احمد خاں کی سوانح لکھی۔ حالی نے جب سوانح نگاری کے میدان میں قدم رکھا تو اس وقت تک ان کے سامنے اس صنف ادب کی کوئی با قاعدہ مثال یا روایت نہیں تھی۔ اس وقت تک جو سوانحی سلسلہ رائج تھا ان کی تین شکلیں ادب میں موجود تھیں۔ تذکرے، ملفوظات اور بزرگان دین کی تعریف وتوصیف پر مبنی سوانح۔ اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو حالی پہلے ایسے سوانح نگار ہیں جنھوں نے جدید اصولوں کی روشنی میں سوانحی ادب کی با قاعدہ بنیاد ڈالی۔ حالاں کہ یہ بات معلوم ہے کہ حالی نے اپنے لیے جن شخصیات کا انتخاب کیا ان پر لکھنا آسان نہیں تھا۔ غالب وسرسید کی شخصیت تو بعض حوالوں سے متنازع رہی ہے لیکن خود شیخ سعدی کا جس قدر شہرہ تھا اس لحاظ سے ان کی سیرت وسوانح پر مواد کی تلاش کوئی آسان کام نہ تھا۔

حیاتِ سعدی:

خواجہ الطاف حسین حالی کی پہلی سوانحی کتاب حیات سعدی (اشاعت ۱۸۸۶) ہے۔ حیات سعدی کے دیباچے میں انھوں نے سوانح نگاری سے متعلق ایسی باتیں لکھیں ہیں جس سے اس فن کے تئیں ان کے نظریے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک افادی صنف ادب ہے۔ وہ اس فن کو بزرگوں کی ایک لازوال یادگار قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس سے دنیا میں نیکی اور کمالات کو پھیلانے میں مدد ملتی ہے۔ اس نوع کے عمدہ کارنامے کو آئندہ نسلوں تک پہنچانا چاہیے۔ سوانح نگاری سے اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کا دل میں دوبارہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ حالی سوانح نگاری کے توسط سے علم، اخلاق اور نیکی کو فروغ دینا چاہتے ہیں سوانح نگاری کو حالی نیکی کرنے اور بدی سے دور رہنے کی ایک زبردست تحریک کی صورت میں بھی دیکھتے ہیں۔ یہ باتیں فن سوانح نگاری سے متعلق حالی کے نظریے کو واضح کرتی ہیں اور یہ بھی حالی کے نزدیک یہ محض علم نہیں بلکہ ایک مشن ہے۔

حالی نے لکھا ہے کہ شیخ سعدی کی تمام تر شہرت اور مقبولیت کے باوجود ان کے بارے میں جو مواد دستیاب تھا ان میں محض ان کی تعریف وتوصیف ملتی ہے۔ مگر کوئی بات ایسی نہیں ملتی جس سے ان کے کلام کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکے۔ اسی لیے حالی نے تذکروں، اس عہد کی تاریخ اور کچھ انگریزی کتابوں سے معلومات اخذ کیں۔ حیات سعدی کے پہلے باب میں سوانح اور دوسرے باب میں شیخ سعدی کی تصنیفات یعنی ان کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں خاتمہ ہے۔ سوانحی حصے میں سعدی کے نام ونسب، ولادت اور بچپن کی زندگی کے علاوہ ان کی تعلیم اور سیر وسیاحت کا ذکر کیا گیا ہے۔ تعلیم کے لیے سعدی کو ترک وطن بھی کرنا پڑا۔ سعدی کی زندگی بطور خاص ان کے اخلاق وکردار اور دانش مندی کو نہایت پرقوت انداز میں حالی نے پیش کیا ہے۔ حیات سعدی میں سوانحی حصہ کم ہے۔ اس کی وجہ دیباچے میں حالی نے بہت وضاحت سے لکھ دی ہے کہ تمام تر شہرت اور عظمت کے باوجود سعدی کے بارے میں وہ مواد دستیاب نہیں ہے جو ہونا چاہیے تھا۔ بعض ایسی باتیں جن کے بارے میں انھیں وضاحت کے ساتھ لکھنا چاہیے تھا نہیں لکھ سکے۔ سعدی کے کلام میں ہزلیات کا جو حصہ ہے اس پر حالی نے کچھ کلام نہیں کیا بلکہ ایک طرح سے اس پہلو کو نظرانداز کر دیا۔ حالی نے سعدی کو شاعر اور معلم اخلاق کے طور پر پیش کیا۔ اس طرح یہ کہنا درست ہوگا کہ انھوں نے کم مواد کے باوجود نہایت جامعیت کے ساتھ سعدی کو متعارف کرا دیا اور پہلے سوانح نگار کے طور پر اردو میں ایک صنف کی توانا بنیاد رکھی۔

یادگارِ غالب:

یادگار غالب (اشاعت ۱۸۹۷) مطالعۂ غالب کا بنیادی حوالہ ہے۔ اردو میں یہ پہلی باقاعدہ کتاب ہے، جس میں کسی شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام کی تعبیر وتشریح کی گئی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کے نزدیک اس کتاب کا اصل مقصد مرزا غالب کی شاعری کا تعارف ہے۔ حالی نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مرزا غالب کی زندگی میں ان کی شاعری اور انشا پردازی کے علاوہ کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ اور اس ایک کارنامے کو وہ دلی کے دور آخر کا ایک مہتم بالشان واقعہ سمجھتے ہیں۔ حالی مرزا غالب کو اپنی طرز کا منفرد شاعر ہی نہیں سمجھتے ہیں بلکہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ فارسی نظم ونثر کا خاتمہ بھی غالب پر ہوگیا۔

یادگار غالب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں سوانح اور دوسرے میں مرزا غالب کے ادبی کارناموں پر تبصرہ ہے۔ کتاب کا دو تہائی حصہ مرزا کے کارناموں پر ہی مشتمل ہے۔ حالی نے مرزا غالب کی زندگی سے متعلق تفصیلات کو بہت محنت اور توجہ سے جمع کیا۔ انھوں نے غالب کے خطوط، دوستوں اور عزیزوں کے بیانات اور لطائف سے اس حصے کو اہمیت کا حامل بنا دیا۔

مرزا غالب کی زندگی اور ان کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ان کے خطوط ایک اہم ذریعہ ہیں۔ انھوں نے اپنے شاگردوں اور دوستوں کو بلاتکلف خط لکھا۔ اس میں بہت سی ذاتی باتیں ہیں، جن سے غالب کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے حالی نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ حالی کے لیے ایک آسانی یہ بھی تھی کہ غالب سے ان کی نہ صرف براہ راست ملاقات تھی بلکہ دونوں ایک دوسرے سے خوب واقف تھے۔ بہت سے واقعات کے عینی شاہد تھے۔ بعض ایسی چیزیں بھی تھیں جسے انھوں نے اس زمانے کے بزرگوں سے سن رکھا تھا اس لیے حالی کے لیے غالب کی سوانح لکھنا کچھ مشکل نہ تھا اور اسی لیے انھوں نے اس کا حق بھی ادا کیا۔ یادگارِ غالب کے توسط سے حالی اپنے تمدنی ورثے اور علمی وادبی روایات سے روشناس کرانا چاہتے ہیں۔

حیات جاوید:

حالی کی تیسری اہم سوانحی کتاب 'حیات جاوید' (اشاعت ۱۹۰۱) سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو حالی نے سات برس میں مکمل کیا۔ یہ سوانح دو حصوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ سرسید کی زندگی کے حالات پر مبنی ہے، سوانحی حصہ چھ باب یعنی تقریباً

تین سوصفحات پر پھیلا ہوا ہے۔کتاب کے مجموعی صفحات کی تعدادنوسو ہے۔بقیہ حصے میں سرسید کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔سرسید سے حالی کا تعلق بہت گہرا تھا۔حالی سرسید سے بہت متاثر بھی تھے۔حالی نے سرسید کی سوانح کے لیے منشی سراج الدین کے جمع کیے ہوئے حالات،سرسید پر کرنل گریہم کی انگریزی کتاب،علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ،تہذیب الاخلاق،سرکاری رپوٹیں،مکاتیب،دوستوں کے بیانات،موافق اورمخالف رسالے نیز سیرت فریدیہ جہاں سرسید نے اپنے نانا کے ذکر میں ضمنی طور پر اپنے بچپن کا بھی ذکر کیا ہے۔بعض باتیں خودسرسید سے معلوم کر کے حالی نے ان کی ابتدائی زندگی کو پیش کیا ہے۔سرسید کی زندگی کے بیشتر واقعات کوسوانحی حصے میں شامل کیا گیا ہے۔

سوانح نگاری کے رموز سے واقفیت کے باوجود حالی جس کشمکش کا شکار تھے حیات جاوید کے دیباچے سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔یہ بات سچ ہے کہ حالی نے دیانت اورصداقت کو مجروح تو نہیں ہونے دیا مگر کتاب میں حالی کا نقطۂ نظر غالب ہے۔انھوں نے سارازورسرسید کی حمایت میں صرف کردیا ہے۔حالی نے سرسید کے کارناموں کو زیادہ بہتر انداز میں پیش کیا ہے جبکہ خامیوں کی طرف صرف اشارے کیے ہیں۔حیات جاوید سے سرسید کی انصاف پسندی،حق گوئی،انگریزی حکومت کی تعریف وتوصیف اورمغربی علوم وفنون کا بیان بہت واضح انداز میں کیا گیا ہے۔اس سوانح میں اگر کوئی چیز کھٹکتی ہےتو وہ اس کا اسلوب ہے کہ حیاتِ جاوید میں استدلالی پہلوزیادہ ہے۔یکسانیت بھی پڑھنے والوں کو کھٹکتی ہے۔ سادگی تو ہےمگر اس کا اسلوب دلکش نہیں اوراسی وجہ سے 'حیات جاوید' ایک بےلطف داستان کی طرح معلوم ہوتی ہے۔

8.5 یادگارِغالب کا خصوصی مطالعہ

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ اردوزبان وادب کے بلند پایہ شاعراورنثر نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔غالب کی شاعری اپنی تہدارمعنویت اور معنی خیزی کے سبب اردوزبان وادب کے ساتھ ہی ساتھ انھیں دوسری زبانوں میں بھی مقبول بناتی ہے۔اگر غالب کی نثر کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اردونثر کو تصنع اورطوالت سے پاک کیا۔غالب کی شاعری اورنثر دونوں میں ہی امکانات کا ایک جہان آباد ہے۔غالب کے کلام کی معنی خیزی اورمعنوی سطح انھیں اپنے عہد سے بہت آگے لے جاتی ہے۔ان کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان تو ہے ہی مستقبل کے انکشافات بھی ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ایک مختصر دیوان نے غالب کو زندہ وجاوید کردیا ہے۔اس طرح غالب شاعری اورنثر دونوں میں امکانات اور اجتہادات کے شاعراورنثر نگار کے طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی جو کہ غالب کے شاگرد تھے،غالب کے پہلے سوانح نگار بھی ہیں۔یادگارِغالب سے پہلے شیفتہ کے تذکرے 'گلشنِ بےخار' محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' اورسرسید کی 'آثارالصنادید' میں غالب کی زندگی اورکلام پر اشارے ملتے ہیں،لیکن ان میں غالب کا ذکر بہت مختصراً کیا گیا ہے۔حالی نے یادگارِغالب میں پہلی بار کسی شاعر کی زندگی اوراس کے کارناموں کو موضوع بنا کر تفصیلی تذکرہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔حالی نے سوانح نگاری کے اصولوں کا خیال رکھتے ہوئے اس صنف کواردوادب میں رائج کیا۔اسی لیے آج تک غالب کی زندگی پر یادگارِغالب سے بہتر کوئی سوانح نظر نہیں آتی ہے۔

یادگارِغالب ۱۸۹۷ء میں پہلی بار نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی تھی۔حالیؔ؛غالب کے شاگرد تھے اورانھیں ان کے ساتھ رہنے کا بھی موقع ملا تھا اس طرح حالی کو غالب کی زندگی اوران کے کلام کو سمجھنے میں بھی کافی مدد ملی۔یادگارِغالب میں حالی نے جس انداز سے ان چیزوں کو نمایاں کیا ہے اس سے قبل اور بعد میں کسی دوسری تصنیف کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا جو یادگارِغالب کو حاصل ہے۔حالی نے غالب کی شخصیت کا نہ صرف مشاہدہ کیا بلکہ ان کی زندگی کے اہم پہلوؤں عادات واطواراورسیرت کے نمائندہ اوصاف کا تجزیہ بھی کیا۔یہی چیز ان کے بنیادی ماخذ کا وسیلہ بنی۔

خواجہ الطاف حسین حالی کے نزدیک غالب کی اہمیت ان کی شاعرانہ عظمت اور ادبی حیثیت کے سبب ہے اسی لیے انھوں نے یادگارِ غالب کا پہلا حصہ جو غالب کی زندگی کے حوالے سے رقم کیا گیا بہت ہی مختصر ہے۔ایک جگہ وہ خود اس کے متعلق بیان فرماتے ہیں ''اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے میں شاعری کے اس عجیب وغریب ملکہ کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم ونثر کے پیرائے میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رندمشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف اور حبِّ اہلِ بیت کی صورت میں ظہور کرتا ہے۔ پس جو ذکران چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا اس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔

حالی نے یادگارِ غالب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا حصہ غالب کی سوانحی زندگی سے متعلق ہے، جس میں تاریخِ ولادت، خاندان، مسکن، سفرِ کلکتہ اور اہلِ کلکتہ سے مجادلہ، قیامِ لکھنؤ ملازمت سے انکار۔قید ہونا، قلعہ سے تعلق، وظیفہ، قاطع برہان اور اس کا تنازعہ اور دیگر علوم وفنون سے واقفیت سے بحث ہے۔اسی حصے کا دوسرا گوشہ مرزا کی شخصیت یعنی ان کے اخلاق وعادات، رہن سہن اور خورد ونوش پر مشتمل ہے۔اس حصے میں مرزا کے وسعتِ اخلاق، شوخیِ بیان، مروت وخودداری پر خاص زور دیا گیا ہے۔ درمیان میں چھوٹے چھوٹے مزاح سے پُر واقعات بھی پیش کئے گئے ہیں۔اردو فارسی اشعار کو ہی واقعات کے سیاق میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ مرزا غالب کے منتخب کلام اردو فارسی نظم ونثر پر ایک مکمل اور جامع تنقیدی تبصرہ ہے۔حالی نے ایران کے بلند پایہ شعرا کے کلام کا موازنہ اور تقابل بھی غالب کے کلام سے کیا ہے۔کتاب کے خاتمے پر ایک مختصر تبصرہ غالب کی حیات اور انشا پردازی سے متعلق موجود ہے۔

یادگارِ غالب میں بعض مقامات پر حالی نے غالب کی شاعری کی تفہیم وتشریح میں ان کے سوانحی حقائق سے بھی مدد لی ہے۔حالی نے غالب کے خطوط اور تصانیف کے علاوہ اردو اشعار کے ذریعہ غالب کی زندگی کے حالات کی پرتیں بھی کھولنے کی کوشش کی ہے۔اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالؔی نے غالب کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کو ان کی شاعری کے تناظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے اور ان کے شعری متون کو ان کی شخصیت اور نفسیات کی تفہیم کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔ یادگارِ غالب میں متعدد مقامات پر کبھی اشعار، کبھی خطوط یا ظریفانہ اقوال حالی نے مثال یا دلیل کے طور پر رقم کئے ہیں جو غالب کی شخصیت کو نمایاں کرتے ہیں۔مثلاً اہلِ کلکتہ سے غالب کی مخالفت اور پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے مثنوی بادِمخالف کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں۔یا قید خانے کے واقعے نے غالب کی زندگی پر جو اثر ڈالا ان کا تذکرہ غالب کے فارسی خط کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح پنشن کے سلسلے میں غالب کی بدحالی اور کسمپرسی کا ذکر کرتے ہوئے وہ فارسی خط کا اقتباس بطور حوالہ پیش کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مرزا کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے بیان کے بعد یادگارِ غالب کا دوسرا حصہ ان کی شاعری کی تفہیم وتشریح پر مبنی ہے۔اس حصے میں بھی حالی غالب کی شخصیت کی گرہیں کھولتے اور نفسیاتی مسائل کی وضاحت کرتے ہیں۔حالؔی نے تقریباً ہر جگہ عنوانات کے ساتھ ہی اشعار درج کئے ہیں جس میں غالب کی شراب اور تصوف سے حد درجہ دلچسپی، ان کا فلسفیانہ اور فکری نظام، تصور اخلاق، زندگی کے مسائل سے جدوجہد اور کشمکش، شوخی وظرافت کا اعلیٰ مذاق، کبھی حوصلہ اور کبھی قنوطیت مرزا کے نفسیاتی پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حالی کا انحصار متن پر ہی رہتا ہے اور ان کا منطقی، استدلالی اور وضاحتی اسلوب اس تصنیف کی استناد کا درجہ عطا کرتا ہے۔

حالی نے سچائی اور دیانت داری سے غالب کی تصویر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔وہ چھوٹے چھوٹے واقعات کو بیان کرکے ان کی شخصیت کو دلچسپ بنا دیتے ہیں۔انھوں نے لطائف وظرائف کی شکل میں جزئیات نگاری میں مدد لی ہے۔ان ہی جزئیات کے سب غالب کی

شخصیت مزید دلچسپ اور خوبصورت بن گئی ہے۔اس طرح حالی نے صداقت وصحت کے ساتھ ساتھ اقوال کے ساتھ امثال کو بھی سوانح میں جگہ دی ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے جہاں غالب کی شخصیت کی خصوصیات بیان کیں ہیں وہیں کمزوریوں کی جانب بھی پوری صداقت کے ساتھ اشارے کئے ہیں۔ایسی جگہوں پر انھوں نے تفصیل کی بجائے اختصار سے کام لیا ہے۔جیسے حالی نے قید کے واقعے کو تو بیان کیا ہے مگر ان کی گفتگو سے کہیں اندازہ نہیں ہوتا کہ غالب کو جوئے کے جرم میں دوبار قید میں جانا پڑا۔اسی طرح حالی نے غالب کی استادی کے معاملے میں بھی کوئی حتمی فیصلہ پیش نہیں کیا ہے۔یادگارِ غالب میں واقعات اور تواریخ کی ترتیب میں بھی تسامحات ملتے ہیں۔برہان قاطع کے معاملے کا بھی حالی نے تفصیل سے ذکر نہیں کیا ہے۔اسی طرح غالب کے بچپن اور معاشقے اور جنسی وخانگی زندگی کا ذکر نہیں ملتا۔لہٰذا یہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یادگارِ غالب ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک ہے البتہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کے باوجود بھی یادگارِ غالب اردو کی بلند پایہ سوانح ہے۔

یادگارِ غالب کے دوسرے حصے یعنی غالب کے کارناموں کے باب کا مطالعہ کریں تو غالب شناسی کا ایک نیا دور قائم ہوتا ہے۔اس حصے میں عملی تنقید کے بہترین نمونے ملتے ہیں جن سے کلامِ غالب کی ندرت، دقت پسندی، شوخی وظرافت، تفکری وتعقلی نقطۂ نظر، معنی آفرینی، مختلف النوع مضامین کی موجودگی، تخلیقی استعاروں، تمثیلوں اور اچھوتی تشبیہوں کی کارفرمائی پر اردو تنقید کے باب میں پہلی بار بحث ملتی ہے۔جس کا انداز تشریحی اور توضیحی ہے۔حالی کے اس سوانحی کارنامے کی اہمیت اس لیے بھی برقرار ہے کہ اس سے غالب کی شاعری کی تفہیم وتعبیر سے عملی تنقید میں نئی نئی راہیں ہموار ہوتی گئیں اور غالب شناسی کے باب اضافہ ہوتا گیا۔

اس بات سے انکار نہیں کہ غالب کی شخصیت اور شاعرانہ قدرومنزلت کو حالی کے بعد جدید تحقیق وتنقید کے اصولوں اور سوانح نگاری کے فن کے پیش نظر زیادہ گہرائی سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔لیکن اس طرح کی تمام تر کوششوں کو یادگارِ غالب کی توسیع کہنا چاہیے۔کیوں کہ ہر مصنف کو غالب پر تحریر کرتے ہوئے اسے یادگارِ غالب کو سامنے رکھنا ہی ہوگا۔یادگارِ غالب کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ حالی نے صرف اپنے موضوع کی ہی وضاحت کی ہے۔اس میں مصنف کا کسی طرح کا کوئی دخل نظر نہیں آتا ہے۔حالی کے اس سوانحی کارنامے کی ایک اہم خوبی اس کا اندازِ بیان ہے۔اس کا سادہ اور عام فہم لہجہ قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔مگر غالب جیسی گونا گوں صفات کی حامل شوخ، ظریف اور دلچسپ شخصیت کا اظہار سیدھے سادے لفظوں میں ممکن نہ تھا۔غالب کی شخصیت کو بیان کرنے میں حالی نے بے ساختہ اسلوبِ بیان کا سہارا لیا۔جس کے سبب موضوع/ غالب کی شخصیت پوری طرح روشن ہو جاتی ہے۔

7.6 آپ نے کیا سیکھا

آپ سب خواجہ الطاف حسین حالی کی حالاتِ زندگی سے واقف ہوئے۔آپ نے مطالعہ کیا کہ حالی کی پیدائش کہاں ہوئی، ان کی تعلیم وتربیت میں کن کن لوگوں کا دخل رہا۔پانی پت سے دہلی تک وہ کن کن اساتذہ کے طالب علم رہے۔انھون نے کہاں کہاں نوکریاں کیں، کس سے اور کب ان کی شادی ہوئی وغیرہ۔

آپ نے جانا کہ حالی اردو کے پہلے سوانح نگار ہیں جنھوں نے کسی شخصیت کا مکمل طور سے جائزہ لیا۔حالی نے تین سوانح عمریاں لکھیں۔حیات سعدی (۱۸۸۶)، جو شیخ سعدی کی زندگی اور ان کے کارناموں پر مبنی ہے۔یادگار غالب (۱۸۹۷)، جو مرزا غالب کی حالاتِ زندگی، شخصیت اور ان کی شاعری کی تفہیم وتشریح پر مبنی ہے۔تیسری کتاب حیات جاوید (۱۹۰۱)، جس میں سرسید احمد خان کی زندگی اور ان کے کارناموں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

یادگارِ غالب کے تفصیلی مطالعے کے ذریعہ آپ سب نے اس کی ادبی اہمیت کو سمجھا اوراس امتیازات سے واقف ہوئے۔آپ نے یہ بھی جانا کہ اس کتاب میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں اور کمزوریاں بھی رہ گئیں ہیں۔جن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

8.7 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ حالی کی حالاتِ زندگی پر ایک نوٹ قلم بند کیجئے؟

2۔ حیاتِ سعدی کا مختصر تعارف پیش کیجئے؟

3۔ یادگارِ غالب کا مختصر تعارف بیان کیجئے؟

4۔ حیاتِ جاوید کا مختصر تعارف لکھئے؟

5۔ یادگارِ غالب کی روشنی میں حالی کی سوانح نگاری کے امتیازات کی نشاندہی کیجئے؟

8.8 سوالات کے جوابات

جواب نمبرا: خواجہ الطاف حسین حالی انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں پیدا ہوئے۔یہ دوراستعماری نظامِ حکومت کے جبر وظلم تھا۔حالی کی ولادت ۱۸۳۷ء کو پانی پت میں ہوئی۔ان کے والد کا نام خواجہ عزت بخش انصاری تھا۔والدہ سیدانی تھیں اور والدہ کا شجرہ نسب حضرت ابو ایوب انصاری سے ملتا ہے۔پانی پت حالی کے بزرگوں کا سات آٹھ سو سال سے وطن تھا اور یہیں ان کی پرورش اور تربیت ہوئی۔

حالی جب نو سال کے تھے تو ان کے والد خواجہ عزت بخش کا انتقال ہوگیا۔والدہ بھی علیل رہتی تھیں۔کچھ عرصے بعد وہ بھی اس دارِفانی سے کوچ کر گئیں۔حالی کے بڑے بھائی امداد حسین نے ان کی پرورش و پرداخت کی۔حالی نے ابتدائی تعلیم معاشرے میں رائج تعلیم کے مطابق ہی حاصل کی۔انھوں نے فارسی اور عربی زبان سید جعفر علی اور ابراہیم حسین سے سیکھی جب کہ بقیہ تعلیم ذاتی طور پر اپنے شوق سے حاصل کرتے رہے۔ان کو باقاعدگی سے علم حاصل کرنے کا موقع نصیب نہ ہوسکا۔سترہ سال کے عمر میں ہی حالی کی شادی ان کے ماموں زاد بیٹی اسلام النساء سے ہوگئی۔حالی اپنی شادی کے بعد کسی کو بتائے بغیر دہلی چلے آئے۔وہاں اس دور کے ایک عالم نوازش علی سے حالی نے صرف ونحو اور منطق کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔مسجدوں میں ہی رہتے ہوئے حالی نے نوازش علی کے علاوہ مولوی فیض حسن، مولوی امیر احمد اور سید نذیر حسین سے بھی فیض حاصل کیا۔اس زمانے میں دلی میں شاعری کی فضا بہت سازگار تھی۔حالؔی بھی شعر کہنے لگے اور ابتدا میں اپنا تخلص خستؔہ رکھا۔دہلی میں قیام کے دوران ان کی ملاقات مرزا غالب سے ہوئی اور وہ ان کے تلامذہ میں شامل ہوگئے۔

دہلی میں قیام کے دوران انھوں نے عربی کا ایک چھوٹا سا رسالہ تصنیف کیا جس میں وہابی نقطۂ نظر کی تائید ملتی تھی جسے ان کے استاد نے جو حنفی مسلک ہونے کے سبب غصے میں آکر پھاڑ دیا۔ڈیڑھ سال کا وقفہ دلی میں گزارنے کے بعد حالی پانی پت واپس چلے گئے۔ذریعہ معاش کے لیے حصار میں ملازمت کرلی۔کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی جدو جہد آزادی شروع ہوگئی اور چاروں طرف ایک ہنگامہ اور قتل و غارت گری کا ماحول گرم ہوگیا۔جب حالات سازگار ہوئے تو حالی پھر سے دہلی آگئے۔جہاں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہوئی۔شیفتہ غالب کے دوست، جہاں گیرآباد ریاست کے رئیس تھے۔حالؔی کے کردار اور شخصیت کو دیکھ کر انھوں نے جہاں گیرآباد میں اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کردیا۔حالی نے شیفتہ سے آٹھ برس تک شاعری میں فیض حاصل کیا۔شیفتہ چوں کہ مومن کے بھی شاگرد تھے اس طرح شیفتہ اور مومن دونوں کا ہی رنگ حالی کی شاعری میں درآیا۔دہلی کے دورانِ قیام حالی کی ملاقات سرسید ہوئی اور جلد یہ ملاقات رفاقت میں تبدیل ہوگئی۔

حالی سرسید کے تمام افکار وتصورات سے متفق تھے لہٰذا وہ سرسید کے تعلیمی اور سماجی مشن میں شریک ہو گئے۔ اور سرسید نے بھی اس مشن کے تحت حالی سے علمی اور ادبی کام لیے۔ مسدس مد و جزر اسلام اس کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ حالی نے پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں کتابوں کی تصحیح کے لیے ملازم بھی رہے۔ جہاں وہ انگریزی سے ہونے والے اردو ترجموں کی تصحیح کرتے تھے۔ حالی انجمن پنجاب لاہور کے مشاعرے میں بھی شامل ہوئے۔ جس سے نیچرل شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ غزل گوئی کے مقابلے میں نظم نگاری کو ترقی ملی جس سے مقصدی ادب وجود میں آیا۔

حیدرآباد سے وظیفہ ملنے کے بعد حالی پانی پت منتقل ہو گئے اور وہیں پر انھوں نے ساری سوانح عمریاں لکھیں۔ 1898ء میں سرسید کا انتقال ہوا تب بھی حالی سرسید کی سوانح عمری حیات جاوید لکھنے میں مصروف تھے۔ یہ تصنیف ۱۹۰۱ء میں منظرِ عام پر آئی۔ حالی کے انتقال سے دس برس قبل ۱۹۰۴ء میں انھیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ مستقل علیل رہنے لگے تھے اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں ہی الطاف حسین حالی کا انتقال ہو گیا۔

جواب نمبر ۲: اردو ادب میں مولانا الطاف حسین حالی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ دیگر ادبی کارناموں کے علاوہ انھوں تین سوانح عمریاں تحریر کی ہیں۔ حیات سعدی (۱۸۸۶) یادگار غالب (۱۸۹۷) اور حیات جاوید (۱۹۰۱)۔ حیاتِ سعدی کے پہلے باب میں سوانح اور دوسرے باب میں شیخ سعدی کی تصنیفات یعنی ان کے کلام جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں خاتمہ ہے۔ سوانحی حصے میں سعدی کے نام ونسب، ولادت اور بچپن کی زندگی کے علاوہ ان کی تعلیم تربیت اور سیرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ تعلیم کے لیے سعدی کو ترکِ وطن بھی کرنا پڑا۔ حیات سعدی سے پہلے سوانح عمریوں کا مقصد یادگاری یا تاریخی تھا۔ حالی نے حیات سعدی لکھ کر سوانح عمریوں کے موضوعات میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حیات سعدی کو علامہ شبلی نے دلچسپ اور محققانہ سوانح عمری قرار دیا ہے۔

جواب نمبر ۳: 'یادگار غالب' حالی کا ایک اہم سوانحی کارنامہ ہے جس میں مرزا اسداللہ خاں غالب کی زندگی اور ان کے کلام کی تعبیر وتشریح کی گئی ہے۔ حالی نے غالب کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ وہ ان کے شاگرد بھی تھے اس لیے ان کی صحبت بھی میسر تھی اور انھیں غالب سے عقیدت ومحبت بھی تھی۔ غالب کی زندگی کے ذاتی حالات بھی حالی کو معلوم تھے مگر اس کے باوجود مرزا کی تصنیفات اور دوسرے ذرائع سے غالب کے تمام حالات جمع کیے اور ایک عمدہ سوانح عمری تحریر کی۔ حالاں کہ یادگارِ غالب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں بعض پہلو تشنہ رہ گئے ہیں۔ حالی نے اختصار سے بھی کام لیا ہے۔

جواب نمبر ۴: حیات جاوید، حالؔی کی تیسری سوانحی کتاب ہے، جو سرسید احمد کی زندگی اور ان کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ اس میں سرسید کے خاندان، معاشرت، تربیت اور ان کی زندگی کا اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کی شخصیت اپنی تمام تر بوقلمونی کے ساتھ روشن ہو جاتی ہے۔ حیات جاوید دراصل ایک ایسے شخص کی سوانح ہے جو اپنی پوری زندگی نہایت سرگرمِ عمل رہا ہے۔ اور اس کی شخصیت نے ملک وقوم کے علمی و عملی شعور کو جدید نظریات وتصورات سے روشناس کرایا۔ سرسید کی عوامی زندگی کا ایک بڑا حصہ طعن وتنقید کا شکار رہا۔ انھوں نے عوام میں تعلیم کے فروغ کے لیے باقاعدہ کوشش کی اور کالج قائم کیا۔ ان کی مخالفت اور حمایت میں دونوں طرح کے لوگ شامل تھے۔ حالؔی نے شاید اسی لیے ''حیات جاوید'' کے پہلے حصے میں سرسید کی زندگی کے تمام گوشوں کو ترتیب سے بیان کیا اور دوسرے حصے میں ان کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔

جواب نمبر ۵: یادگار غالب (اشاعت ۱۸۹۷) مطالعۂ غالب کا بنیادی حوالہ ہے۔ اردو میں یہ پہلی باقاعدہ کتاب ہے، جس میں کسی شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام کی تعبیر وتشریح کی گئی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کے نزدیک اس کتاب کا اصل مقصد مرزا غالب کی شاعری

کا تعارف ہے ۔ حالی نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مرزا غالب کی زندگی میں ان کی شاعری اور انشا پردازی کے علاوہ کوئی کارنامہ نہیں ہے۔اوراس ایک کارنامے کو وہ دلی کے دورآخر کا ایک مہتم بالشان واقعہ سمجھتے ہیں۔حالی مرزا غالب کو اپنی طرز کا منفرد شاعر ہی نہیں سمجھتے ہیں بلکہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ فارسی نظم ونثر کا خاتمہ بھی غالب پر ہوگیا۔

یادگار غالب دوحصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلے حصے میں سوانح اور دوسرے میں مرزا غالب کے ادبی کارناموں پر تبصرہ ہے ۔کتاب کا دو تہائی حصہ مرزا کے کارناموں پر ہی مشتمل ہے۔ حالی نے مرزا غالب کی زندگی سے متعلق تفصیلات کو بہت محنت اورتوجہ سے جمع کیا۔ انھوں نے غالب کے خطوط،دوستوں اورعزیزوں کے بیانات اور لطائف سے اس حصے کواہمیت کا حامل بنادیا۔

مرزا غالب کی زندگی اوران کے مزاج کو سمجھنے کے لیےان کے خطوط ایک اہم ذریعہ ہیں ۔انھوں نے اپنے شاگردوں اور دوستوں کو بلا تکلف خط لکھا۔اس میں بہت سی ذاتی باتیں ہیں،جن سے غالب کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے حالی نے اس سے فائدہ اٹھایا۔حالی کے لیے ایک آسانی یہ بھی تھی کہ غالب سے ان کی نہ صرف براہ راست ملاقات تھی بلکہ دونوں ایک دوسرے سے خوب واقف تھے۔ بہت سے واقعات کے عینی شاہد تھے۔بعض ایسی چیزیں بھی تھیں جسے انھوں نے اس زمانے کے بزرگوں سے سن رکھا تھا اس لیے حالی کے لیے غالب کی سوانح لکھنا کچھ مشکل نہ تھا اوراسی لیے انھوں نے اس کا حق بھی ادا کیا۔ یادگارِ غالب کے توسط سے حالی اپنے تمدنی ورثے اور علمی وادبی روایات سے روشناس کرانا چاہتے ہیں۔اس جواب کے مزید مطالعے کے لیے 8.7 دیکھیے۔

8.9 فرہنگ

الفاظ	معانی
استعداد	فطری قابلیت،صلاحیت
افادی	فائدہ مند،نفع بخش
پژمردہ دل	جس کا دل افسردہ ہو،اداس،رنجیدہ
فرنگ	انگریز
ازالہ	دور کرنا،الگ کرنا
بزم عیش	خوشی کی مجلس،راگ ورنگ کا جلسہ
رندانہ	رند کی طرح،رندی سے نسبت رکھنے والا
انشا پرداز	مضمون نگار،ادیب،نثر لکھنے والا
تحریر کرنا	لکھنا،قلم بند کرنا
بذلہ سنجی	لطیفہ گوئی،خوش طبعی
تعمیمی	عمومی،عام انداز کی
استدلال	دلیل پیش کرنا،سندلانا
مآخذ	وہ جگہ جہاں سے کوئی چیز لی جائے۔بنیاد۔اصل
نیچرل	فطری،قدرتی

متنوع	قسم قسم کا، مختلف نوع
انتشار	بکھراؤ، پریشانی
اضطراب	بے چینی
اتالیق	معلم، استاد

8.10 کتب برائے مطالعہ

1۔ڈاکٹرممتاز فاخرہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا1914 تا1975، دہلی۔1984

2۔ڈاکٹرسید شاہ علی، اردو میں سوانح نگاری، کراچی۔1961

3۔ مولانا الطاف حسین حالی، یادگار غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ۔1986

4۔مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔1979

5۔آنسہ الطاف فاطمہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔1974

6۔ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خودنوشت سوانح حیات، ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی۔2021

7۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔2008

8۔ڈاکٹر عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب، فن اور روایت۔کتابی دنیا، دہلی2010

اکائی:09 شبلی کی سوانح نگاری (الفاروق کے حوالے سے)

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 شبلی کی سوانح نگاری

9.4 شبلی کی اہم سوانحی تصانیف کا تعارف

9.5 سوانح الفاروق کا خصوصی مطالعہ

9.6 آپ نے کیا سیکھا

9.7 اپنا امتحان خود لیجئے

9.8 سوالات کے جوابات

9.9 فرہنگ

9.10 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- ☆ علامہ شبلی نعمانی کی زندگی سے واقف ہوں گے۔
- ☆ شبلی کی سوانحی تصنیفات سے متعارف ہوسکیں گے۔
- ☆ شبلی کی سوانحی خدمات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ☆ شبلی کی سوانح نگاری کے موضوعات کا مطالعہ کرسکیں گے۔
- ☆ سوانح الفاروق کے موضوع غالب کی زندگی سے متعارف ہوں گے۔
- ☆ سوانح الفاروق کی ادبی اہمیت وتمیازات کا تعین کرسکیں گے۔

9.2 تمہید

علامہ شبلی کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت اردو اور فارسی زبان کے شاعر، نظم گو اور غزل گو، ادیب، مورخ سوانح نگار اور سیرت نگار، ناقد اور محقق، انشاء پرداز، مضمون نگار اور سفر نامہ نگار تھے۔ ان کی اس متنوع اور ہمہ گیر صلاحیتوں کا زمانہ معترف ہے۔ شبلی کا شمار اردو کے ممتاز سوانح نگاروں میں ہوتا ہے۔ تاریخ سے ان کو خاص شغف تھا۔ ایک مورخ کے طور پر ان کی خاص شناخت ہے۔ ان کے

موضوعات تاریخی اور مذہبی دونوں ہیں ۔شبلی کی سوانح عمریوں کوتاریخ وسوانح نگاری کے گہرے تعلق کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے بلکہ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ شبلی نے تاریخ میں سوانح عمری کا لطف پیدا کر دیا ہے۔شبلی کی سوانح عمریاں غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرتی ہیں اور انھوں نے کوشش کی ہے کہ مستشرقین نے جن غلط فہمیوں کو عام کیا تھا ان کی نہ صرف تحقیق کی جائے بلکہ حقیقت کو پیش کیا جائے۔ان کی بیشتر سوانح عمریوں میں یہ پہلو نمایاں ہے۔انھوں نے جن شخصیات کو اس موضوع کے لیے منتخب کیا وہ اپنی خدمات اور علم وفضل کے اعتبار سے ایک ہیرو کی حیثیت رکھتی تھیں۔ علامہ شبلی نے نامور فرماروایان اسلام اور ناموران اسلام کے نام سے دوسلسلہ شروع کیا تھا بیشتر سوانحی کتابیں اسی سلسلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی اور دلکش اسلوب نے شبلی کی سوانحی کتابوں کو دلچسپ علمی مشغلہ کی شکل دے دی تھی۔شبلی نے متعدد سوانح عمریاں لکھیں جن میں المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی شامل ہیں۔اس اکائی میں ہم شبلی نعمانی کی سوانح نگاری کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

9.3 شبلی کی مختصر سوانح

علامہ شبلی کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔4 جون 1857ء کو موضع بندول، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد شیخ حبیب اللہ اس دیار کے مشہور زمینداروں اور وکلا میں شمار ہوتے تھے۔ابتدائی تعلیم مولوی شکراللہ اور حکیم عبداللہ سے حاصل کی۔مزید تعلیم کے لیے مدرسہ چشم رحمت غازی پور گئے۔جہاں مولانا فاروق چریا کوٹی کے سامنے تلمذ تہہ کیا۔کچھ دنوں جون پور کے ایک مدرسے میں زیر تعلیم رہے۔ فقہ کی تعلیم مولانا ارشاد حسین رامپوری سے حاصل کی۔لاہور جا کر مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے عربی ادب میں استفادہ کیا۔مولانا محمد علی محدث سہارنپوری نے علم حدیث میں استعداد بہم پہنچائی۔19 سال کی عمر میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔شبلی کے والد انھیں وکیل بنانا چاہتے تھے، شبلی اس میں کامیاب بھی ہوئے لیکن وکالت کا پیشہ ان کی طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔مناظرہ شبلی کا پسندیدہ شغل رہا۔دور دور تک مناظرہ کے لیے گئے۔شبلی کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی 1881 میں سرسید سے ملاقات کے بعد رونما ہوئی۔۱۸۸۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی خالی جگہ پر انھوں نے ملازمت کے لیے درخواست دی اور علی گڑھ پہنچ کر خان بہادر محمد کریم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ کے مکان پر قیام پذیر ہوئے۔اس طرح جنوری ۱۸۸۳ء کے آخری تاریخوں میں شبلی کا عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تقرر ہو گیا۔علی گڑھ میں شبلی کا قیام تقریباً ۱۶ر برس تک رہا۔اس دوران انھوں نے مختلف علوم سے واقفیت حاسل کی، مغربی ادب کا مطالعہ کیا، جدید دور کے ساجی، تہذیبی، علمی وادبی امور سے روشناس ہوئے، تحریر اور تصنیف کے ضابطوں اور تقاضوں سے واقف ہوئے۔غرض علی گڑھ کی علمی وادبی فضا، دیگر اساتذہ کرام بالخصوص سرسید کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک مورخ اور عمدہ سوانح نگار بنے، ایک ماہر خطیب اور مصنف کی حیثیت ان کو حاصل ہوئی۔اردو کے اہم ناقد اور شاعر وادیب کہلائے یعنی یوں کہیں کہ ان برکات وفیوض کے نتیجے میں علامہ بنے اور شمس العلماء کے خطاب سے نوازے گئے۔

۱۸۹۶ء میں شبلی نے حیدرآباد کا سفر کیا۔ستمبر ۱۸۹۶ء میں نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں کی حکومت سے سو روپے ماہوار کا وظیفہ ان کے نام سے جاری ہو گیا۔اور اس طرح ان کا تعلق علی گڑھ سے برائے نام رہ گیا۔۱۸۹۸ء میں شبلی نے علی گڑھ کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اپریل ۱۹۰۵ء میں شبلی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم کے عہدے پر فائز ہوئے لہٰذا انھیں لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ندوہ سے وابستگی ۱۹۱۳ء تک برقرار رہی جس دوران انھوں نے ندوۃ العلماء کی ترقی اور نصاب کی اصلاح، جدید نصاب کی تیاری، انگریزی تعلیم کی بطور خاص شمولیت، ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا اختیاری زبان کے طور پر حصول، جدید عربی زبان میں تحریر وتقریر کی صلاحیت پر بطور خاص زور، تصنیف و

تالیف کے لیے باصلاحیت طلباء کی جماعت کا انتخاب اور انھیں اس کام کے لیے تیار کرنا جیسے کارہائے نمایاں انجام دیے۔شبلی نے بعض اختلافات کے سبب جولائی ۱۹۱۳ء میں معتمدی سے استعفیٰ دے دیا اور ندوۃ سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

۱۹۱۴ء میں شبلی کے چھوٹے بھائی محمد اسحاق وکیل الہ آباد ہائی کورٹ کا چند روز کی علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔شبلی کے لیے یہ صدمہ بے حد اندوہ ناک تھا۔اس دوران شبلی سیرۃ النبی کی تصنیف میں مشغول تھے۔وہ ہر طرف سے کنارہ کشی اختیار کرکیف اعظم گڑھ واپس چلے آئے۔ ان کا ارادہ اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کو قائم کرنے کا تھا۔ابھی یہ ادارہ ابتدائی مراحل میں ہی تھا کہ شبلی کا ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال ہوگیا۔

علی گڑھ، ندوۃ العلما کی تعلیمی و تدریسی زندگی میں شبلی کا نمایاں کردار رہا ہے۔تعلیم و تعلم سے ان کا شوق اور ذہنی ہم آہنگی قابل رشک تھی۔متعدد تعلیمی اداروں کے نصابات،اساتذہ اور طلبہ کے لیے تعلیمی ضابطے انھوں نے تیار کیے۔اور ندوۃ العلما کی شکل میں اپنا ایک واضح تعلیمی نظریہ بھی پیش کیا۔''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' ان کا وہ شہرۂ آفاق مقالہ تھا۔جو 1887 میں لکھنؤ کی شاہی بارہ دری میں پیش کیا گیا تھا۔بقول سید سلیمان ندوی 'اسی مطلع سے شبلی کی شہرت کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا'۔

شبلی کی تصنیفی زندگی کا آغاز 1880 سے ہی ہو چکا تھا۔مؤرخ، سیرت نگار، محقق اور شاعر و ادیب کی حیثیت سے انھوں نے گراں قدر کارنامے انجام دیئے۔شبلی مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔فن سوانح نگاری کا آغاز اگرچہ حالی نے کیا تھا مگر اس فن کو شبلی کے قلم نے زیادہ اہمیت کا حامل بنا دیا۔المامون، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرت النبی علامہ شبلی نعمانی کے علمی شاہ کار اور سوانحی ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

9.4 شبلی کی اہم سوانحی تصانیف کا تعارف

علامہ شبلی نعمانی نے متعدد سوانح عمریاں لکھیں جن میں المامون (۱۸۸۷)، سیرۃ النعمان (۱۸۹۱)، الفاروق (۱۸۹۹)، الغزالی (۱۹۰۲)،سوانح مولانا روم (۱۹۰۶) اور سیرۃ النبی شامل ہیں۔

المامون:

المامون شبلی کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے جو ۱۸۸۸ء میں منظرِ عام پر آئی۔سوانح المامون معروف سیاست داں اور عباسی خلیفہ 'مامون رشید' کی حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں پر مشتمل ہے۔کتاب کی ابتدا میں شبلی نے اس کے تحریر کئے جانے کے متعلق بیان کرتے ہوئے تاریخ کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا ہے اور اسی کے تحت بعض اصولی باتوں پر روشنی ڈالی ہے۔پہلا حصہ مامون رشید کی ابتدائی زندگی، تعلیم و تربیت، تخت نشینی اور فتوحات کے ذکر اور واقعات کے بیان پر مشتمل ہے۔دوسرا حصہ مامون رشید کے کارناموں پر مشتمل ہے۔

شبلی نے مامون رشید کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور اسے دلکش بنانے کے لیے لطائف و ظرافت کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔شبلی نے المامون کے بیان میں مامون کی زندگی کو نہایت مرتب انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری پر اس کی زندگی کی تمام تصویریں ظاہر ہو جاتی ہیں۔امین و مامون کی کش مکش بھی تاریخی حوالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔مامون رشید کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں کو بھی واضح کیا گیا ہے۔شبلی نے جہاں مامون رشید کے کمالات اور دلیری کا ذکر کیا ہے تو وہیں اس کی بعض بے اعتدالیوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ایک طرف جہاں وہ ''اہل کمال کے ساتھ علمی بحثیں کرتا ہے تو دوسری طرف بزم عیش میں رندانہ وضع بیٹھتا ہے۔'' المامون کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ سرسید نے لکھا۔سرسید نے شبلی کی جزئیات نگاری کی داد دی۔انھوں نے لکھا کہ دلچسپ واقعات کے سبب تاریخی حصہ بھی نہایت دلچسپ

ہو گیا ہے۔شبلی کی یہ سوانح عمری نامور فرمارواِیان اسلام کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

سیرۃ النعمان:

سیرۃ النعمان (۱۸۹۱)امام ابوحنیفہ بن کی سوانح عمری ہے۔امام ابوحنیفہ سے شبلی کی عقیدت ومحبت جگ ظاہر ہے۔ان کے نام کا جز نعمانی اسی عقیدت کا غماز ہے۔عربی،فارسی اور ترکی زبان میں اس وقت تک امام ابوحنیفہ کی متعدد سوانح عمریاں لکھی جا چکی تھیں۔شبلی نے سیرۃ النعمان کے ابتدائی صفحات میں اس کا ذکر کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی سوانح عمریاں اس کثرت سے لکھی گئیں ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔شبلی نے ان کتابوں کی فہرست بھی پیش کی ہے جو امام ابوحنیفہ کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔سیرۃ النعمان دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں امام ابوحنیفہ کے نام ونسب،سیرت وشخصیت،درس وافتا،شادی کی تفصیل،مناظرے،علمی مجلسیں،فقہی مسائل اور اخلاق وعادات کو پیش کیا گیا ہے۔شبلی امام ابوحنیفہ کے عقیدت مند تھے مگر اس کے باوجود انھوں نے فنی تقاضوں کا پورا خیال رکھا ہے۔بہت سے خوش اعتقادی کے ایسے واقعات جو امام صاحب سے منسوب تھے شبلی نے حقائق کی روشنی میں جب ان کا جائزہ لیا تو وہ ثابت نہیں ہو سکے۔

شبلی نے ایک طرف جہاں ان کی عبادت وریاضت کو پیش کیا تو دوسری طرف یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بہت خوش مزاج اور سلیم الطبع انسان تھے۔اخلاق وکردار کی بلندی کے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں۔سوانحی حصے میں شبلی کی جزئیات نگاری ان کے تحقیقی نقطۂ نظر کی آئینہ دار کہی جاسکتی ہے۔سیرۃ النعمان امام ابوحنیفہ کی سیرت وشخصیت پر ایک نہایت کارآمد کتاب ہے جس میں سوانحی ادب کے اصول وضوابط بروئے کار لائے گئے ہیں۔ترتیب وتہذیب اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے بھی یہ شبلی کا عمدہ کارنامہ ہے۔

الفاروق:

الفاروق کا شمار اردو کی اہم سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔یہ کتاب ۱۸۹۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔علامہ شبلی کے بقول اس کتاب کا غلغلہ اس کے وجود میں آنے سے پہلے پورے ہندستان میں بلند ہو چکا تھا۔شبلی نے جو سوانحی سلسلہ شروع کیا تھا اس میں سیرۃ النعمان کے بعد یہ ایک اہم سوانح ہے۔اس کتاب کی مقبولیت بھی اس کے اہم ہونے کی ایک دلیل ہے۔موضوع سے مصنف کی ذاتی دلچسپی اور مواد کی تعمیر وتشکیل کی وجہ سے بھی یہ شبلی کی تصانیف میں فوقیت رکھتی ہے۔الفاروق کے مواد کی فراہمی کے لیے شبلی نے روم ومصر وشام کے بیشتر کتب خانے چھان ڈالے۔۱۸۹۹ میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔شبلی نے اپنی تمام کتابوں میں مراجع ومصادر کا خاص اہتمام کیا ہے مگر الفاروق میں یہ اہتمام مزید بلند درجے تک پہنچ گیا ہے۔حضرت عمرؓ کی سیرت وشخصیت جس بلند پایہ کی تھی اور ان کے کمالات کا جو تنوع تھا اسے دیکھتے ہوئے ان پر لکھنے کے لیے شبلی جیسے مصنف کی ہی ضرورت تھی۔الفاروق دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں تمہید کے علاوہ حضرت عمرؓ کی ولادت سے وفات تک کے واقعات اور فتوحات ملکی کے حالات ہیں،دوسرے حصے میں ان کے ملکی اور مذہبی انتظامات اور علمی کمالات اور ذاتی اخلاق اور عادات کی تفصیل ہے۔شبلی نے حضرت عمر کو ایک فاتح اور بلند پایہ منتظم اور مدبر کے طور پر پیش کیا ہے وہیں یہ بھی دکھایا ہے کہ حضرت عمر شعر وادب کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔عرب کے مشہور شعرا کا اکثر کلام انھیں یاد تھا۔

الفاروق میں بڑی عظیم شخصیات کا بھی ذکر ہے اور ان کے درمیان سے حضرت عمرؓ کی سیرت وشخصیت کو اس طرح نمایاں کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے پر حرف بھی نہ آئے۔ایک مشکل کام کو فنی سربلندی کے ساتھ نہایت عمدہ طریقے سے شبلی نے انجام دیا ہے۔حضرت عمر کی ابتدائی زندگی سے ہی پیارے نبی ﷺ،حضرت ابوبکر صدیق،حضرت عثمان،حضرت علی،خالد بن ولید اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام کا ذکر کسی نہ کسی نوعیت سے آتا ہے۔شبلی کی سوانح عمری حضرت عمر کی زندگی اور ان کی خلافت کا بھرپور احاطہ کرتی ہے اور اردو ادب کے ذخیرے میں یہ ایک قابل

قدر اضافہ ہے۔

الغزالی:

الغزالی (اشاعت ۱۹۰۲) سلسلہ کلامیہ کی ایک کڑی ہے۔علم الکلام (۱۹۰۲) اور الکلام (۱۹۰۴) اسی سلسلے کی تصنیف ہے۔شبلی نے الغزالی کو پہلا زینہ قرار دیا ہے۔شبلی نے اسے سوانح عمری کے طور پرنہیں لکھنا شروع کیا تھا بلکہ اس کا سبب تو علم کلام کی تاریخ ہے۔کتاب کا پہلا حصہ امام غزالی کی سوانح پر مشتمل ہے۔سوانحی حصہ بہت تفصیلی نہیں ہے لیکن جامعیت سے بھرپور ہے اور تمام مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔تحصیل علم کے لیے نیشاپور جانا اور امام الحرمین کی شاگردی وغیرہ کا ذکر شبلی نے کیا ہے۔شبلی نے جس وقت امام غزالی پر لکھنا شروع کیا اس وقت عربی میں بھی ان پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں تھی شبلی نے الگ الگ جگہوں سے بہت سے واقعات جمع کیے۔اسلامی علوم و تاریخ پر دسترس تو شبلی کو حاصل تھی اس لیے انھوں نے اپنی محنت اور توجہ سے سوانحی سلسلے کو اس طرح مرتب کر دیا ہے کہ امام غزالی کی سیرت اور شخصیت کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کے توسط سے شبلی نے فلسفہ کو عام کیا ہے امام غزالی کی کتابوں میں جہاں عقلیت کے مباحث ہیں ان کو واضح کیا ہے۔درس و تدریس کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا اور ان سب کے باوجود امام غزالی نے سیکڑوں کتابیں تصنیف کیں۔شبلی نے ۷۸ کتابوں کی فہرست دی ہے۔شبلی نے لکھا ہے کہ انھوں نے فقہ، اصول فقہ کلام اور اخلاق کو زیادہ ترقی دی۔اس کے علاوہ تصوف اور عقائد کی اصلاح بھی الغزالی میں زیر بحث ہیں اور یہ کہنا شاید غلط نہ قرار پائے کہ شبلی نے امام غزالی کے افکار و نظریات کو جس وضاحت سے بیان کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔

سوانح مولانا روم:

سوانح مولانا روم بھی سلسلہ کلامیہ کا حصہ ہے۔یہ کتاب حیدرآباد میں لکھی گئی اور ۱۹۰۶ میں منظر عام پر آئی۔ہندستان میں مولانا روم کی شہرت اور مقبولیت مثنوی معنوی کی وجہ سے ہے اور عام خیال یہی تھا کہ یہ کتاب تصوف و معرفت کی ہے حالانکہ ایک زمانے سے یہ کتاب لوگ پڑھتے آئے ہیں۔پہلی بار شبلی نے یہ واضح کیا کہ یہ صرف تصوف اور سلوک کا معاملہ نہیں ہے بلکہ مولانا روم نے اسلامی عقائد کی تعبیر و تشریح بھی نہایت دل نشیں انداز میں کی ہے۔اور شبلی نے اسی وجہ سے سلسلہ متکلمین میں اس کتاب کو شامل کیا۔یہ شبلی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی نکتہ سنجی سے یہ ثابت کیا کہ مثنوی معنوی علم الکلام کی بھی بہترین کتاب ہے۔سوانح مولانا روم دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں شبلی نے نام و نسب اور تعلیم کا ذکر کیا ہے۔شبلی نے لکھا ہے کہ مولانا کا سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق سے جا کر ملتا ہے۔مولانا روم نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور اس کے بعد شام اور حلب کے تعلیمی اداروں سے علوم درسیہ کی تکمیل کی۔مولانا روم کی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔پہلا دور علوم ظاہری کا ہے اور دوسرے دور میں باطنی علوم کا غلبہ رہا۔شمس تبریز سے ملاقات کا بھی یہی دور ہے۔علامہ شبلی نے اس ملاقات کا احوال لکھا ہے۔تصوف اور معرفت کو یہیں سے تقویت ملی۔مولانا روم بلخ میں پیدا ہوئے اور ان کی وفات قونیہ میں ہوئی۔

دوسرے حصے میں شبلی نے مولانا روم کی تصنیفات خصوصاً مثنوی معنوی کا ذکر کیا ہے۔شبلی نے یہ بات بالکل واضح طور پر لکھی ہے کہ مثنوی معنوی کی وجہ سے مولانا روم کا نام نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کتاب نے ان کی دوسری تصنیفات کو دبا لیا ہے۔انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ فارسی کی کسی کتاب کو آج تک اس قدر مقبولیت اور شہرت نہیں ملی۔شبلی کے نزدیک اس کی وجہ مثنوی کا طرز استدلال اور طریقہ افہام ہے۔مثنوی کی ایک اہم خوبی فرضی حکایتوں کے توسط سے اخلاقی مسائل کی تعلیم کا طریقہ ہے۔ صفات باری، نبوت، معجزہ، روح، معاد، جبر و قدر، تصوف، توحید (وحدۃ الوجود) فلسفہ و سائنس کے تعلق سے مثنوی میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں شبلی نے مثنوی کے اشعار کی تشریح کر کے بالکل واضح کر دیا ہے۔دوسرے حصے میں جو کلامی مباحث شبلی نے قائم کیے ہیں اور مولانا روم کی جس تخلیقی ہنرمندی کو شبلی نے پیش کیا ہے وہ شبلی کا خاصہ

ہے۔

سیرۃ النبی:

یہ علامہ شبلی کی سب سے آخری تصنیف ہے۔ سیرۃ النبی دراصل ایک عاشق رسول کا خراج عقیدت ہے۔ شبلی نے خود لکھا ہے کہ ''سیرۃ النبی ایک عاشق رسول کا والہانہ اظہارعقیدت ہے'' اسے وہ اپنے لیے وسیلہ نجات تصور کرتے تھے۔ سیرت نبوی سے متعلق مستشرقین اور غیر مسلم مناظرہ کرنے والوں نے جن غلط فہمیوں کو رائج کر رکھا تھا اس کی تردید بھی شبلی کا ہدف تھا۔ اسلام پر سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ یہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے شبلی نے تاریخ کی روشنی میں نہ صرف ان باتوں کا مدلل جواب دیا بلکہ ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ بھی کر دیا۔ سب سے بڑی یہی مثال پیش کی کہ آنحضرت ﷺ نے جتنی بھی جنگیں لڑی ہیں سب دفاعی ہیں۔ شبلی نے مختلف واقعات کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ آپ کو انسانیت سے بے پناہ محبت تھی۔ فتح مکہ کے بعد بھی جس طرح عام معافی کا اعلان کیا گیا اور اتنی بڑی فتح خون خرابے کے بغیر مکمل ہوئی تاریخ میں ایک مثال ہے۔

شبلی نے حقائق کی روشنی میں جس اہتمام اور شان سے سیرۃ النبی کا کام شروع کیا وہ دراز نہ ہو سکا وہ صرف دو جلدوں تک ہی وہ لکھ پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ سیرۃ النبی کا جو خاکہ شبلی نے بنایا تھا وہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں دو مقدمہ اور فن سیرت پر تبصرہ ہے۔ دوسرے مقدمہ میں عرب کی تاریخ اور خانہ کعبہ کی تعمیر سے متعلق عمدہ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے بعد سلسلہ نسب، ظہور قدسی، آفتاب رسالت، ہجرت و آغاز غزوات وغیرہ۔ پہلی جلد کا اختتام غزوہ تبوک اور دیگر غزوات وسرایا پر ہوتا ہے۔ دوسری جلد پیارے نبی ﷺ کی آخری تین سالہ زندگی پر مشتمل ہے۔ اس جلد کا آغاز ''اسلام کی امن کی زندگی'' سے ہوتا ہے۔ اس میں قیام امن اور وفود عرب، تاسیس وتکمیل شریعت، عبادات، وفات، متروکات، شمائل، معمولات، اخلاق نبوی، خطابت نبوی، مجالس نبوی، ازدواج مطہرات اور اولاد وغیرہ کی تفصیل دی ہے۔ ان عناوین کے تحت شبلی نے جن مباحث کو قائم کیا ہے اور حضور اکرم ﷺ سے متعلق جو تفصیلات دی گئی ہیں وہیں ان سے کئی چیزیں نمایاں ہوتی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے اخلاق وعادات اور عام صحابہ سے ان کے برتاؤ اور صحابہ کی جاں نثاری کا عالم وغیرہ۔ شبلی نے ان تفصیلات کو واقعات اور دوسرے معتبر حوالوں سے اس طرح رقم کیا ہے کہ اس عہد کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ سیرۃ النبی میں شبلی کا انداز واسلوب بھی بے مثال ہے انھوں نے قرآن وحدیث اور روایت وتاریخ سے جس طرح استفادہ کر کے نتائج اخذ کئے ہیں وہ ان کے علمی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔

9.5 سوانح الفاروق کا خصوصی مطالعہ

الفاروق حضرت عمر فاروقؓ کی مستند اور مکمل سوانح عمری ہے۔ یہ سوانح عمری شبلی کی تمام سوانح عمریوں میں فنی اعتبار سے سب سے خاص اور عمدہ ہے۔ الفاروق کا شمار اردو کی اہم سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔ علامہ شبلی کے بقول اس کتاب کا غلغلہ اس کے وجود میں آنے سے پہلے پورے ہندستان میں بلند ہو چکا تھا۔ شبلی نے جو سوانحی سلسلہ شروع کیا تھا اس میں سیرۃ النعمان کے بعد یہ ایک اہم سوانح ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت بھی اس کے اہم ہونے کی ایک دلیل ہے۔ موضوع سے مصنف کی ذاتی دلچسپی اور مواد کی تعمیر وتشکیل کی وجہ سے بھی یہ شبلی کی تصانیف میں فوقیت رکھتی ہے۔ الفاروق کے مواد کی فراہمی کے لیے شبلی نے روم ومصر وشام کے بیشتر کتب خانوں کا دورہ کیا۔ ۱۸۹۹ میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔ شبلی نے اپنی تمام کتابوں میں مراجع ومصادر کا خاص اہتمام کیا ہے مگر الفاروق میں یہ اہتمام مزید بلند درجے تک پہنچ گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کی سیرت وشخصیت جس بلند پایہ کی تھی اور ان کے کمالات کا جو تنوع تھا اسے دیکھتے ہوئے ان پر لکھنے کے لیے

شبلی جیسے مصنف کی ہی ضرورت تھی۔الفاروق دوحصوں پر مشتمل ہے۔شبلی خود اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب دوحصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں تمہید کے علاوہ حضرت عمرؓ کی ولادت سے وفات تک کے واقعات اور فتوحات ملکی کے حالات ہیں، دوسرے حصے میں ان کے ملکی اور مذہبی انتظامات اور علمی کمالات اور ذاتی اخلاق اور عادات کی تفصیل ہے۔اور یہی دوسرا حصہ مصنف کی سعی ومحنت کا تماشا گاہ ہے۔''(ص۲)

الفاروق کی تمہید سے شبلی کے منہج اور طریقہ کار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جہاں وہ معلومات فراہم کرتے ہیں وہیں غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرتے جاتے ہیں۔حضرت عمر کے متعلق جو کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں ان میں سے بیشتر شبلی کے پیش نظر تھیں اور اسی لیے انھوں نے کوشش کی ہے کہ جو نقص قدیم تاریخوں میں بیان کیے گئے ہیں اس کمی کو کسی حد تک پورا کرسکیں۔شبلی نے لکھا ہے کہ مورخین رزم وبزم کی معرکہ آرائیوں کے مقابلے انتظامی امور کے بیان کے بالکل عادی نہیں ہیں۔ان کا یہ بھی خیال تھا کہ گرمی محفل بننے والے واقعات مستند کتابوں میں کم ہیں اور میں نے اسی طرح کی معتبر اور اہم کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔شبلی نے لکھا ہے کہ قدما تمام واقعات کو حدیث کی طرح بہ سند متصل نقل کرتے ہیں اور ان کی معلومات بھی ہوتی ہیں۔شبلی نے ایک اہم بات یہ بھی لکھی ہے:

''حضرت عمر کی خلافت کے واقعات سو برس کے بعد تحریر میں آئے۔اس بنا پر یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ معرکوں اور لڑائیوں کی نہایت جزئی تفصیلیں مثلاً صف آرائی کی کیفیت ،فریقین کے سوال و جواب ،ایک ایک بہادر کی معرکہ آرائی ،پہلوانوں کے داؤں پیچ ،اس قسم کی جزئیات کی تفصیل کا رتبہ یقین تک نہیں پہنچ سکتا لیکن انتظامی امور اور قواعد حکومت چونکہ مدت تک محسوس صورت میں موجود رہے اس لیے ان کی نسبت جو واقعات منقول ہیں وہ بے شبہ یقین کے لائق ہیں۔''(ص۱۵)

حضرت عمر کی ابتدائی زندگی کے ذکر میں جہاں ان کے نام ونسب اور تعلیم وتربیت کا ذکر ہے وہیں ان کی شہرت اور معاملہ فہمی کے حوالے سے لکھا ہے:

''عکاظ کے معرکوں اور تجارت کے تجربوں نے ان کو تمام عرب میں روشناس کردیا،اور لوگوں پر ان کی قابلیت کے جوہر روز بہ روز کھلتے گئے، یہاں تک کہ قریش نے ان کو سفارت کے منصب پر معمور کردیا۔''(ص۲۴)

نام ونسب، شہسواری اور فن پہلوانی کی مہارت، لکھنے کی تعلیم، تجارت کے لیے سفر ،قبول اسلام ،ہجرت ،غزوات اور دیگر واقعات ،خلافت اور فتوحات ،قادسیہ کی جنگ ،اسکندریہ کی فتح ،حضرت خالد کی معزولی اور حضرت عمر کی شہادت وغیرہ کے بیان میں شبلی نے نہایت جزرسی سے کام لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ مستند اور مراجع سے فائدہ اٹھایا جائے۔

پہلے حصے میں جہاں شبلی نے حضرت عمرؓ کے سلسلہ نسب، ولادت، بچپن اور جوانی کے ایام، قبل اسلام اور قبول اسلام اور ہجرت، اس کے بعد کے اہم اور واقعات، اسلامی خلافت کے لیے ان کا انتخاب اور ان کے عہد خلافت میں فتوحات کا بیان ہے جب کہ دوسرے حصے میں شبلی حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت کی فتوحات پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور فتوحات کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں۔اس حصے میں ان کے انتظامِ سلطنت، ملک کی تقسیم، عہدے داران کا تقرر، انتظام اور تنخواہوں سے متعلق تفصیلات دی گئی ہیں۔ نظامِ حکومت کے بعد ٹیکس کے محکمہ کی معلومات کو بھی درج کیا گیا ہے، یہ حصہ اس اعتبار سے بھی بے حد خاص ہے کہ اس میں حضرت عمر کے عدل وانصاف اور محکمہ عدالت کے تمام جزئیات کا نقشہ بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد افتاء، محکمہ پولیس اور محکمہ فوج داری، محکمہ مالیات، پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ اور محکمہ دفاع کا بھی

بالترتیب ذکر کرتے ہوئے ان محکمہ جات کی تمام خصوصیات اور معلومات کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔اس حصے میں حضرت عمر فاروق کی امامت اور اجتہاد سے متعلق بے حد سائنٹفک اور عالمانہ بحث بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ حضرت عمرؓ کی ذاتی زندگی کے نشیب وفراز، حالات، عادات وخصائل، شخصیت کے مختلف گوشے، ان کا کردار اور اس کی بنیادی خصوصیات جیسے تقویٰ اور پرہیز گاری، تواضع وانکسار، قناعت، خوداحتسابی وغیرہ اور اعمال دنیوی ودینی عبادات وغیرہ کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔جس سے ان کی ایک متحرک اور جاندار تصویر سامنے آجاتی ہے۔ایسے مواقع پر وہ ایک انسان کے طور پر سامنے آتے ہیں اور ان کی نجی زندگی کے مطالعے سے قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔اس لیے یہ سوانح مزید پرکشش بن جاتی ہے کیوں کہ ایک سوانح اپنے ہیرو کے کارناموں سے کہیں زیادہ اس کی ذات اور اس کی زندگی کے ان پہلوؤں کا تقاضا کرتی ہے جو عموماً نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اور ہر کوئی اس حد تک معلومات کی سطح پر رسائی چاہتا ہے اور سوانح قاری کی تشفی میں کامیاب ہوسکتی ہے۔اس حصے کے آخر میں حضرت عمر کے اہل وعیال سے متعلق معلومات درج ہیں اور یہیں اس کتاب کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔اس سوانح میں خلافت کے قیام پر گفتگو کرتے ہوئے اسے جمہوریت سے بڑی حد تک قریب بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔علامہ شبلی کے دلائل بے حد عمدہ اور سائنٹفک ہوتے ہیں اور واقعات کی سطح پر وہ صداقت سے کام لیتے ہیں ان کی یہ خوبی انھیں ممتاز بنادیتی ہے۔

شبلی نے حضرت عمر کو ایک فاتح اور بلند پایہ منتظم اور مدبر کے طور پر پیش کیا ہے وہیں یہ بھی دکھایا ہے کہ حضرت عمر شعروادب کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔عرب کے مشہور شعرا کا اکثر کلام انھیں یاد تھا۔وہ امراءالقیس، زہیر اور نابغہ کے کلام کو پسند کرتے تھے۔البتہ زہیر کو اشعر الشعرا کہتے تھے۔شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ علم الانساب حضرت عمر کا خانہ زاد علم تھا۔ان کے والد خطاب مشہور نساب تھے۔شبلی نے اخلاق وعادات کے تحت حضرت کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ تحریر وتقریر میں انھیں ملکہ تھا اور ایک اچھے خطیب بھی ہیں لیکن وہ خطبہ نکاح اچھا نہیں دے سکتے تھے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شبلی نے سوانح نگاری کے فن کو ملحوظ خاطر رکھا اور ہیرو کی شخصیت کے ہر پہلو کو دکھایا ہے۔علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> ''تمام دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا حکمراں دکھا سکتے ہو، جس کی معاشرت یہ ہو کہ قمیص میں دس دس پیوند لگے ہوں، کاندھے پر مشک رکھ کر غریب عورتوں کے یہاں پانی بھرآتا ہو، فرش خاک پر پڑ رہتا ہو، بازاروں میں پڑا پھرتا ہو، جہاں جاتا ہو جریدہ وتنہا چلا جاتا ہو، اونٹوں کے بدن پر اپنے ہاتھ سے تیل ملتا ہو، درو دربار، نقیب وچاؤش، حشم وخدم کے نام سے آشنا نہ ہو، اور پھر یہ رعب وداب ہو کہ عرب وعجم اس کے نام سے لرزتے ہوں اور جس طرف رخ کرتا ہو زمین دہل جاتی ہو، سکندر وتیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لے کر نکلتے تھے، جب ان کا رعب قائم ہوتا تھا ، حضرت عمر فاروق کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن چاروں طرف غل پڑا ہوا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آگیا ہے۔''

(الفاروق حصہ دوم ص ۲۳۴)

شبلی نے حضرتِ عمر کی دونوں ہی زندگیوں کا مطالعہ کیا ہے۔جس سے ایک عام اور خاص دونوں طرح کی شخصیات کی تشکیل وتعمیر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔شبلی نے ان تمام امور کا بڑی عمدگی سے جائزہ لے کر حضرت عمر کی ایک متحرک اور جاندار تصویر پیش کی ہے۔ جہاں وہ عظیم خلیفہ اسلام نہیں بلکہ اپنی کمزوریوں اور خوبیوں کے ساتھ ایک عام بشر ہیں۔ واقعات کے حسنِ انتخاب، جزئیات نگاری، ترتیب اور کثرت معلومات، تلاش وتحقیق، صداقت بیان، جیسی خوبیوں سے مزین یہ سوانح خود کو منفرد بنادیتی ہے۔خاتمے کے حصے میں علامہ شبلی نے حضرت عمر کی شخصیت کا مجموعی جائزہ لیا ہے اور ان کی چھ خصوصیات حکمرانی، حسن تدبیر، عدل وانصاف، آئین سازی، قناعت اور علمی حیثیت کی بنا پر انھیں دنیا

کے عظیم حکمرانوں میں سب سے افضل اور برتر قرار دیا ہے۔ حالاں کہ انھوں نے حضرت عمر کی شخصیت سے جذباتی لگاؤ اور عقیدت رکھنے کے باجود ان کی بشری کمزوریوں سے صرف نظر کرنے کے بجائے بڑی صاف گوئی اور حوصلہ کے ساتھ ان کی کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے۔

سوانح الفاروق کی شہرت اور اہمیت کا سبب یہ بھی ہے کہ اس میں بڑی عظیم شخصیات کا بھی ذکر ہے اور ان کے درمیان سے حضرت عمرؓ کی سیرت و شخصیت کو اس طرح نمایاں کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے پر حرف بھی نہ آئے۔ ایک مشکل کام کو فنی سربلندی کے ساتھ نہایت عمدہ طریقے سے شبلی نے انجام دیا ہے۔ حضرت عمر کی ابتدائی زندگی سے ہی پیارے نبی ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان، حضرت علی، خالد بن ولید اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام کا ذکر کسی نہ کسی نوعیت سے آتا ہے۔ شبلی کی سوانح عمری حضرت عمر کی زندگی اور ان کی خلافت کا بھرپور احاطہ کرتی ہے اور اردو ادب کے ذخیرے میں یہ ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

9.6 آپ نے کیا سیکھا

آپ نے اس اکائی کے مطالعے سے شبلی کی سوانح نگاری کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ شبلی کو تاریخ سے خصوصی لگاؤ تھا اور اسی لیے انھوں نے بہت سے اہم لوگوں کی سوانح لکھی ہے۔ ان میں المامون (۱۸۸۷)، سیرۃ النعمان (۱۸۹۱)، الفاروق (۱۸۹۹)، الغزالی (۱۹۰۲)، سوانح مولانا روم (۱۹۰۶) اور سیرۃ النبی شامل ہیں۔

اس اکائی میں آپ نے شبلی کی مذکورہ سوانح عمریوں کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ سوانح عمریاں کن شخصیات پر مبنی ہیں کن کن لوگوں کے حالات و واقعات کا بیان کیا گیا ہے۔ آپ کی معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ المامون میں عباسیوں کی تاریخ وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے۔ اور مامون رشید کی زندگی اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا بیان کیا گیا ہے۔ سیرۃ النعمان میں امام اعظم ابوحنیفہ بن ثابت کی سوانح بیان کی گئی ہے۔ امام ابو حنیفہ کی سوانح میں شبلی مصلح، مجتہد، مورخ اور محدث کے طور پر نظر آتے ہیں۔ یعنی امام اعظم کی مختلف حیثیتوں کو اس طور پر پیش کیا ہے کہ اس سے دونوں کی شان نمایاں ہوتی چلی گئی ہے۔ شبلی کی تصنیف الغزالی کی زندگی، شخصیت اور ان کے کارناموں کا بیان کیا گیا ہے۔

آپ نے مطالعہ کیا کہ شبلی کی سوانح عمریوں میں 'الفاروق' کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب سوانحی پہلو سے بہت اہم ہے۔ اس کے مواد کی فراہمی کے لیے شبلی نے روم اور شام کا سفر کیا تاکہ وہاں کی لائبریریوں سے استفادہ کر سکیں۔ پہلے حصے میں حضرت عمر فاروق کی سیرت اور شخصیت اور ان کے منفرد اوصاف کا بیان کیا گیا ہے جس سے ان کے کردار کی بلندی اور شخصیت کا تنوع نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوسرے حصے میں حضرت عمر کی فتوحات اور ان کے کارناموں خصوصاً اپنے دورِ خلافت میں ملکی انتظامات کے تئیں جو کارنامے انھوں نے انجام دیئے اس کا بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اردو کے سوانحی ادب میں یہ کتاب ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

سیرۃ النبی شبلی کی آخری اور معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ اس کتاب کی صرف دو جلدیں ہی تحریر ہوئی تھیں کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ بقیہ جلدیں شبلی کے خاکے کی روشنی میں ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے تحریر کیں۔ یہ کتاب صرف نبی کریم ﷺ کی سیرت ہی نہیں ہے بلکہ ان کی مکمل زندگی کا احاطہ کرتی ہے اس میں ان کے عادات و اخلاق اور سیرت و سوانح کے ساتھ ساتھ فتوحات اور جنگی مہمات کا بھی تذکرہ ہے۔ نیز کتاب کا وہ اہم حصہ بھی جس میں مستشرقین نے آنحضرت ﷺ سے متعلق جو گمراہ کن پروپیگنڈا کیا تھا اس کا مدلل جواب اور تاریخ وحقائق کی روشنی میں اس کی تردید بھی کی گئی ہے۔ سیرۃ النبی شبلی کے محققانہ انداز و اسلوب اور انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

9.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ شبلی کی حالاتِ زندگی کا مختصراً جائزہ لیجئے ؟

2۔ علامہ شبلی کی سوانح المامون کا مختصر تعارف پیش کیجئے ؟

3۔ علامہ شبلی کی سیرۃ النعمان کا مختصر تعارف پیش کیجئے ؟

4۔ علامہ شبلی کی سوانح مولانا روم کا مختصر تعارف پیش کیجئے ؟

5۔ علامہ شبلی کی سوانح الفاروق کا مختصر تعارف پیش کیجئے ؟

9.8 سوالات کے جوابات

جواب نمبرا: علامہ شبلی کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔4 جون 1857 کو موضع بندول، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد شیخ حبیب اللہ اس دیار کے مشہور زمینداروں اور وکلا میں شمار ہوتے تھے۔ابتدائی تعلیم مولوی شکراللہ اور حکیم عبداللہ سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے مدرسہ چشم رحمت غازی پور گئے ۔ جہاں مولانا فاروق چریا کوٹی کے سامنے تلمذ تہہ کیا۔کچھ دنوں جون پور کے ایک مدرسے میں زیر تعلیم رہے۔فقہ کی تعلیم مولانا ارشاد حسین رامپوری سے حاصل کی۔لاہور جا کر مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے عربی ادب میں استفادہ کیا۔مولانا محمد علی محدث سہارنپوری نے علم حدیث میں استعداد بہم پہنچائی۔19 سال کی عمر میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔شبلی کے والد انھیں وکیل بنانا چاہتے تھے،شبلی اس میں کامیاب بھی ہوئے لیکن وکالت کا پیشہ ان کی طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔مناظرہ شبلی کا پسندیدہ شغل رہا۔دور دور تک مناظرہ کے لیے گئے۔شبلی کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی 1881 میں سرسید سے ملاقات کے بعد رونما ہوئی۔علی گڑھ،ندوۃ العلما کی تعلیمی و تدریسی زندگی میں شبلی کا نمایاں کردار رہا ہے۔تعلیم و تعلم سے ان کا شوق اور ذہنی ہم آہنگی قابل رشک تھی۔متعدد تعلیمی اداروں کے نصابات،اساتذہ اور طلبہ کے لیے تعلیمی ضابطے انھوں نے تیار کیے۔اور ندوۃ العلما کی شکل میں اپنا ایک واضح تعلیمی نظریہ بھی پیش کیا۔''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم''ان کا وہ شہرۂ آفاق مقالہ تھا۔جو 1887 میں لکھنؤ کی شاہی بارہ دری میں پیش کیا گیا تھا۔بقول سید سلیمان ندوی'اسی مطلع سے شبلی کی شہرت کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا'۔

شبلی کی تصنیفی زندگی کا آغاز 1880 سے ہی ہو چکا تھا۔مؤرخ،سیرت نگار،محقق اور شاعر و ادیب کی حیثیت سے انھوں نے گراں قدر کارنامے انجام دیں۔شبلی مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔فن سوانح نگاری کا آغاز اگرچہ حالی نے کیا تھا مگر اس فن کو شبلی کے قلم نے زیادہ اہمیت کا حامل بنا دیا۔المامون،سیرت النعمان،الفاروق،الغزالی،سوانح مولانا روم اور سیرت النبی علامہ شبلی نعمانی کے علمی شاہ کار اور سوانحی ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

جواب نمبر۲: المامون شبلی کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے جو ۱۸۸۸ء میں منظرِ عام پر آئی۔سوانح المامون معروف سیاست داں اور عباسی خلیفہ'مامون رشید' کی حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں پر مشتمل ہے۔کتاب کی ابتدا میں شبلی نے اس کے تحریر کئے جانے کے متعلق بیان کرتے ہوئے تاریخ کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا ہے اور اسی کے تحت بعض اصولی باتوں پر روشنی ڈالی ہے ۔پہلا حصہ مامون رشید کی ابتدائی زندگی،تعلیم و تربیت،تخت نشینی اور فتوحات کے ذکر اور واقعات کے بیان پر مشتمل ہے۔دوسرا حصہ مامون رشید کے کارناموں پر مشتمل ہے۔
شبلی نے مامون رشید کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور اسے دلکش بنانے کے لیے لطائف و ظرافت کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔شبلی نے المامون کے بیان میں مامون کی زندگی کو نہایت مرتب انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری پر اس کی زندگی کی تمام تصویریں ظاہر ہو جاتی ہیں۔امین و مامون کی کش مکش بھی تاریخی حوالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔مامون رشید کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں کو بھی واضح

کیا گیا ہے۔شبلی نے جہاں مامون رشید کے کمالات اور دلیری کا ذکر کیا ہے تو وہیں اس کی بعض بے اعتدالیوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ایک طرف جہاں وہ ''اہل کمال کے ساتھ علمی بحثیں کرتا ہے تو دوسری طرف بزم عیش میں رندانہ وضع بیٹھتا ہے۔'' المامون کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ سرسید نے لکھا۔سرسید نے شبلی کی جزئیات نگاری کی داد دی۔انھوں نے لکھا کہ دلچسپ واقعات کے سبب تاریخی حصہ بھی نہایت دلچسپ ہوگیا ہے۔شبلی کی یہ سوانح عمری نامور فرمارو ایان اسلام کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

جواب نمبر۳: سیرۃ النعمان (۱۸۹۱) امام ابوحنیفہ بن کی سوانح عمری ہے۔عربی، فارسی اور ترکی زبان میں اس وقت تک امام ابوحنیفہ کی متعدد سوانح عمریاں لکھی جا چکی تھیں۔سیرۃ النعمان دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں امام ابوحنیفہ کے نام ونسب، سیرت وشخصیت، درس وافتا، شادی کی تفصیل، مناظرے، علمی مجلسیں، فقہی مسائل اور اخلاق وعادات کو پیش کیا گیا ہے۔شبلی امام ابوحنیفہ کے عقیدت مند تھے مگر اس کے باوجود انھوں نے فنی تقاضوں کا پورا خیال رکھا ہے۔بہت سے خوش اعتقادی کے ایسے واقعات جو امام صاحب سے منسوب تھے شبلی نے حقائق کی روشنی میں جب ان کا جائزہ لیا تو وہ ثابت نہیں ہو سکے۔

شبلی نے ایک طرف جہاں ان کی عبادت وریاضت کو پیش کیا تو دوسری طرف یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بہت خوش مزاج اور سلیم الطبع انسان تھے۔اخلاق وکردار کی بلندی کے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں۔سوانحی حصے میں شبلی کی جزئیات نگاری ان کے تحقیقی نقطۂ نظر کی آئینہ دار کہی جاسکتی ہے۔سیرۃ النعمان امام ابوحنیفہ کی سیرت وشخصیت پر ایک نہایت کارآمد کتاب ہے جس میں سوانحی ادب کے اصول وضوابط بروئے کار لائے گئے ہیں۔ترتیب وتہذیب اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے بھی یہ شبلی کا عمدہ کارنامہ ہے۔

جواب نمبر۴: سوانح مولانا روم بھی سلسلہ کلامیہ کا حصہ ہے۔یہ کتاب حیدرآباد میں لکھی گئی اور ۱۹۰۶ میں منظر عام پر آئی۔ہندستان میں مولانا روم کی شہرت اور مقبولیت مثنوی معنوی کی وجہ سے ہے اور عام خیال یہی تھا کہ یہ کتاب تصوف ومعرفت کی ہے حالانکہ ایک زمانے سے یہ کتاب لوگ پڑھتے آئے ہیں۔پہلی بار شبلی نے یہ واضح کیا کہ یہ صرف تصوف اور سلوک کا معاملہ نہیں ہے بلکہ مولانا روم نے اسلامی عقائد کی تعبیر وتشریح بھی نہایت دل نشیں انداز میں کی ہے۔اور شبلی نے اسی وجہ سے سلسلہ متکلمین میں اس کتاب کو شامل کیا۔یہ شبلی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی نکتہ سنجی سے یہ ثابت کیا کہ مثنوی معنوی علم الکلام کی بھی بہترین کتاب ہے۔سوانح مولانا روم دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں شبلی نے نام ونسب اور تعلیم کا ذکر کیا ہے۔دوسرے حصے میں شبلی نے مولانا روم کی تصنیفات خصوصاً مثنوی معنوی کا ذکر کیا ہے۔شبلی نے یہ بات بالکل واضح طور پر لکھی ہے کہ مثنوی معنوی کی وجہ سے مولانا روم کا نام نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کتاب نے ان کی دوسری تصنیفات کو دبا لیا ہے۔انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ فارسی کی کسی کتاب کو آج تک اس قدر مقبولیت اور شہرت نہیں ملی۔شبلی کے نزدیک اس کی وجہ مثنوی کا طرز استدلال اور طریقہ افہام ہے۔

جواب نمبر۵: الفاروق کا شمار اردو کی اہم سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔یہ کتاب ۱۸۹۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔الفاروق کے مواد کی فراہمی کے لیے شبلی نے روم ومصروشام کے بیشتر کتب خانوں کا دورہ کیا۔۱۸۹۹ میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگیا۔حضرت عمرؓ کی سیرت وشخصیت جس بلند پایہ کی تھی اور ان کے کمالات کا جو تنوع تھا اسے دیکھتے ہوئے ان پر لکھنے کے لیے شبلی جیسے مصنف کی ہی ضرورت تھی۔الفاروق دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں تمہید کے علاوہ حضرت عمرؓ کی ولادت سے وفات تک کے واقعات اور فتوحات ملکی کے حالات ہیں، دوسرے حصے میں ان کے ملکی اور مذہبی انتظامات اور علمی کمالات اور ذاتی اخلاق اور عادات کی تفصیل ہے۔شبلی نے حضرت عمر کو

ایک فاتح اور بلند پایہ منتظم اور مدبر کے طور پر پیش کیا ہے وہیں یہ بھی دکھایا ہے کہ حضرت عمر شعر و ادب کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ عرب کے مشہور شعرا کا اکثر کلام انھیں یاد تھا۔

الفاروق میں بڑی عظیم شخصیات کا بھی ذکر ہے اور ان کے درمیان سے حضرت عمرؓ کی سیرت و شخصیت کو اس طرح نمایاں کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے پر حرف بھی نہ آئے۔ حضرت عمر کی ابتدائی زندگی سے ہی پیارے نبی ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان، حضرت علی، خالد بن ولید اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام کا ذکر کسی نہ کسی نوعیت سے آتا ہے۔ شبلی کی سوانح عمری حضرت عمر کی زندگی اور ان کی خلافت کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔

9.9 فرہنگ

الفاظ	معانی
افادی	فائدہ مند، نفع بخش
استعداد	فطری قابلیت، صلاحیت
پژمردہ دل	جس کا دل افسردہ ہو، اداس، رنجیدہ
فرنگ	انگریز
ازالہ	دور کرنا، الگ کرنا
بزم عیش	خوشی کی مجلس، راگ و رنگ کا جلسہ
رندانہ	رند کی طرح، رندی سے نسبت رکھنے والا
انشا پرداز	مضمون نگار، ادیب، نثر لکھنے والا
عکاظ	زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ایک بازار یا میلے کا نام جس میں عرب کے لوگ جمع ہو کر شعر و شاعری میں مقابلہ اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔
مشک	پانی بھرنے اور لے جانے کے لیے کسی جانور کی سالم کھال کا بنا ہوا تھیلے کی شکل کا ظرف جس کا منہ چھوٹا ہوتا ہے، وہ بکری یا بھیڑ کی سلی ہوئی کھال جس سے سقے پانی بھرتے ہیں۔
ہمہ جہت	ہمہ گیر، کئی جہتوں والا
صعوبت	پریشانی، تکلیف
عارضی	وقتی
لائحۂ عمل	کام کا منصوبہ، خاکہ
مرصع	بناوٹ، سجاوٹ
ازالہ	دور کرنا، الگ کرنا، زائل کرنا

9.10 کتب برائے مطالعہ

1۔ڈاکٹرممتاز فاخرہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا1914 تا1975،دہلی۔1984

2۔ڈاکٹرسیدشاہ علی،اردو میں سوانح نگاری،کراچی۔1961

3۔علامہ شبلی نعمانی،المامون،دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔2009

4۔آنسہ الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا،اعتقاد پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔1974

5۔علامہ شبلی نعمانی،الفاروق،دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔2015

6۔سیدسلیمان ندوی،حیات شبلی،دارالمصنفین شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ۔2008

7۔ڈاکٹرعمررضا،اردو میں سوانحی ادب،فن اورروایت۔کتابی دنیا،دہلی2010

بلاک:4 خطوط نگاری

اکائی ۱۰: خطوط نگاری کا فن اور اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز وارتقا
اکائی ۱۱: خطوط غالب: ایک جائزہ
اکائی ۱۲: ابوالکلام آزاد اور غبار خاطر

بلاک 4 کا تعارف

اکائی 10 ''خطوط نگاری کا فن اور اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز وارتقا'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔اس میں خطوط کی تعریف وفن پر گفتگو کی گئی ہے۔ساتھ ہی اردو ادب میں مکتوب نگاری کے آغاز وارتقا کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 11 ''خطوط غالب: ایک جائزہ'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں غالب کی شخصیت اوران کے ادبی کارناموں پر مختصراًروشنی ڈالتے ہوئے ان کے خطوط کی اہمیت وافادیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ نیز اردو ادب میں خطوط غالب کی ادبی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

اکائی 12 ''ابوالکلام آزاداورغبارخاطر'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں آزاد کی شخصیت اوران کے ادبی کارناموں پر مختصراًروشنی ڈالتے ہوئے ان کے خطوط کی انفرادیت پر گفتگو کی گئی ہے۔ نیز اردو ادب میں ''غبارخاطر'' کی ادبی قدر و قیمت کا تعین بھی کیا گیا ہے۔

اکائی 10: خطوط نگاری کا فن اور اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز وارتقا

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 خطوط نگاری کا فن

10.4 اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز وارتقا

10.5 اردو کے اہم مکتوب نگار

10.6 آپ نے کیا سیکھا

10.7 اپنا امتحان خود لیجیے

10.8 سوالات کے جوابات

10.9 فرہنگ

10.10 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- خطوط نگاری کے فن سے واقف ہوں گے۔
- خطوط کے اقسام سے روشناس ہوں گے۔
- خطوط کے کچھ نمونوں سے بھی واقف ہوں گے۔
- اردو میں مکتوب نگاری کے آغاز وارتقا کا مطالعہ کر سکیں گے۔
- اردو کے اہم مکتوب نگاروں کی مکتوب نگاری سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔

10.2 تمہید

بہ حیثیت فن اردو مکتوب نگاری کا آغاز تقریباً دوسو برس پہلے ہوا۔ یہ فارسی زبان کے زیر اثر اردو میں پروان چڑھی۔ ابتدا میں فارسی روایات کا استعمال خوب ہوتا رہا لیکن بعد میں اردو نے اپنی الگ راہ نکال لی۔ اردو مکتوب نگاری کے ارتقا میں غالب کے علاوہ غلام غوث بے خبر، رجب علی بیگ سرور، سرسید احمد خاں، محسن الملک، حالی، شبلی، آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، اکبرالہ آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، فیض احمد فیض، جاں نثار اختر اور فراق گورکھپوری وغیرہ کا نام واضح طور پر ملتا ہے۔ رجب علی بیگ سرور کی زبان رنگین اور گنجلک ہے۔

جب کہ غالب نے مکاتیب کو ایک نئی زبان سے روشناس کرایا اور اسے باضابطہ ایک صنف کے طور پر اردو میں متعارف کرایا۔ غالب کے خطوط میں طنز و مزاح کی چاشنی، بوجھل لمحوں کے لیے بھی اکسیر کا کام کرتی ہے۔ سرور کو جدید الفاظ کے استعمال پر قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے مجلس میں مستعمل زبان کا خطوط میں روانی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ سرور عام طور پر لکھنؤ کی مفرس اور پر تکلف زبان استعمال کرنے کے قائل تھے جب کہ غالب کے یہاں آسان لب ولہجہ ملتا ہے اور بے جا آداب والقاب سے بے اعتنائی بھی۔ اس طرح غالب نے اردو خطوط نگاری کا چلن بدل دیا اور بیان میں ایسی ندرت پیدا کی کہ مراسلہ مکالمے میں تبدیل ہو گیا۔ اس باب میں ہم خطوط نگاری کا فن اور اس کے آغاز وارتقا سے متعلق گفتگو کریں گے۔

10.3 خطوط نگاری کا فن

خطوط نگاری کی ابتدا سے متعلق وثوق سے کچھ کہنا بہت مشکل ہے لیکن امرا و سلاطین اپنے پیغام کی رسائی کے لیے پرندوں سے یہ کام لیا کرتے تھے جو کہ آگے چل کر انسانوں سے قاصد کی شکل میں لیا جانے لگا۔ سلطنت کے نمایاں قاصد اپنے مضافات میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے جس کے لیے ایک محکمہ 'دارالانشا' قائم تھا۔ اس ادارے میں خطوط لکھنے کے لیے منشیوں اور انھیں ارسال کرنے کے لیے قاصدوں کو باضابطہ تقرر ہوتا تھا۔ نبوت کی خبر اور بیعت کے لیے بھی خطوط کا استعمال ہوتا تھا۔ مذہبی رہنما دعوت وتبلیغ کے لیے خطوط کا سہارا لیتے رہے ہیں۔ یعنی کہ ابتدا میں خطوط نویسی یا مکتوب نگاری ایک خاص طبقہ تک ہی محدود رہی جسے بعد میں عوام نے بھی اپنا لیا اور اپنی بات اپنوں تک پہنچانے کے لیے یہ ایک بہترین وسیلہ بن کر ابھری۔ زمانہ نے ترقی کی تو حکومت نے اسے سنجیدگی سے لیا اور خط بھیجنے کے لیے باضابطہ ڈاک خانوں کا قیام عمل میں آیا۔ حکومت اس کے لیے محصول کے بطور اسٹامپ جاری کر پیسے لیتی، اس کے لیے ڈاکیہ کا تقرر ہوا جو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک خطوط پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔ موجودہ عہد میں برقی ذرائع ترسیل نے اس فن کو کمال تک پہنچا دیا ہے۔ ای۔میل کے ذریعے صرف چند سیکنڈوں میں ہی مکتوب رسائی ممکن ہو گئی ہے۔ واٹس ایپ، میسنجر، ٹوئیٹر، انسٹا گرام اور اسنیپ چیٹ وغیرہ پیغام رسانی کی جدید شکلیں ہیں۔

خطوط نگاری کے اصول وضوابط

- ابتدا میں خطوط پُر تکلف اور لفظی تصنع سے پُر ہوا کرتے تھے۔ مخاطب کو بے جا آداب والقاب سے متاثر کیا جاتا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ قافیہ پیمائی اور القاب کے بے جا استعمال سے عبارت میں بے جا تصنع اور بناوٹ پیدا ہو جاتی تھی اور نفس مضمون انہیں میں کہیں غائب ہو جاتا۔ غالب نے اپنے مزاج کے مطابق روایت سے انحراف کرتے ہوئے فرسودہ رسموں کو ترک کر نئی بنا ڈالی اور نئے اصول وضع کیے۔
- ابتدا میں مخاطب کو اس کے ذاتی مراتب کے اعتبار سے مخاطب کیا جائے۔
- القاب وآداب اور بے جا رسمی گفتگو سے اجتناب کیا جائے۔
- نفس مضمون کو تصنع اور عبارت آرائی سے گنجلک بنانے کی بجائے صاف ستھرے اور سلیس زبان کا استعمال کیا جائے۔

- زبان کی صحت اور اس کی خوبی کا خیال رکھتے ہوئے الفاظ کے دہراؤ سے بچا جائے۔
- بے جا طوالت سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔
- غالب کے بیان کردہ اصول اور مستعمل زبان نے بلا شبہ اردو خطوط نگاری کو ایک مکمل اور صحت مند فن کے طور پر

متعارف کرایا۔

خطوط کے جزو

- مکتوب نگار کا نام اور پتہ
- تحریر کی تاریخ
- القاب و آداب
- نفس مضمون
- اختتام
- مکتوب نگار کے دستخط اور نام و پتہ
- عہد حاضر میں ای۔میل کا پتہ اور واٹس ایپ نمبر بھی درج کیا جاتا ہے۔

سرکاری، دفتری یا کاروباری خطوط میں تاریخِ تحریر کے بائیں جانب ایک نشان بنایا جاتا ہے جسے اردو میں 'نشانِ مجاریہ' کہتے ہیں۔اس کا مقصد متعلقہ فائل سے اس کی نسبت معلوم کرنا ہے۔

سرکاری یا دفتری خطوط میں آسانی کے لیے مضمون لکھ کر خط کا موضوع بیان کر دیا جاتا ہے تاکہ ابتدا میں ہی پتہ چل سکے کہ یہ مراسلہ کس مضمون سے متعلق ہے۔

اگر اس حوالے سے پہلے ہی مراسلے ہو چکے ہیں تو ان مراسلوں کے حوالے بھی درج کیے جاتے ہیں، بعض دفعہ اس کی کاپیاں بھی اس کے ساتھ منسلک کی جاتی ہے۔

مضمون کا اختتام بات مکمل ہوتے ہی ہو جاتا ہے۔ بے جا کلمات سے اجتناب برتتے ہوئے نام اور دستخط کے ساتھ تاریخ درج کی جاتی ہے۔ضرورت کے مطابق مہر بھی ثبت کرتے ہیں۔

جدید رواج کے مطابق مکتوب الیہ کا نام اور پتہ، مضمون وغیرہ ساری ضروری باتیں دائیں جانب سے شروع کی جاتی ہیں۔ان کے لیے الگ سے پیراگراف کا نشان درج نہیں کیا جاتا ہے۔

خطوط کے اقسام

اس ضمن میں نجی یا ذاتی، کاروباری، تجارتی، اخباری اور دفتری خطوط کے علاوہ ادیبوں اور دانشوروں کے ذاتی خطوط آتے ہیں۔ نجی یا ذاتی خطوط کا ایک نمونہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

نجی یا ذاتی خط

اویس اختر

بورنگ روڈ، پٹنہ

مکرمی بڑے بھائی

سلام مسنون

میں بخیر و عافیت پٹنہ پہنچ چکا ہوں۔کل میرا امتحان ہوگیا،اس امتحان کے نتیجے کے بعد تقریری امتحان اگلے ہفتے ہونا طے پایا ہے۔ امید ہے کہ دونوں مراحل میں کامیابی حاصل ہوگی۔آپ کی عنایت کردہ رقم سے رہائش اور طعام کا کام بحسن وخوبی ہو رہا ہے۔داخلہ ہونے کے بعد آپ کو اطلاع کروں گا۔

والسلام

دعاؤں کا طالب

آپ کا چھوٹا بھائی

(اویس اختر)

دفتری /سرکاری خطوط کا نمونہ

تقرر کے لیے پرنسپل کو خط

بلال احمد

پھول پور،اعظم گڑھ

جناب پرنسپل صاحب

مضمون: درخواست برائے تقرر اردو

حضور والا،اخباری تشہیر سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کے اسکول (اسکول کا نام) میں اردو استاد کی ضرورت ہے۔میں نے الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن سے کامیابی حاصل کی ہے۔میں خود کو اس عہدے کے لیے لائق خیال کرتا ہوں، آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری تقرری سے آپ کے اسکول کا نام مزید روشن ہوگا۔

از راہ کرم میری درخواست پر غور فرماتے ہوئے مجھے خدمت کا موقع عنایت فرمائیں۔

نیاز مند

(دستخط امیدوار)

بلال احمد

تاریخ۔۔۔۔۔۔

ادیب کے خط کا نمونہ

مکتوب امیر مینائی بنام دل شاہجہاں پوری

مجی سلام مسنون

دعائے مشحون بہت سے گرامی نامے آپ کے آکر باعث شکرگزاری ہوئے۔رنجوری ومعذوری نے مجھے جواب دینے سے محروم رکھا۔اس وقت ۲۸/اپریل کا کارڈ پیش نظر ہے۔اس کا جواب سنئے۔چلمن نہ فارسی ہے نہ عربی اس کی اضافت فارسی کی ہرگز جائز نہ ہوگی جانب متھرا اس کے لیے سندنہیں متھرا علم ہے شہر کا نام ہے اس کا ترجمہ عربی فارسی میں کیا ہوگا۔لہٰذا یہی لفظ ترکیبوں کے ساتھ بلا تردّد باندھئے آپ کا مصرع جس میں پسِ چلمن ہے یوں اصلاح ہوسکتی ہے۔

دلِ صد چاک میں دیکھا رخِ روشن ان کا
ہم نے نظّارہ کیا ڈال کے چلمن ان کا

آپ ہر خط میں اپنی غزل طلب کرتے ہیں۔آج میں نے امکان بھر تلاش کی،نہیں ملی ورنہ دیکھ کر بھیجتا۔مختلف کلام کثرت سے جمع ہیں۔اس میں کہیں بے ترتیبی سے ادھر ادھر ہوگئی ہوگی جواب ڈھونڈھے سے نہیں ملتی۔اطلاعاً آپ کو لکھ دیا۔

رام پور،۲/مئی ۱۸۹۵ء امیر فقیر

10.4 اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز وارتقا

جہاں اردو میں فارسی کی تقلید سے کئی اصناف معرض وجود میں آئیں وہیں اردو مکتوب نگاری کا وجود بھی فارسی ادب کا مرہون منت ہے۔اردو خطوط نگاری کے ابتدائی نمونے دکن کے مضافات میں ملتے ہیں۔پروفیسر عنوان چشتی کی تحقیق کے مطابق اردو کا اولین خط چھ دسمبر ۱۸۲۲ء میں تحریر کیا گیا۔لیکن یہ خط شاید پہلا دریافت شدہ خط ہے۔اندازے کے مطابق اردو میں اس سے پہلے خطوط لکھے جا چکے تھے لیکن ان کا رجحان عام نہ تھا۔ابتدا میں نثر کے ساتھ منظوم خطوط کا بھی چلن تھا۔حوالے کے طور پر شیر محمد خاں ایمانؔ کے منظوم خط کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

تھی نثر میں یہ ترقیم نادر
ٹک ایک شکوہ ہوتا تھا صادر
یعنی کہ اپنی خط و کتابت
خاطر پہ لائے سایۂ کدورت

اردو غزل کو جدت،معنویت اور تہہ داری عطا کرنے کا سہرا غالب کے سر جاتا ہے۔جہاں ایک طرف غالب نے اردو کی غزلیہ شاعری کو نئے زاویے عطا کیے،وہیں دوسری جانب اردو مکتوب نگاری کی باقاعدہ صحت مند داغ بیل ڈالی۔گو کہ غالب سے پہلے اردو

مکتوب نگاری کی روایت جڑ پکڑ چکی تھی لیکن غالب نے اسے نئے جہات سے روشناس کرایا۔فرسودہ القاب وآداب کومتروک کر براہ راست خطاب کیا۔تکلف اور تصنع کوترک کر سادگی اور بے تکلفی کا انداز اختیار کیا۔غالب اوران کے معاصرین نے الگ راہ نکالنے کی ہرممکن کوشش کی لیکن غالب کی انفرادیت تک کسی اور کی رسائی نہ ہوسکی۔رجب علی بیگ سرور کے مجموعہ' انشائے سرور' کو پہلی مرتبہ مرزا احمد علی نے شائع کیا۔۱۸۳۶ء میں سرور کے مکاتیب کا مجموعہ نول کشور پریس لکھنؤ سے اشاعت پذیر ہوا۔ان خطوط میں فرسودہ روایت سے انحراف صاف دکھائی دیتا ہے۔غلام غوث بے خبر کے اب تک دو مکاتیب کے مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ایک 'فغانِ بے خبر' اور دوسرا 'انشائے بے خبر' کے نام سے ہیں۔'فغانِ بے خبر' دستیاب نہیں ہے جب کہ 'انشائے بے خبر' کومرتضیٰ حسین بلگرامی نے ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔بے خبر کی تحریر سرور اور غالب کے مابین ایک ایسی کڑی تصور کی جاتی ہے جو کبھی غالب کے طرز سے ملتی ہے تو کبھی سرور کے انداز سے میل کھاتی ہے۔

10.5 اردو کے اہم مکتوب نگار

مرزا اسداللہ خاں غالب

غالب جتنے بڑے شاعر ہیں ان کی نثری حیثیت بھی اس سے کم تر قطعی تصور نہیں کی جاتی۔اگر وہ صرف خطوط نویسی پر ہی اکتفا کرتے تب بھی ان کا مرتبہ بلند ہی رہتا۔غالب نے جو خطوط لکھے ہیں۔تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔''عود ہندی'' اور''اردوئے معلیٰ'' ان کے خطوط کے مجموعے ہیں۔عود ہندی کو۱۸۶۸ء میں منشی ممتاز علی خاں نے مرتب کیا جب کہ اردوئے معلیٰ کو ۱۸۶۹ء میں حکیم غلام رضا خاں نے ترتیب دے کر شائع کیا۔غالب نے جب خط لکھنا شروع کیا تو اس دور کی مکتوب نگاری پر فارسی و عربی القاب وآداب کی بہتات تھی۔تکلف وتصنع سے پُر مسجع ومقفیٰ عبارت لکھنے کا چلن عام تھا۔غالب نے غیر ضروری فقرے بندی اور القاب وآداب ترک کر کے براہ راست خطاب کرنے پر انحصار کیا۔انھوں نے غیر مانوس الفاظ کے بجائے سادہ وعام فہم زبان استعمال کی۔مخاطب کے لیے صرف 'میاں، مرزا، قبلہ، مرشد، میری جان' وغیرہ جیسے مختصر ترین القاب استعمال کیے۔ان کے خطوط میں اس بات کی طرف توجہ دی گئی کہ سب کچھ مضمون میں ہی ہو، کم سے کم الفاظ میں اپنی بات ادا کر دی جائے۔جیسا کہ وہ لکھتے ہیں 'چاہتا ہوں کہ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہہ دوں اور تحریر کو تقریر کا آئینہ بنا دوں'' اس طرح سے انھوں نے مراسلے کو ایک کامیاب مکالمہ بنا کر اردو مکتوب نگاری میں نئے باب کا اضافہ کیا۔مثال کے طور پر ان کا یہ خط ملاحظہ کیجیے۔

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

> لاحول ولاقوۃ، کس ملعون نے بہ سبب ذوقِ شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔میں نے تو یہ طریق قہر درویش بہ جانِ درویش لکھا تھا۔جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔

غالب نے شاعری کی طرح نثر میں بھی جدت سے کام لیا۔ان کے عہد میں اور بعد میں بھی بہت سے ادیبوں نے مکتوب نگاری

میں ہاتھ آزمایا لیکن وہ غالب کے کمال تک نہ پہنچ سکے۔ حامد حسن قادری کے بقول:

''اردو نثر میں غالب کی اولویّت اور اولیت ان کے رقعات کے سبب ہے۔ اردو میں خطوط نویسی کا غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا اور اس میں جو جدتیں پیدا کیں اور ان کو جس التزام، اہتمام اور کمال کے ساتھ برتا اس میں غالب اول بھی ہیں اور آخر بھی۔''

(داستان تاریخ اردو، ص:۲۴۱)

مولانا الطاف حسین حالی

غالب نے اپنے شاگردوں کی بہت بڑی جماعت تیار نہیں کی لیکن چنندہ شاگردوں میں خواجہ الطاف حسین حالی کا نام نمایاں ہے۔ حالی نے غالب کی راہ پر چلتے ہوئے خطوط کے دو مجموعے چھوڑے جسے ان کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے ۱۹۲۵ء میں شائع کرایا۔ ان مجموعوں میں بہت ساری خامیاں اور کمیاں ہیں ساتھ ہی والد سے محبت وعقیدت کی وجہ سے بعض معلومات حذف کر دی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر خواتین کے ناموں کی جگہ نقطے لگا دئے گئے ہیں جو اس عہد تک زندہ تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرتب نے ادبی دیانت داری کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے رشتے کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ خواجہ سجاد حسین کے بعد مولوی اسمٰعیل پانی پتی نے مکاتیب حالی کے عنوان سے ایک مجموعہ شائع کرایا۔ اس مجموعہ میں حالی کے غیر مطبوعہ خطوط شامل کیے۔ اس میں ایک سو گیارہ (۱۱۱) اردو کے اور عربی و فارسی کے اڑتیس (۳۸) خطوط شامل ہیں۔ یہ خطوط بیشتر عزیزوں اور رشتے داروں کے نام ہیں۔ اس میں حالی نے اپنی ذاتی زندگی کے معاملات بیان کیے ہیں۔ بعض خطوط سے تنقیدی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حالی کے ایک خط کا نمونہ درج کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

بنام مولوی حمید الدین بی اے

پانی پت

۲۰ر جولائی ۱۹۰۴ء

جناب من!

شمس العلماء کا خطاب ملنے پر جس گرم جوشی اور مسرت کے ساتھ آپ نے خاکسار کو مبارک باد دی ہے۔ اس کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہوں اور اس کو اپنے لیے دستاویز فخر و امتیاز سمجھتا ہوں۔

آپ کے فصیح و بلیغ اشعار کو میں فخریہ کسی اخبار میں چھپواؤں گا مجھے ترجمہ کرنے کی اب تک فرصت نہیں ملی۔ آج کل میں مع ترجمہ کے بھیجوں گا۔ از راہ عنایت اپنی خیریت اور مزاج کی کیفیت سے کہ اب کیا صورت ہے جلدی مطلع کیجیے گا اور نیز کراچی کی آب و ہوا کا حال لکھیے گا کہ اب کیا رنگ ہے؟

میں آج کل حد سے زیادہ عدیم الفرصت ہوں ۔ نہ کسی تصنیف یا تالیف کے سبب
بلکہ محض مکروہات خانگی کی وجہ سے ۔ ورنہ آپ کا شکریہ ایسا سرسری طور پر معمولی الفاظ میں
ہرگز نہ لکھتا۔ زیادہ نیازمند

آپ کا نیازمند
الطاف حسین حالؔی

خواجہ الطاف حسین حالی اردو کے بنیادگزار ناقد ہیں۔ ان کا ذہن صاف ستھرا اور سادہ ہے۔ ان کے خطوط میں ان کی سادگی، منکسرالمزاجی، انسانون کے تیئں ہمدردی اور محبت کا جذبہ منعکس ہوتا ہے۔ ان کے خطوط ان کی شخصیت کا پرتو ہیں۔ بعض جگہ ان کی تحریروں میں ان کے مزاج کے برعکس مزاحیہ جملے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک خط میں اپنے بیٹے کو لکھا ہے: 'جوتا پاؤں پر غالب آجاتا ہے، پاؤں جوتے پر غالب نہیں آتا۔'

مولانا شبلی نعمانی

علامہ شبلی نعمانی سرسید اور حالی کے معاصرین میں سے ہیں۔ ان کی گفتگو عالمانہ ہوتی ہے۔ ان کے خطوط کے دو مجموعے ''مکاتیب شبلی'' اور ''خطوط شبلی'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ مکاتیب شبلی دو جلدوں پر مشتمل ہے جس میں سرسید احمد خاں، عبدالماجد دریابادی، ابوالکلام آزاد، مہدی افادی اور سید سلیمان ندوی جیسی اہم شخصیات کے نام خطوط موجود ہیں۔ ان اشخاص کے علاوہ حبیب الرحمٰن خاں، پروفیسر عبدالقادر وغیرہ کے نام بھی خطوط ملتے ہیں۔ خطوط شبلی میں زہرا بیگم اور عطیہ بیگم کے نام خطوط شامل ہیں۔ عطیہ بیگم کے نام خطوط ادب کی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان خطوط میں شبلی کی شخصیت کے وہ پہلو واضح ہوتے ہیں جو ان کی دیگر تحریروں میں نہیں ملتے۔ شبلی کی مکتوب نگاری سے متعلق سید سلیمان لکھتے ہیں: ''شبلی خط نہایت مختصر لکھتے تھے۔ کہیں کہیں صرف ہاں، نا پر اکتفا کرتے ہیں۔'' ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی خطوط میں نفس مضمون کی جانب زیادہ توجہ دیتے تھے۔ ان کے خط کا ایک نمونہ پیش ہے:

سید سلیمان ندوی کے نام

(۱) سب سے مقدم یہ ہے کہ ہر وفد کے ساتھ ایک اسپیکر ہو،

(۲) جہاں وفد جائے وہاں عام جلسہ کرائے، مقاصد ندوہ بیان کرے، بعض جلسوں میں صرف اسلام کے فضائل پر تقریریں کی جائیں، بعض خاص اہل علم کے جلسہ میں کسی علمی مسئلہ پر بیان کیا جائے، غرض ملک کو ندوہ کی تعلیم و تربیت کا نمونہ دکھایا جائے اور الندوہ کی اطلاع میں یہ غرض بھی ظاہر کی جائے،

(۳) صرف وہ طلبہ بھیجے جائیں جن کی وضع و قطع اسلامی ہو اور احکام شرعیہ کے پابند ہوں یعنی نماز و جماعت وغیرہ کے، اگر طلبہ اچھا نمونہ دکھائیں گے تو قطعی کامیابی ہوگی۔

شبلی، ۵؍جنوری ۱۹۰۶ء

مہدی افادی

مہدی افادی اردو کے رومانی قلم کاروں میں نمایاں اہمیت اور مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں افادات مہدی اور مکاتیب مہدی دو تصانیف چھوڑے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ افادات مہدی، مہدی افادی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جب کہ مکاتیب مہدی ان کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

ابتدا میں مہدی افادی نے شبلی کے رنگ میں خط لکھنا شروع کیا لیکن بعد میں اپنی جدا راہ نکالی۔ ان کی تحریروں میں حسن بیان، سلیقہ، شائستگی، جملوں کی خوبصورت ساخت پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ ان کی تمام تحریروں میں رومانی عکس غالب ہے۔ ان کا منفرد اسلوب اور شگفتہ انداز بیان قاری کو ہمیشہ متاثر کرتا ہے۔ مہدی افادی فطرت پرست ہیں۔ وہ مناظر فطرت کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی تحریروں میں اس کا خوب سے خوب تر استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے کم وبیش تمام ادبا سے راہ و رسم رکھی۔ ان میں حالی، شبلی، ریاض خیر بادی، عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی کا ذکر خاص طور پر ملتا ہے۔

مہدی افادی نے اردو میں ایک نئے طرز تحریر کی بنیاد ڈالی۔ گو کہ ان کا پیشہ اس سے بالکل منفرد تھا۔ وہ پیشے سے ایک تحصیل دار تھے۔ ان کے خطوط رنگینیِ عبارت سے تعبیر ہیں۔ مکاتیب مہدی میں ان کی جمالیاتی حس اور شوخ بیانی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر عبدالماجد دریابادی کو لکھا ہوا یہ خط ملاحظہ کیجیے:

بنام عبدالماجد دریابای

تحصیل اکبر پور، کانپور، ۳؍ستمبر ۱۹۱۸ء

پیارے ماجد! پچھلی تحریر کے بعد پھر آپ کا کچھ پتہ نہیں چلا، سنا اس درمیان میں واقعات کی رفتار بدلی۔ آپ اور آپ کے یارانِ طریقت نے ''شاہی محل میں دعوت کھائی۔''

کفر جس قدر رنگ لایا تھا، صفائی بھی اسی پایہ کی رہی فتوؤں کی بھرمار ہوگئی۔ مشکل سے کوئی اخبار اس سے خالی ہوتا ہے۔ میں نے بھی وقت کی چیز سمجھ کر ''ہم دم'' کو ایک طولانی کھلی چٹھی لکھی تھی لیکن کسی اخباری مصلحت (؟) سے اب تک وہ شائع نہ ہوسکی جس کا افسوس ہے۔

اگر مطلع غبار آلود۔ کچھ صاف ہوگیا ہے تو کیا یہ موجودہ لائق عزت ''شیخ الاسلام'' دکن کا تصرف ہے؟ مفصل لکھیے۔ ضابطہ کہ چند سطریں نہیں

مولوی عبدالحق کیا رہے؟

انجمن اردو پر تو کچھ آنچ نہیں آئی۔ ایک خلش ہو تو لکھوں۔ ایک زنجیر ہے جس کی کوئی

کڑی غیر ضروری نہیں۔

''ہوش'' غریب کا کچھ حال معلوم ہے؟ اب کہاں سے ابھریں گے۔علی گڑھ سے قصد تھا۔میں نے اتفاق کیا۔پھر لکھنؤ کی صلاح دی گئی۔

کچھ میرے مطلب کی بے پوچھی باتیں لکھیے۔مولانائے شروانی کا ایک نہایت دلچسپ صحیفہ ملا۔چند فقرے سلیمان اعظم کو اقتباساً بھیجے

سیرۃ نبوی کے ابتدائی اجزا ''مقدمہ'' کی حیثیت سے پڑھے اور دل بھر آیا کہ یہ لٹریچر اب کہاں؟ جواباً لکھیے۔مگر ذرا جلد حضرت بسمل کی خدمت میں اشتیاق غائبانہ کی تقریب

مہدی

علامہ اقبال

اردو نظم نگاری کے بڑے شعرا میں شامل اقبال کی نثری تصانیف کا سرمایہ ان کے شعری سرمایے سے کم نہیں ہے۔ان کے مکاتیب کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔مظفر حسین برنی کا مرتب کردہ مجموعہ مکاتیب اقبال چار جلدوں پر مشتمل اردو کا ایک ضخیم سرمایہ ہے۔اس کے علاوہ شیخ عطاءاللہ نے اقبال نامہ خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی،اقبال نامہ حصہ دوم مرتب کیا۔مکتوب اقبال بنام سید نذیر نیازی،مکاتیب اقبال بنام گرامی مرتبہ محمد عبداللہ قریشی،خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی بھی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ اقبال کے بہت سارے خطوط اخبارات و رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔اقبال اردو کے علاوہ فارسی،انگریزی اور جرمن زبان میں بھی خطوط لکھتے تھے۔ان خطوط میں اقبال کی زندگی کے مختلف پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ان میں اقبال کے سیاسی وملی نظریات،ادبی افکار کے علاوہ ان کی ذاتی زندگی کا بیان ملتا ہے۔اقبال کے خطوط کی زبان صاف ستھری اور سلیس ہے۔ان خطوط سے اقبال کی سادہ لوحی اور انکسار کا پتہ چلتا ہے۔مثال کے طور پر اقبال کا ایک خط ملاحظہ کیجیے:

خط بنام سید سلیمان ندوی

لاہور،۲۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء

مخدومی،السلام علیکم

سیرۃ عائشہ کے لیے سراپا سپاس ہوں۔یہ ہدیۂ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے۔اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔

یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ ''حمیرا'' والی سب احادیث موضوعات میں ہیں۔کیا ''کلیمنی یا حمیرا'' بھی موضوع ہے؟ کمال کا شعر کیا مزے کا ہے:

اس تصرف ہائے من در شعرِ من
کلیمنی یا حمیرائے من است

زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص محمد اقبال

اقبال کے خطوط سے اقبال کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے خطوط کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑ رکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں مراسلت کو بدرجۂ اتم سمجھا۔ اختلاف ہوا تو خط لکھے، دوستی محبت میں خطوط لکھے، سیاسی تبادلۂ خیال کے لیے خط لکھے، بیمار ہوئے تو خط لکھے، غرض کہ اقبال نے زندگی کے تمام ارکان سے متعلق اپنے خطوط میں گفتگو کی ہے۔ ان کے خطوط ہر طرح کے تکلف سے عاری ہیں۔ وہ نفس مضمون کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور بے جا عبارت آرائی سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے خطوط سے ان کی شخصیت اور سوانح پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے خطوط کی زبان بے باک اور قطعیت سے پُر ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مکتوب نگاری کو غالب کے بعد جس شخص نے بام عروج عطا کیا وہ نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ ان کے خطوط اردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں جو عالمی ادب کے برابر رکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے خطوط کاروان خیال، مکاتیب ابوالکلام، نقش آزاد، تبرکات آزاد اور میرا عقیدہ کے نام سے منظر عام پر آئے۔ لیکن ان تمام کو وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جو غبار خاطر کو ملی۔ غبار خاطر میں مولانا آزاد نے حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام خطوط لکھے ہیں۔ یہ خطوط انھوں نے قلعہ احمد نگر میں قید کی زندگی بسر کرتے ہوئے لکھے۔ ان خطوط کا زمانہ ۳/ اگست ۱۹۴۲ سے ۳/ دسمبر ۱۹۴۵ کے درمیان کا ہے۔ نمونے کے لیے غبار خاطر کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

بنام حبیب الرحمٰن خاں شروانی

قلعہ احمد نگر

۷/ جنوری ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ سردی اپنے پورے عروج پر ہے۔ کمرہ کا دروازہ اور کھڑکی کھلی چھوڑ دی ہے۔ ہوا کے برفانی جھونکے دم بدم آرہے ہیں۔ چائے دم دے کے ابھی ابھی رکھی ہے۔ منتظر بیٹھا ہوں کہ پانچ چھ منٹ گزر جائیں اور رنگ و کیف اپنے معیاری درجہ پر آجائے تو دور شروع کروں۔ دو مرتبہ نگاہ گھڑی کی طرف اٹھ چکی ہے مگر پانچ منٹ ہیں کہ کسی طرح ہونے پر نہیں آتے۔ خواجہ شیراز کا ترانہ صبح گاہی دل و دماغ میں گونج رہا ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ گنگناؤں مگر ہمسایوں کی نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ لبوں کو کھلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ناچار نوکِ قلم کے حوالہ کرتا ہوں:

صبح ست و ژالہ می چکد از ابرِ بہمنی
برگِ صبوح ساز و بزن جام یک منی

گر صبح دم خمار ترا دردِ سر دہد
پیشانی خمار ہماں بہ کہ بشکنی
ساقی، بہوش باش، کہ غم درکمینِ ماست
مطرب، نگاہ دار ہمیں رہ کہ مے زنی
ساقی، بہ بے نیازیِ یزداں کہ مے بیار
تا بشنوی ز صوتِ مغنی ''ہوالغنی''

اس علاقہ میں عام طور پر سردی بہت ہلکی ہوتی ہے۔معلوم نہیں کبھی اس طرف بھی آپ کا گزر ہوا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوا ہے تو کس موسم میں؟ لیکن پونا تو آپ بارہا گئے ہوں گے۔دسمبر ۱۹۱۵ء کا سفر مجھے بھی یاد ہے جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے موقعہ پر آپ سے وہاں ملاقات ہوئی تھی۔پونا یہاں صرف اسّی میل کی مسافت پر واقع ہے اور دکن کا یہ تمام حصہ ایک ہی سطح مرتفع ہے۔اس لیے یہاں کی موسمی حالت کو پونا پر قیاس کر لیجیے۔علاوہ بریں وقت کے زندانی کچھ پونا میں رکھے گئے ہیں۔کچھ یہاں اس لیے ویسے بھی اہل قیاس کے نزدیک بقول عرفی دونوں کا حکم ایک ہی ہوا:

یکے ست نسبتِ شیرازی و بدخشانی

حاصل یہ ہے کہ خطوط نگاری اردو نثر کی غیر افسانوی صنف ہے لیکن اس سے متعلق یہ بات بجا طور پر کہنا مشکل ہے کہ اس صنف کا آغاز کہاں ہوا۔ابتدا میں اس حوالے سے جو نکات درج کیے گئے ہیں وہ بھی ایک اندازہ ہی ہے جو کہ دریافت شدہ خطوط کے سرمائے سے حاصل ہوا۔ابتدائی خطوط منظوم شکل میں بھی لکھے جاتے تھے جس کی مثال ابتدا میں فراہم کرائی گئی ہے۔عہد حاضر میں ذاتی خطوط کی جگہ واٹس ایپ میسجز نے لے لی ہے جب کہ دفتری خطوط کی جگہ ای۔میل کا سہارا لیا جانے لگا ہے۔

10.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

خطوط نگاری کے فن سے واقفیت حاصل کی۔

خطوط کے اقسام کو جانا اور کچھ خطوط کے نمونے بھی دیکھے۔

خطوط نگاری کے آغاز وارتقا سے آگاہ ہوئے۔

اردو کے اہم مکتوب نگاروں کی مکتوب نگاری کا مطالعہ کیا۔

10.7 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال:1۔ خطوط نگاری کا فنی جائزہ لیجیے؟

سوال:2۔ خطوط کے اقسام کو وضاحت کے ساتھ بیان کیجیے؟

سوال:3۔ اردو کے چند مکتوب نگاروں کی مکتوب نگاری پر روشنی ڈالیے؟

10.8 سوالات کے جوابات

جواب1۔

خطوط نگاری کا فن اور اس کے اصول وضوابط

- ابتدا میں خطوط پُر تکلف اور لفظی تصنع سے پُر ہوا کرتے تھے۔مخاطب کو بے جا آداب والقاب سے متاثر کیا جاتا تھا۔

اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ قافیہ پیمائی اور القاب کے بے جا استعمال سے عبارت میں بے جا تصنع اور بناوٹ پیدا ہو جاتی تھی اور نفس مضمون انہیں میں کہیں غائب ہو جاتا۔ غالب نے اپنے مزاج کے مطابق روایت سے انحراف کرتے ہوئے فرسودہ رسموں کو ترک کرنئی بنا ڈالی اور نئے اصول وضع کیے۔

- ابتدا میں مخاطب کو اس کے ذاتی مراتب کے اعتبار سے مخاطب کیا جائے۔
- القاب وآداب اور بے جا رسمی گفتگو سے اجتناب کیا جائے۔
- نفس مضمون کو تصنع اور عبارت آرائی سے گنجلک بنانے کی بجائے صاف ستھرے اور سلیس زبان کا استعمال کیا جائے۔
- زبان کی صحت اور اس کی خوبی کا خیال رکھتے ہوئے الفاظ کے دہراؤ سے بچا جائے۔
- بے جا طوالت سے حتی الامکان گریز کیا جائے۔
- غالب کے بیان کردہ اصول اور مستعمل زبان نے بلاشبہ اردو خطوط نگاری کو ایک مکمل اور صحت مند فن کے طور پر

متعارف کرایا۔

خطوط کے جزو

- مکتوب نگار کا نام اور پتہ
- تحریر کی تاریخ
- القاب وآداب
- نفس مضمون
- اختتام
- مکتوب نگار کے دستخط اور نام و پتہ
- عہد حاضر میں ای۔میل کا پتہ اور واٹس ایپ نمبر بھی درج کیا جاتا ہے۔

سرکاری، دفتری یا کاروباری خطوط میں تاریخِ تحریر کے بائیں جانب ایک نشان بنایا جاتا ہے جسے اردو میں 'نشانِ مجاریہ' کہتے ہیں۔اس کا مقصد متعلقہ فائل سے اس کی نسبت معلوم کرنا ہے۔

سرکاری یا دفتری خطوط میں آسانی کے لیے مضمون لکھ کر خط کا موضوع بیان کر دیا جاتا ہے تاکہ ابتدا میں ہی پتہ چل سکے کہ یہ مراسلہ کس مضمون سے متعلق ہے۔

اگر اس حوالے سے پہلے ہی مراسلے ہو چکے ہیں تو ان مراسلوں کے حوالے بھی درج کیے جاتے ہیں، بعض دفعہ اس کی کاپیاں بھی اس کے ساتھ منسلک کی جاتی ہے۔

مضمون کا اختتام بات مکمل ہوتے ہی ہو جاتا ہے۔ بے جا کلمات سے اجتناب برتتے ہوئے نام اور دستخط کے ساتھ تاریخ درج کی جاتی ہے۔ضرورت کے مطابق مہر بھی ثبت کرتے ہیں۔

جدید رواج کے مطابق مکتوب الیہ کا نام اور پتہ، مضمون وغیرہ ساری ضروری باتیں دائیں جانب سے شروع کی جاتی ہیں۔ ان کے لیے الگ سے پیرا گراف کا نشان درج نہیں کیا جاتا ہے۔

جواب2۔

خطوط کے اقسام

اس ضمن میں نجی یا ذاتی، کاروباری، تجارتی، اخباری اور دفتری خطوط کے علاوہ ادیبوں اور دانشوروں کے ذاتی خطوط آتے ہیں۔ نجی یا ذاتی خطوط کا ایک نمونہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

نجی یا ذاتی خط

اویس اختر

بورنگ روڈ، پٹنہ

مکرمی بڑے بھائی

سلام مسنون

میں بخیر و عافیت پٹنہ پہنچ چکا ہوں۔کل میرا امتحان ہو گیا، اس امتحان کے نتیجے کے بعد تقریری امتحان اگلے ہفتے ہونا طے پایا ہے۔ امید ہے کہ دونوں مراحل میں کامیابی حاصل ہوگی۔ آپ کی عنایت کردہ رقم سے رہائش اور طعام کا کام بحسن وخوبی ہو رہا ہے۔ داخلہ ہونے کے بعد آپ کو اطلاع کروں گا۔

والسلام

دعاؤں کا طالب

آپ کا چھوٹا بھائی

(اویس اختر)

دفتری/سرکاری خطوط کانمونہ

تقرر کے لیے پرنسپل کو خط

بلال احمد

پھول پور، اعظم گڑھ

جناب پرنسپل صاحب

مضمون: درخواست برائے تقرر اردو

حضور والا، اخباری تشہیر سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کے اسکول (اسکول کا نام) میں اردو استاد کی ضرورت ہے۔ میں نے الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن سے کامیابی حاصل کی ہے۔ میں خود کو اس عہدے کے لیے لائق خیال کرتا ہوں، آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری تقرری سے آپ کے اسکول کا نام مزید روشن ہوگا۔

ازراہ کرم میری درخواست پر غور فرماتے ہوئے مجھے خدمت کا موقع عنایت فرمائیں۔

نیازمند

(دستخط امیدوار)

بلال احمد

تاریخ۔۔۔۔۔۔

ادیب کے خط کانمونہ

مکتوب امیر مینائی بنام دل شاہجہاں پوری

مجبی سلام مسنون

دعائے مشحون بہت سے گرامی نامے آپ کے آکر باعث شکر گزاری ہوئے۔ رنجوری و معذوری نے مجھے جواب دینے سے محروم رکھا۔ اس وقت ۲۸/اپریل کا کارڈ پیش نظر ہے۔ اس کا جواب سنئے۔ چلمن نہ فارسی ہے نہ عربی اس کی اضافت فارسی کی ہرگز جائز نہ ہوگی جانب متھرا اس کے لیے سند نہیں متھرا علم ہے شہر کا نام ہے اس کا ترجمہ عربی فارسی میں کیا ہوگا۔ لہٰذا یہی لفظ ترکیبوں کے ساتھ بلا تردّد باندھئے آپ کا مصرع جس میں پسِ چلمن ہے یوں اصلاح ہو سکتی ہے۔

دلِ صد چاک میں دیکھا رخِ روشن ان کا
ہم نے نظّارہ کیا ڈال کے چلمن ان کا

آپ ہر خط میں اپنی غزل طلب کرتے ہیں۔ آج میں نے امکان بھر تلاش کی، نہیں ملی ورنہ دیکھ کر بھیجتا۔ مختلف کلام کثرت سے جمع ہیں۔ اس میں کہیں بے ترتیبی سے ادھر ادھر ہوگئی ہوگی جواب ڈھونڈھے سے نہیں ملتی۔ اطلاعاً آپ کو لکھ دیا۔

رام پور،۲؍مئی ۱۸۹۵ء امیر فقیر

جواب3۔

مرزا اسداللہ خاں غالب

غالب جتنے بڑے شاعر ہیں ان کی نثری حیثیت بھی اس سے کم تر قطعی تصور نہیں کی جاتی۔ اگر وہ صرف خطوط نویسی پر ہی اکتفا کرتے تب بھی ان کا مرتبہ بلند ہی رہتا۔ غالب نے جو خطوط لکھے ہیں۔ تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔''عود ہندی'' اور''اردوئے معلیٰ'' ان کے خطوط کے مجموعے ہیں۔ عود ہندی کو ۱۸۶۸ء میں منشی ممتاز علی خاں نے مرتب کیا جب کہ اردوئے معلیٰ کو ۱۸۶۹ء میں حکیم غلام رضا خاں نے ترتیب دے کر شائع کیا۔ غالب نے جب خط لکھنا شروع کیا تو اس دور کی مکتوب نگاری پر فارسی و عربی القاب وآداب کی بہتات تھی۔ تکلف وتصنع سے پُر مسجع ومقفیٰ عبارت لکھنے کا چلن عام تھا۔ غالب نے غیر ضروری فقرے بندی اور القاب وآداب ترک کر کے براہ راست خطاب کرنے پر انحصار کیا۔ انھوں نے غیر مانوس الفاظ کے بجائے سادہ وعام فہم زبان استعمال کی۔ مخاطب کے لیے صرف 'میاں، مرزا، قبلہ، مرشد، میری جان' وغیرہ جیسے مختصر ترین القاب استعمال کیے۔ ان کے خطوط میں اس بات کی طرف توجہ دی گئی کہ سب کچھ مضمون میں ہی ہو، کم سے کم الفاظ میں اپنی بات ادا کر دی جائے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں 'چاہتا ہوں کہ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہہ دوں اور تحریر کو تقریر کا آئینہ بنا دوں'' اس طرح سے انھوں نے مراسلے کو ایک کامیاب مکالمہ بنا کر اردو مکتوب نگاری میں نئے باب کا اضافہ کیا۔ مثال کے طور پر ان کا یہ خط ملاحظہ کیجیے۔

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

> لاحول ولاقوۃ، کس ملعون نے بہ سبب ذوقِ شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو یہ طریق قہر درویش بہ جانِ درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔

غالب نے شاعری کی طرح نثر میں بھی جدت سے کام لیا۔ ان کے عہد میں اور بعد میں بھی بہت سے ادیبوں نے مکتوب نگاری میں ہاتھ آزمایا لیکن وہ غالب کے کمال تک نہ پہنچ سکے۔ حامد حسن قادری کے بقول:

> ''اردو نثر میں غالب کی اولویّت اور اولیت ان کے رقعات کے سبب ہے۔ اردو میں خطوط نویسی کا غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا اور اس میں جو جدتیں پیدا کیں اور ان کو جس التزام، اہتمام اور کمال کے ساتھ برتا اس میں غالب اول بھی ہیں اور آخر بھی۔''

(داستان تاریخ اردو، ص:۲۴۱)

مولانا الطاف حسین حالی

غالب نے اپنے شاگردوں کی بہت بڑی جماعت تیار نہیں کی لیکن چنندہ شاگردوں میں خواجہ الطاف حسین حالی کا نام نمایاں ہے۔حالی نے غالب کی راہ پر چلتے ہوئے خطوط کے دو مجموعے چھوڑے جسے ان کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے ۱۹۲۵ء میں شائع کرایا۔ ان مجموعوں میں بہت ساری خامیاں اور کمیاں ہیں ساتھ ہی والد سے محبت وعقیدت کی وجہ سے بعض معلومات حذف کر دی گئی ہیں۔مثال کے طور پر خواتین کے ناموں کی جگہ نقطے لگا دئے گئے ہیں جو اس عہد تک زندہ تھے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرتب نے ادبی دیانت داری کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے رشتے کو زیادہ اہمیت دی ہے۔خواجہ سجاد حسین کے بعد مولوی اسمٰعیل پانی پتی نے مکاتیب حالی کے عنوان سے ایک مجموعہ شائع کرایا۔اس مجموعہ میں حالی کے غیر مطبوعہ خطوط شامل کیے۔اس میں ایک سو گیارہ (۱۱۱) اردو کے اور عربی و فارسی کے اڑتیس (۳۸) خطوط شامل ہیں۔ یہ خطوط بیشتر عزیزوں اور رشتے داروں کے نام ہیں۔اس میں حالی نے اپنی ذاتی زندگی کے معاملات بیان کیے ہیں۔بعض خطوط سے تنقیدی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے۔حالی کے ایک خط کا نمونہ درج کیا جارہا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

بنام مولوی حمید الدین بی اے

پانی پت

۲۰ رجولائی ۱۹۰۴ء

جناب من!

شمس العلماء کا خطاب ملنے پر جس گرم جوشی اور مسرت کے ساتھ آپ نے خاکسار کو مبارک باد دی ہے۔اس کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہوں اور اس کو اپنے لیے دستاویز فخر و امتیاز سمجھتا ہوں۔

آپ کے فصیح و بلیغ اشعار کو میں فخریہ کسی اخبار میں چھپواؤں گا مجھے ترجمہ کرنے کی اب تک فرصت نہیں ملی۔آج کل میں مع ترجمہ کے بھیجوں گا۔از راہ عنایت اپنی خیریت اور مزاج کی کیفیت سے کہ اب کیا صورت ہے جلدی مطلع کیجیے گا اور نیز کراچی کی آب و ہوا کا حال لکھیے گا کہ اب کیا رنگ ہے؟

میں آج کل حد سے زیادہ عدیم الفرصت ہوں۔ نہ کسی تصنیف یا تالیف کے سبب بلکہ محض مکروہات خانگی کی وجہ سے۔ ورنہ آپ کا شکریہ ایسا سرسری طور پر معمولی الفاظ میں ہرگز نہ لکھتا۔زیادہ نیازمند

آپ کا نیازمند

الطاف حسین حالی

خواجہ الطاف حسین حالی اردو کے بنیاد گزار ناقد ہیں۔ ان کا ذہن صاف ستھرا اور سادہ ہے۔ ان کے خطوط میں ان کی سادگی، منکسر المزاجی، انسانوں کے تئیں ہمدردی اور محبت کا جذبہ منعکس ہوتا ہے۔ ان کے خطوط ان کی شخصیت کا پرتو ہیں۔ بعض جگہ ان کی تحریروں میں ان کے مزاج کے برعکس مزاحیہ جملے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک خط میں اپنے بیٹے کو لکھا ہے: ' جوتا پاؤں پر غالب آجاتا ہے، پاؤں جوتے پر غالب نہیں آتا۔'

مولانا شبلی نعمانی

علامہ شبلی نعمانی سرسید اور حالی کے معاصرین میں سے ہیں۔ ان کی گفتگو عالمانہ ہوتی ہے۔ ان کے خطوط کے دو مجموعے ''مکاتیب شبلی'' اور ''خطوط شبلی'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ مکاتیب شبلی دو جلدوں پر مشتمل ہے جس میں سرسید احمد خاں، عبدالماجد دریابادی، ابوالکلام آزاد، مہدی افادی اور سید سلیمان ندوی جیسی اہم شخصیات کے نام خطوط موجود ہیں۔ ان اشخاص کے علاوہ حبیب الرحمٰن خاں، پروفیسر عبدالقادر وغیرہ کے نام بھی خطوط ملتے ہیں۔ خطوط شبلی میں زہرا بیگم اور عطیہ بیگم کے نام خطوط شامل ہیں۔ عطیہ بیگم کے نام خطوط ادب کی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان خطوط میں شبلی کی شخصیت کے وہ پہلو واضح ہوتے ہیں جو ان کی دیگر تحریروں میں نہیں ملتے۔ شبلی کی مکتوب نگاری سے متعلق سید سلیمان لکھتے ہیں: ''شبلی خط نہایت مختصر لکھتے تھے۔ کہیں کہیں صرف ہاں، نا پر اکتفا کرتے ہیں۔'' ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی خطوط میں نفس مضمون کی جانب زیادہ توجہ دیتے تھے۔ ان کے خط کا ایک نمونہ پیش ہے:

سید سلیمان ندوی کے نام

(۱) سب سے مقدم یہ ہے کہ ہر وفد کے ساتھ ایک اسپیکر ہو،

(۲) جہاں وفد جائے وہاں عام جلسہ کرائے، مقاصد ندوہ بیان کرے، بعض جلسوں میں صرف اسلام کے فضائل پر تقریریں کی جائیں، بعض خاص اہل علم کے جلسہ میں کسی علمی مسئلہ پر بیان کیا جائے، غرض ملک کو ندوہ کی تعلیم و تربیت کا نمونہ دکھایا جائے اور الندوہ کی اطلاع میں یہ غرض بھی ظاہر کی جائے،

(۳) صرف وہ طلبہ بھیجے جائیں جن کی وضع و قطع اسلامی ہو اور احکام شرعیہ کے پابند ہوں یعنی نماز و جماعت وغیرہ کے، اگر طلبہ اچھا نمونہ دکھائیں گے تو قطعی کامیابی ہوگی۔

شبلی، ۵؍جنوری ۱۹۰۶ء

مہدی افادی

مہدی افادی اردو کے رومانی قلم کاروں میں نمایاں اہمیت اور مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں افادات مہدی اور مکاتیب مہدی دو تصانیف چھوڑے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ افادات مہدی، مہدی افادی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جب کہ مکاتیب مہدی ان کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

ابتدا میں مہدی افادی نے شبلی کے رنگ میں خط لکھنا شروع کیا لیکن بعد میں اپنی جدا راہ نکالی۔ان کی تحریروں میں حسن بیان، سلیقہ، شائستگی، جملوں کی خوبصورت ساخت پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ان کی تمام تحریروں میں رومانی عکس غالب ہے۔ان کا منفرد اسلوب اور شگفتہ انداز بیان قاری کو ہمیشہ متاثر کرتا ہے۔مہدی افادی فطرت پرست ہیں۔وہ مناظر فطرت کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی تحریروں میں اس کا خوب سے خوب تر استعمال کرتے ہیں۔انھوں نے اپنے عہد کے کم و بیش تمام ادبا سے راہ ورسم رکھی۔ان میں حالی، شبلی، ریاض خیر بادی، عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی کا ذکر خاص طور پر ملتا ہے۔

مہدی افادی نے اردو میں ایک نئے طرز تحریر کی بنیاد ڈالی۔گو کہ ان کا پیشہ اس سے بالکل منفرد تھا۔وہ پیشے سے ایک تحصیل دار تھے۔ان کے خطوط رنگینیِ عبارت سے تعبیر ہیں۔مکاتیب مہدی میں ان کی جمالیاتی حس اور شوخ بیانی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔مثال کے طور پر عبدالماجد دریابادی کو لکھا ہوا یہ خط ملاحظہ کیجیے:

بنام عبدالماجد دریابای

تحصیل اکبر پور، کانپور، ۳ ستمبر ۱۹۱۸ء

پیارے ماجد! پچھلی تحریر کے بعد پھر آپ کا کچھ پتہ نہیں چلا، سنا اس درمیان میں واقعات کی رفتار بدلی۔آپ اور آپ کے یارانِ طریقت نے ''شاہی محل میں دعوت کھائی۔''

کفر جس قدر رنگ لایا تھا، صفائی بھی اسی پایہ کی رہی فتوؤں کی بھرمار ہوگئی۔مشکل سے کوئی اخبار اس سے خالی ہوتا ہے۔میں نے بھی وقت کی چیز سمجھ کر ''ہم دم'' کو ایک طولانی کھلی چٹھی لکھی تھی لیکن کسی اخباری مصلحت (؟) سے اب تک وہ شائع نہ ہوسکی جس کا افسوس ہے۔

اگر مطلع غبار آلود۔کچھ صاف ہوگیا ہے تو کیا یہ موجودہ لائق عزت ''شیخ الاسلام'' دکن کا تصرف ہے؟ مفصل لکھیے۔ضابطہ کہ چند سطریں نہیں

مولوی عبدالحق کیا رہے؟

انجمن اردو پر تو کچھ آنچ نہیں آئی۔ایک خلش ہو تو لکھوں۔ایک زنجیر ہے جس کی کوئی کڑی غیر ضروری نہیں۔

''ہوش'' غریب کا کچھ حال معلوم ہے؟ اب کہاں سے ابھریں گے۔علی گڑھ سے قصد تھا۔میں نے اتفاق کیا۔پھر لکھنؤ کی صلاح دی گئی۔

کچھ میرے مطلب کی بے پوچھی باتیں لکھیے۔مولانائے شروانی کا ایک نہایت دلچسپ صحیفہ ملا۔چند فقرے سلیمان اعظم کو اقتباساً بھیجے

سیرۃ نبوی کے ابتدائی اجزا ''مقدمہ'' کی حیثیت سے پڑھے اور دل بھر آیا کہ یہ لٹریچر
اب کہاں؟ جواباً لکھیے۔ مگر ذرا جلد حضرت بسمل کی خدمت میں اشتیاق غائبانہ کی تقریب

مہدی

علامہ اقبال

اردو نظم نگاری کے بڑے شعرا میں شامل اقبال کی نثری تصانیف کا سرمایہ ان کے شعری سرمایے سے کم نہیں ہے۔ ان کے مکاتیب کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مظفر حسین برنی کا مرتب کردہ مجموعہ مکاتیب اقبال چار جلدوں پر مشتمل اردو کا ایک ضخیم سرمایہ ہے۔ اس کے علاوہ شیخ عطاءاللہ نے اقبال نامہ خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی، اقبال نامہ حصہ دوم مرتب کیا۔ مکتوب اقبال بنام سید نذیر نیازی، مکاتیب اقبال بنام گرامی مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی بھی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ اقبال کے بہت سارے خطوط اخبارات و رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اقبال اردو کے علاوہ فارسی، انگریزی اور جرمن زبان میں بھی خطوط لکھتے تھے۔ ان خطوط میں اقبال کی زندگی کے مختلف پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان میں اقبال کے سیاسی وملی نظریات، ادبی افکار کے علاوہ ان کی ذاتی زندگی کا بیان ملتا ہے۔ اقبال کے خطوط کی زبان صاف ستھری اور سلیس ہے۔ ان خطوط سے اقبال کی سادہ لوحی اور انکسار کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر اقبال کا ایک خط ملاحظہ کیجیے:

خط بنام سید سلیمان ندوی

لاہور، ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء

مخدومی، السلام علیکم

سیرۃ عائشہ کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ ہدیۂ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔

یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ ''حمیرا'' والی سب احادیث موضوعات میں ہیں۔ کیا ''کلیمنی یا حمیرا'' بھی موضوع ہے؟ کمال کا شعر کیا مزے کا ہے:

اس تصرف ہائے من در شعرِ من
کلیمنی یا حمیرائے من است

زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص محمد اقبال

اقبال کے خطوط سے اقبال کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے خطوط کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑ رکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں مراسلت کو بدرجۂ اتم سمجھا۔ اختلاف ہوا تو خط لکھے، دوستی محبت میں خطوط لکھے، سیاسی تبادلۂ خیال کے لیے خط لکھے، بیمار ہوئے تو خط لکھے، غرض کہ اقبال نے زندگی کے تمام ارکان سے متعلق اپنے خطوط میں گفتگو کی ہے۔

ان کے خطوط ہر طرح کے تکلف سے عاری ہیں۔ وہ نفس مضمون کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور بے جا عبارت آرائی سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے خطوط سے ان کی شخصیت اور سوانح پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ان کے خطوط کی زبان بے باک اور قطعیت سے پُر ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مکتوب نگاری کو غالب کے بعد جس شخص نے بام عروج عطا کیا وہ نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ان کے خطوط اردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں جو عالمی ادب کے برابر رکھے جا سکتے ہیں۔ان کے خطوط کاروان خیال، مکاتیب ابوالکلام، نقش آزاد، تبرکات آزاد اور میرا عقیدہ کے نام سے منظر عام پر آئے۔لیکن ان تمام کو وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جو غبار خاطر کو ملی۔غبار خاطر میں مولانا آزاد نے حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام خطوط لکھے ہیں۔ یہ خطوط انھوں نے قلعہ احمد نگر میں قید کی زندگی بسر کرتے ہوئے لکھے۔ان خطوط کا زمانہ ۳ ؍اگست ۱۹۴۲ سے ۳ ؍دسمبر ۱۹۴۵ کے درمیان کا ہے۔نمونے کے لیے غبار خاطر کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

بنام حبیب الرحمٰن خاں شروانی

قلعہ احمد نگر

۷ ؍جنوری ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ سردی اپنے پورے عروج پر ہے۔ کمرہ کا دروازہ اور کھڑکی کھلی چھوڑ دی ہے۔ ہوا کے برفانی جھونکے دم بدم آرہے ہیں۔ چائے دم دے کے ابھی ابھی رکھی ہے۔منتظر بیٹھا ہوں کہ پانچ چھ منٹ گزر جائیں اور رنگ و کیف اپنے معیاری درجہ پر آ جائے تو دور شروع کروں۔ دو مرتبہ نگاہ گھڑی کی طرف اٹھ چکی ہے مگر پانچ منٹ ہیں کہ کسی طرح ہونے پر نہیں آتے۔خواجہ شیراز کا ترانہ صبح گاہی دل و دماغ میں گونج رہا ہے۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ گنگناؤں مگر ہمسایوں کی نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ لبوں کو کھلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ناچار نوکِ قلم کے حوالہ کرتا ہوں:

صبح ست و ژالہ می چکد از ابرِ بہمنی
برگِ صبوح ساز و بزن جام یک منی
گر صبح دم خمار ترا دردِ سر دہد
پیشانی خمار ہماں بہ کہ بشکنی
ساقی، بہوش باش، کہ غم درکمینِ ماست
مطرب، نگاہ دار ہمیں رہ کہ مے زنی
ساقی، بہ بے نیازیِ یزداں کہ مے بیار

تابشنوی ز صوتِ مغنی ''ہوالغنی''

اس علاقہ میں عام طور پر سردی بہت ہلکی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کبھی اس طرف بھی آپ کا گزر ہوا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوا ہے تو کس موسم میں؟ لیکن پونا تو آپ بارہا گئے ہوں گے۔ دسمبر ۱۹۱۵ء کا سفر مجھے بھی یاد ہے جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے موقعہ پر آپ سے وہاں ملاقات ہوئی تھی۔ پونا یہاں صرف اسّی میل کی مسافت پر واقع ہے اور دکن کا یہ تمام حصہ ایک ہی سطح مرتفع ہے۔ اس لیے یہاں کی موسمی حالت کو پونا پر قیاس کر لیجیے۔ علاوہ بریں وقت کے زندانی کچھ پونا میں رکھے گئے ہیں۔ کچھ یہاں اس لیے ویسے بھی اہل قیاس کے نزدیک بقول عرفی دونوں کا حکم ایک ہی ہوا:

یکے ست نسبتِ شیرازی و بدخشانی

حاصل یہ ہے کہ خطوط نگاری اردو نثر کی غیر افسانوی صنف ہے لیکن اس سے متعلق یہ بات بجا طور پر کہنا مشکل ہے کہ اس صنف کا آغاز کہاں ہوا۔ ابتدا میں اس حوالے سے جو نکات درج کیے گئے ہیں وہ بھی ایک اندازہ ہی ہے جو کہ دریافت شدہ خطوط کے سرمائے سے حاصل ہوا۔ ابتدائی خطوط منظوم شکل میں بھی لکھے جاتے تھے جس کی مثال ابتدا میں فراہم کرائی گئی ہے۔ عہد حاضر میں ذاتی خطوط کی جگہ واٹس ایپ میسیجز نے لے لی ہے جب کہ دفتری خطوط کی جگہ ای۔میل کا سہارا لیا جانے لگا ہے۔

10.9 فرہنگ

لفظ	:	معنی
گنجلک	:	پیچیدگی، الجھاؤ
مکاتیب	:	مکتوب کی جمع، خطوط
روشناس	:	جان پہچان والا، واقف
اکسیر	:	نہایت مفید، وہ دوا جس کے کھانے سے آدمی کبھی بیمار نہ ہو
مراسلہ	:	چٹھی، خط، نامہ
سلاطین	:	سلطان کی جمع، بادشاہ
مضافات	:	قرب وجوار، کسی شہر یا بستی کے آس پاس کی چھوٹی بستیاں
قاصد	:	پیغام لے جانے والا، نامہ بر
تصنع	:	بناوٹ، دکھاوا، مکر، دھوکا
فرسودہ	:	پرانا، گھسا ہوا

اجتناب	:	پرہیز، بچنا یا دور رہنا
طوالت	:	لمبائی (وقت یا فاصلے دونوں کے لیے)
حتی الامکان	:	جہاں تک ہو سکے، جس قدر ممکن ہو
دریافت شدہ	:	جو تحقیق سے حاصل کیا گیا ہو
صادر	:	نکلنے والا، جاری، نافذ
کدورت	:	میل، گندگی، کینہ، دل کا غبار
انحراف	:	انکار، نافرمانی، مخالفت
عدیم الفرصت	:	جسے بالکل فرصت نہ ہو
منکسر المزاجی	:	مزاج میں انکسار ہونا، خاکساری
غبار آلود	:	گرد میں بھرا ہوا، میلا
صحیفہ	:	کتاب، الہامی کتاب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی رسول پر اتاری گئی ہو

10.10 کتب برائے مطالعہ

شاداب تبسم : اردو مکتوب نگاری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۲۰۱۲

نورالحسن نقوی : غالب شاعر و مکتوب نگار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰

مکاتیب شبلی : معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۱

مکاتیب اقبال : مرتبہ: مظفر حسین برنی، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۹

غبار خاطر : مرتبہ: مالک رام، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۹۶

غالب کے خطوط : مرتبہ: خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۲۰۰۰

کاظم علی خاں : خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۱

اکائی: 11 خطوط غالب: ایک جائزہ

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 غالب کا مختصر سوانحی تعارف

11.4 غالب کی خطوط نگاری

11.5 آپ نے کیا سیکھا

11.6 اپنا امتحان خود لیجئے

11.7 سوالات کے جوابات

11.8 فرہنگ

11.9 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

☆ غالب کے حالات زندگی سے واقف ہوں گے۔

☆ غالب کے علمی وادبی کارناموں کو جانیں گے۔

☆ غالب کی خطوط نگاری سے واقفیت حاصل کریں گے۔

☆ خطوط غالب کی انفرادیت کا جائزہ لیں گے۔

11.2 تمہید

خطوط نگاری کو مکتوب نگاری بھی کہا جاتا ہے۔ فارسی کے زیر اثر اردو میں خط لکھنے کا رواج عام ہوا۔ اردو کے مکتوب نگاروں نے فارسی مکتوب نگاری کی تقلید کی۔ رفتہ رفتہ خطوط کا رواج اس قدر عام ہوگیا کہ مختلف زبانوں میں خط لکھے جانے لگے۔ اس نے ترقی کے منازل طے کر کے صنف کا درجہ اختیار کر لیا۔ آج وہی خطوط تحقیق وتدوین میں ایک مستند ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو کے شائع ہونے والے خطوط میں سب سے زیادہ اہمیت غالب کو حاصل ہوئی۔ کیوں کہ ان کے خط نجی نوعیت کے ہونے کے باوجود بھرپور بے تکلفی سے اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی حالات کی ایسی عمدہ عکاسی کرتے ہیں جو اس دور کے دوسرے ادیبوں کی تحریروں میں نظر نہیں آتے اور یہی چیز ان کے خطوط کو منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ بعد میں مختلف شعرا وادبا کے مجموعہ ہائے خطوط منظر عام

پر آئے جن کی حیثیت تاریخ ادب میں مسلم ہے۔

مرزا اسداللہ خاں غالب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ یہ نام اردو ادب کی دنیا میں ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے جو شاعری کے لطیف جذبات و احساسات کے سمندر میں ایک انمول موتی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں تو مرزا غالب بطور شاعر بے حد مشہور و معروف ہیں لیکن ان کے نثری کارنامے بھی کسی قدر کم نہیں۔ اگر صرف انہیں نثر نگار کی حیثیت سے قبول کیا جائے تو ان کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

غالب کے خطوط معلومات کا گنجینہ ہیں۔ غالب نے خطوط کو زندگی کی حرارت بخشی۔ انھوں نے جہاں اپنے دوستوں، عزیزوں اور متعلقین کو خط لکھے وہیں اپنے بہت سے شاگردوں کے نام بھی خط لکھے ہیں۔ انھوں نے سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔ غالب خط نہیں لکھتے تھے بلکہ بات چیت کرتے تھے۔ گرچہ یہ مکالمہ یک طرفہ ہوتا تھا لیکن مکتوب الیہ کو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا غالب ان کے سامنے ان سے گفتگو کر رہے ہیں۔ غالب کے خطوط جدید اردو نثر کی روح بن چکے ہیں۔ غالب کے خطوط پڑھ کر یہ لگتا ہے کہ دو آدمی آمنے سامنے بیٹھ کر آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔

11.3 غالب کا مختصر سوانحی تعارف

غالب کا پورا نام مرزا اسداللہ بیگ خان اور عرفیت مرزا نوشہ تھی۔ ان کی ولادت ۱۲۱۲ھ بمطابق ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النسا بیگم تھا۔ غالب کا سلسلۂ نسب افراسیاب بادشاہ توران تک پہنچتا ہے۔ غالب کے دادا کا نام قوقان بیگ تھا جو بادشاہ شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے۔ غالب کے دوسرے بھائی کا نام مرزا یوسف تھا جن کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہتا تھا۔ ایام طفلی میں ہی والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا نصراللہ بیگ نے ان کی پرورش کی ذمے داری سنبھال لی لیکن وہ بھی چند برسوں بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ۱۳ر سال کی عمر میں امراؤ بیگم کے ساتھ غالب کی شادی ہو گئی۔ امراؤ بیگم کے بطن سے یکے بعد دیگرے سات اولادیں پیدا ہوئیں لیکن سب فوت ہو گئیں۔ امراؤ بیگم کے والد کا نام الٰہی بخش خاں معروف تھا جو دہلی میں رہتے تھے۔ تقریباً سولہ سترہ برس کی عمر میں غالب نے بھی دہلی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی اور تادم آخر یہیں رہے۔

غالب معاشی طور پر ہمیشہ پریشان رہے اور ان کی زندگی تنگ دستی میں بسر ہوئی۔ حالاں کہ نواب رام پور، انگریزی حکومت اور بہادر شاہ ظفر سے انھیں پینشن ملتی تھی لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی پریشانیوں میں ہی گزری۔ ان کو شراب نوشی، جوا اور شطرنج کی لت لگ گئی تھی۔ جوا کھیلنے کے جرم میں انھیں جرمانہ ادا کرنا پڑا اور جیل بھی گئے۔ گھر کی ضروریات کے سامان اکثر ادھار لایا کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ قرض میں ڈوبے رہتے تھے۔ انھوں نے نہ تو کبھی کتابیں خریدیں اور نہ ہی مکان بنایا دونوں کرایے پر لے کر کام چلاتے رہے۔ انگریزوں سے انھیں پینشن ملتی تھی لیکن وہ بھی کسی وجہ سے بند ہو گئی تھی، اسے بحال کرانے کے لیے غالب کو کلکتے تک کا سفر کرنا پڑا۔ لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، بنارس پٹنہ اور مرشد آباد کے راستے وہ کلکتہ پہنچے۔ اس دوران لکھنؤ، کانپور اور بنارس میں کچھ وقفے کے لیے قیام بھی رہا، کچھ باذوق، اہل علم اور اپنے چاہنے والوں سے ملاقات بھی کی۔ غالب دو مرتبہ رام پور بھی گئے۔ ایک مرتبہ نواب یوسف حسن

خاں کی دعوت پر اور دوسری مرتبہ ان کے انتقال کے بعد تعزیت پر۔ اسی تنگ ودو کے عالم میں عسرت کی زندگی گزارتے ہوئے غالب ۱۸۶۹ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

غالب اردو کے علاوہ فارسی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ دونوں زبانوں میں انھوں نے اشعار کہے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ غالب نے ملا عبدالصمد سے فارسی سیکھی۔ اردو شاعری میں میر تقی میر کی پیروی کی اور فارسی میں مرزا عبدالقادر بیدل کی۔ بیدل سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انھوں نے اردو کلام میں بھی بیدل کی روش اختیار کی۔ اس سلسلے میں وہ خود کہتے ہیں:

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

اردو ادب پر غالب کا بہت بڑا احسان ہے۔ انھوں نے بہت سے علمی وادبی کارنامے انجام دیے جن میں کچھ کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ غالب نے بہادر شاہ ظفر کی ایما پر مغلیہ خاندان کی تاریخ لکھی جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ''مہر نیم روز'' کے نام سے ہے جس میں عہد تیمور سے ہمایوں تک کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ ''ماہ نیم ماہ'' کے نام سے ہے جس میں غالب نے اکبر سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک کے واقعات کو درج کرنے کا ارادہ بنایا تھا لیکن یہ کام مکمل نہیں ہو پایا۔ ایک روزنامچہ ''دستنبو'' کے نام سے لکھا۔ اس میں غالب نے غدر کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ غالب نے محمد حسین تبریزی کے فارسی لغت ''برہان قاطع'' میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشاندہی اور اصلاح کو جس کتاب میں جمع کیا اس کا نام رکھا ''قاطع برہان''۔ ''پنج آہنگ'' میں فارسی انشا پردازی کے نمونے ہیں۔ ''سبد چین'' میں غالب نے فارسی کے وہ اشعار جمع کیے ہیں جو فارسی کی کلیات میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ ''گل رعنا'' اردو اور فارسی دیوان کا انتخاب ہے جسے غالب نے مولوی سراج احمد کی فرمائش پر ترتیب دیا تھا۔ ''دعا صباح'' منظوم فارسی ترجمہ ہے۔ ''قادر نامہ'' یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ ''عود ہندی'' غالب کے اردو خطوط کا پہلا مجموعہ ہے جس میں ۱۶۲ خطوط شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۸۶۸ میں شائع ہو کر منصۂ شہود پر آیا۔ دوسرے خطوط کا مجموعہ ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا، اس میں کل ۴۷۲ خطوط شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مثنویوں میں ''باد مخالف، ابر گہر بار، چراغ دیر، مثنوی در صفت انبہ، مثنوی شان نبوت وولایت وغیرہ ہیں۔ غالب نے قصائد بھی لکھے جن کی تعداد چار ہے۔ ان میں دو حضرت علی کی شان میں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ یوں تو ان قصیدوں کی تعداد کم ہے لیکن اردو شاعری میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ اردو میں غالب کا ایک دیوان موجود ہے۔ یہ دیوان مقدار کے اعتبار سے کم ہے لیکن معیار کے اعتبار سے معتبر اور اعلیٰ ہے۔ غالب نے فارسی کلام بھی کہے ہیں اور فارسی میں خطوط بھی لکھے ہیں جو کتابی شکل میں موجود ہیں۔

11.4 غالب کی خطوط نگاری

غالب ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پایے کے نثر نگار بھی تھے۔ ان کے تعلق سے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر انھوں نے اگر شاعری نہ کی ہوتی اور محض خطوط ہی لکھے ہوتے تب بھی اردو دنیا میں ان کا نام لافانی ہو جاتا۔ غالب نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں فارسی زبان میں خط وکتابت کی۔ اردو کی طرف وہ بعد میں مائل ہوئے۔ ۱۸۴۶ کے بعد انھوں نے اردو میں خطوط لکھنا شروع

کیا اور آخری دو دہائیوں میں تقریباً ۹۰۰ خطوط لکھے۔ غالب نے خطوط لکھنے کا وہ طریقہ ایجاد کیا جس میں گویا دو شخص روبرو بیٹھ کر آپس میں گفتگو کر رہے ہوں۔ غالب عام روش سے ہٹ کر بیشتر راست بیانی یا مختصر القاب کے بعد مدعا بیان کرنے لگتے ہیں۔ انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس کی پوری پابندی کی۔ ہاں چند خطوط ایسے بھی لکھے ہیں جن میں لمبے القاب و آداب کا بھی استعمال کیا ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ اپنی تحریروں میں جو منظر کشی کرتے ہیں وہ پڑھنے والے کو دکھائی دینے لگتا ہے جس سے وہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس ضمن میں شمس الرحمٰن لکھتے ہیں:

''غالب نے قدیم روش کو چھوڑ کر جو طرز نگارش اختیار کیا اس میں انھوں نے اپنے بیان کیے ہوئے قواعد کی پوری پابندی کی ہے۔ چند خطوں کو چھوڑ کر جن میں قافیہ پیائی موجود ہے انھوں نے اردو میں جتنے بھی خط لکھے ان میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ غالب خود اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ اس سے ان کے خط زندگی کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے۔ لوگ انھیں پڑھ کر خوب سر دھنتے اور دوسروں کو بھی مزے لے کر سناتے تھے۔''

''اردو خطوط''، شمس الرحمٰن بی۔اے۔ کتابی دنیا، دہلی، جولائی ۱۹۴۷، ص:۳۱

غالب کے عہد میں خط لکھنے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ لمبے لمبے القاب و آداب اور مسجع و مقفی عبارت استعمال کی جاتی تھی۔ غالب نے اس کے برعکس مختصر اور کبھی کبھی راست بیانی سے کام لیا ہے۔ اس کی ایک جھلک میر مہدی مجروح کے نام لکھے گئے ایک خط میں ملاحظہ فرمائیں:

''ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ ''مجتہد العصر'' کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔ اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کریدا کرو، مسودے کے کاغذ کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ ''یہاں خیریت ہے، وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمھارا بہت دن کے بعد پہنچا، جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار! میر سرفراز حسین کو دعا دینا اور کہنا۔ اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔'' کیوں؟ سچ کہیو، اگلوں کے خطوں کی تحریر کی یہی طرز تھی یا اور؟ ہائے! کیا اچھا شیوہ ہے! جب تک یوں نہ لکھو، وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہِ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخلِ بے میوہ ہے، خانۂ بے چراغ ہے، چراغِ بےنور ہے۔ ہم جانتے ہیں، تم جانتے ہیں تم زندہ ہو، تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری کو لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا، اور اگر تمھاری خوشنودی اسی طرح کی طرز نگارش پر

منحصر ہے تو بھائی! ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نمازِ قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟ خیر ہم نے بھی وہ عبارت جو مسودے کے ساتھ لکھی تھی، اب لکھ بھیجی۔ قصور معاف کرو۔ خفا نہ ہو۔

میر نصیرالدین ایک بار آئے تھے، پھر نہ آئے۔ نثر فارسی نئی میں نے کہاں لکھی کہ تمھارے چچا کو یا تم کو بھیج دوں۔ نواب فیض محمد خاں کے بھائی حسن علی خاں مر گئے۔ حامد علی خاں کی ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہوگئی۔ گلو داروغہ بیمار ہو گیا تھا، آج اس نے غسلِ صحت کیا۔ باقر علی خاں کو مہینا بھر سے تپ آتی ہے۔ حسین علی خاں کے گلے میں دو غدود ہو گئے ہیں۔ شہر چپ چاپ، نہ کہیں پھاوڑا بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے، نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دلی شہر خموشاں ہے۔

کاغذ کم پڑ گیا ورنہ تمھارے دل کی خوشی کے واسطے ابھی اور لکھتا۔

۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ غالب

جیسا کہ آپ نے منقولہ خط میں دیکھا کہ میر مہدی مجروح کو خط لکھتے وقت غالب نے راست بیانی سے کام لیا ہے۔ کوئی القاب و آداب کا استعمال نہیں کیا اور سیدھے طور پر اپنی بات کہنی شروع کر دی۔ ایک اور خط ملاحظہ کیجیے جس میں غالب اپنے مکتوب الیہ کو جان غالب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور اپنی بات لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ علاالدین خاں علائی کے نام لکھے گئے خط کا یہ نمونہ دیکھیں:

''جان غالب! یاد آتا ہے کہ تمھارے عمِ نامدار سے سنا ہے کہ لغاتِ ''دساتیر'' کی فرہنگ وہاں ہے۔ اگر ہوتی تو کیوں نہ تم بھیج دیتے؟ خیر!

آن چہ مادر کارد اریم اکثرے درکارنیست

تم ثمرِ نورس ہو اس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشوونما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشین اس نہال کا رہوں کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہوگے؟ رہی دید وادید، اس کی دو صورتیں: تم دلی آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور میں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک یہ نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے؟

سنو! عالم دو ہیں: ایک عالمِ ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے؛ **لِمَنِ الملک الیوم** ؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے؛ **للہ الواحد القھار**۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں،

لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چناں چہ میں آٹھویں رجب سنہ ۱۲۱۲ھ میں روبہ کاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۱۷ر رجب سنہ ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پانو میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم ونثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل کانے سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ اور پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔ مشقتِ مقرری اور مشکل ہوگئی، طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں، سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مرادآباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر، بعدِ رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا، میں بھی بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بوم
سوئے شہر خود ازیں وادیِ ویراں بروم

۸ر جون ۱۸۶۱ء غالب

غالب نے اپنے مکتوب الیہ کو جانِ غالب، مرزا صاحب، مہاراج، صاحب، برخوردار، میری جان، بندہ پرور، قبلہ وکعبہ، پیرو مرشد، بھائی صاحب، کیوں صاحب جیسے مختصر الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ لیکن کچھ خطوط میں جہاں غالب نے ضروری سمجھا ہے، لمبے القاب وآداب کا بھی استعمال کیا ہے۔ کہیں کہیں مسجع ومقفیٰ جملے بھی استعمال کیے ہیں۔ جیسے کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتہ اور جناب تقدس انتساب سید صاحب وقبلہ والا مناقب عالیشان نواب سید ابراہیم علی خان بہادر مدظلہ العالی وغیرہ۔ اس طرح کا بھی ایک خط نقل کیا جارہا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

’’ جناب تقدس انتساب سید صاحب وقبلہ والا مناقب عالیشان نواب سید ابراہیم علی خان بہادر مدظلہ العالی۔

بعد بندگی معروض ہے، حضرت سید احمد حسن خاں صاحب مدظلہ العالی کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ کے گھر مولود مسعود پیدا ہوا۔ ایک عبارت رنگین مرتب کر کے ’’اکمل الاخبار‘‘ میں میں نے چھپوادی ہے اور ایک رباعی اور ایک قطعہ اپنا اور ایک قطعہ سید صاحب ممدوح کا جوانھوں

نے یہاں بھیجا تھا وہ بھی چھپوا دیا اور تین قطعے تاریخی بہاری لال منتظم اور میر فخر الدین مہتمم مطبع نے جو یہاں تاریخیں لکھی تھیں وہ چھپوا دیے۔ چنانچہ اپنی لکھی ہوئی رباعی اور قطعہ عرض کرتا ہوں۔

رباعی

حق داد بہ سید زپئے انعامش
فرخ پسرے، کہ واجب است اکرامش
تاریخ ولادتش بود بے کم وبیش
''ارشاد حسین خاں'' کہ باشد نامش

قطعہ

غالب حال سنیں ہجری
معلوم کن از ''خجستہ فرزند''
چوں یک صد و بست و چار ماند
این ست شمار عمر دل بند

یہ تو ظاہر ہے کہ ۱۲۸۵ ہجری ہیں۔ جب ''خجستہ فرزند'' کے اعداد میں سے ۱۲۸۵ لے لیے تو ایک سو چوبیس بچتے ہیں۔ ان کو میں نے دعائے عمر مولود قرار دیا۔ حق تعالیٰ اس مولود کو تمھارے سامنے عمر طبعی کو پہنچائے۔

خط کی رسید کا طالب غالب

جولائی بعد ۱۸۶۸ء

اسلوب زبان کے غیر رسمی روایتی استعمال کا نام ہے جو زبان کے عام اور مخصوص معیار سے مختلف ہو۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ ''ان کا انتقال ہو گیا'' تو گویا یہ زبان کا روایتی استعمال ہے۔ اس میں کسی کی وفات کی اطلاع دینے کے لیے مخصوص معیاری الفاظ سے فقرے کی ساخت مرتب ہوتی ہے۔ یہی بات غالب جب اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

''ہائے ہائے وہ نہ بچی'' تو اس میں غالب کا اسلوب بھی شامل ہو گیا۔ اب یہ محض اطلاع نہیں رہی بلکہ اس میں غالب کی نفسیاتی، سماجی اور ادبی شخصیت بھی شامل ہے۔ مرنے والی سے غالب کا ذہنی رشتہ، منشی نبی بخش حقیر جن کے نام خط میں یہ فقرہ لکھا گیا ہے غالب کے تعلقات غالب کا احساس اور جذبہ اس موقع پر استعمال ہونے والی مخصوص معیاری زبان سے انحراف لفظ ''ہائے'' کی تکرار اس کا انتقال ہو گیا کے بجائے ''وہ نہ بچی'' لکھنا، غرض ان سب چیزوں نے مل کر چھوٹے سے فقرے کو اسلوب بنا دیا ہے۔ یہاں زبان کے تمام اجزا کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ جن سے اسلوب بنتا ہے۔ مختصر یہ کہ زبان کی مخصوص لغوی ترتیب مفہوم کی ادائیگی کے لیے مخصوص الفاظ کا استعمال بعض ایسے الفاظ کا استعمال جو متروک ہو گئے ہوں یا زبان میں کم استعمال ہوئے ہوں۔ یا تحریر میں نہیں صرف گفتگو پر

مشتمل ہوں۔

غالب خطوط لکھنے میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے لیکن اردو اور فارسی نثر لکھنے سے اتنا کتراتے تھے کہ کبھی کبھی اپنے عزیز شاگردوں کو سخت سست بھی کہہ دیا کرتے تھے۔گفتگو میں جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔اردو میں مکتوب نگاری کے دور میں غالب اوسطاً ایک دو صفحے روز خطوط کی شکل میں لکھتے تھے،لیکن اردو نثر میں دیباچے اور تقریظیں لکھتے ہوئے گھبراتے تھے۔کیونکہ بقول ان کے،ان میں ذہنی مشقت کی استعداد نہیں رہی تھی۔اگرچہ ابتدا میں غالب پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے اردو خطوط شائع کیے جائیں۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ خود کوشش کرتے رہے کہ ان کے خطوط کا مجموعہ جلد چھپ جائے۔

اگرچہ فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر سادہ اور سلیس ہونی شروع ہوگئی تھی۔لیکن نثر کی سادگی کا حسن غالب ہی کے ہاتھوں نکھرا۔غالب چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی بات کہنے پر قادر ہیں۔ان جملوں کی ساخت سے اثر آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ غالب جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ مخاطب کے دل نشیں ہو جاتی ہے۔غالب کے چھوٹے جملے عام طور پر چار لفظوں سے لے کر سات لفظوں تک ہوتے ہیں۔وہ جملہ طویل ہوتا ہے۔جس میں وضاحت کے طور پر فقرے شامل ہوتے ہیں۔مرزا علاالدین خان علائی کے نام خط میں غالب نے چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کیے ہیں:

> ''میاں! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔محل سرا کی دیواریں گرگئی ہیں پاخانہ ڈھ گیا،چھتیں ٹپک رہی ہیں۔تمھاری پھوپھی کہتی ہیں ہائے دبی! ہائے مری۔دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔میں مرنے سے نہیں ڈرتا فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔چھت چھلنی ہے۔''
>
> (غالب،غالب کے خطوط،(مرتب:خلیق انجم) جلد اول،کراچی:انجمن ترقی اردو،1995ء،ص361)

غالب کے بیشتر خطوط تقریر اور تحریر کے درمیان کی چیز ہیں۔ندائیہ الفاظ،بیانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کر کے غالب اپنے خطوط کو تقریر اور گفتگو سے اتنا قریب کر دیتے ہیں کہ مجلسی اور اجتماعی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ غالب مکتوب الیہ ہی کو نہیں بلکہ بہت سے افراد کو مخاطب کر رہے ہیں۔اسی کوشش نے خطوط غالب کے ادبی حسن کو چمکایا ہے۔اور ان کی آواز میں وہ انفرادیت پیدا کی ہے کہ آج بھی ہزاروں آوازوں میں ان کی آواز اپنی شناخت قائم کی ہوئی ہے۔

نواب علاالدین خان علائی کے نام غالب نے پورے خط میں ہندوستانیوں سے اپنی ہمدردی اور برطانوی سامراج کے خلاف براہ راست ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن واقعات کے بیان کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے کہ غالب کے ذہنی اور روحانی کرب کو مکمل طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔یہی وہ تمام خصوصیات ہیں۔جنھوں نے غالب کے اسلوب کو انفرادیت بخشی ہے۔

مرزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جزئیات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔مفصل بیانات عموماً بے لطف ہو جاتے ہیں لیکن مرزا جزئیات کو اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ تحریر بے مزا ہونے کے بجائے زیادہ پر لطف بن جاتی ہے۔ان جزئیات نے ان کے خط کو ایک زندہ اور جاندار شخص بنا دیا۔

مرزا کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں۔اسی طرح اس کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں کہ شاید رنگ و روغن کی تصویر میں نہ

وہ جزئیات سما سکیں اور نہ ہی اس میں وہ روح تاثیر پیدا ہو۔ میر مہدی مجروح کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خان کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کا جو دروازہ تھا گر گیا سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرا جھک رہا ہے، چھتیں چھلنی ہوگئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔''

(انوار احمد، ڈاکٹر، غالب کے بہتر خطوط، لاہور: حنیف اینڈ سنز پرنٹنگ پریس، 2015ء، ص 37)

غالب نے خطوط نویسی میں وہ کمال پیدا کیا کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ ان کی مکتوب نگاری کی ادبی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن ان کے خطوط کی ایک اور اہمیت یہ ہے کہ اس میں خاص طور پر ایام غدر اور اس کے چشم دید حالات بیان ہوئے ہیں۔ غدر کے بعد ملک اور خاص کر دہلی کے جو حالات تھے اسے انھوں نے اپنے خطوط میں تفصیل کے ساتھ لکھا۔ غدر کے زمانے بہت سے لوگ خصوصاً مسلمان اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکل گئے تھے تاکہ وہ دہلی کی تباہی کا نشانہ نہ بن جائیں۔

11.5 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ

غالب کے حالات زندگی سے واقف ہوئے۔

غالب کے علمی و ادبی کارناموں سے واقفیت حاصل کی۔

غالب کی اسلوب نگاری کو جانا۔

خطوط غالب کی انفرادیت سے روشناس ہوئے۔

11.6 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ مرزا غالب کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالیے؟

2۔ غالب کے اسلوب اور ان کی خطوط نگاری پر ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے؟

11.7 سوالات کے جوابات

جواب:1.

غالب کا پورا نام مرزا اسداللہ بیگ خان اور عرفیت مرزا نوشہ تھی۔ ان کی ولادت ۱۲۱۲ھ بمطابق ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النسا بیگم تھا۔ غالب کا سلسلۂ نسب افراسیاب بادشاہ توران تک پہنچتا ہے۔ غالب کے دادا کا نام فوقان بیگ تھا جو بادشاہ شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے۔ غالب کے دوسرے بھائی کا نام مرزا یوسف تھا جن کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہتا تھا۔ ایام طفلی میں ہی والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا نصراللہ بیگ نے ان کی پرورش کی ذمے داری سنبھال لی لیکن وہ بھی چند برسوں بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ۱۳ر سال کی عمر میں امراؤ بیگم کے ساتھ غالب

کی شادی ہوگئی۔ امراؤ بیگم کے بطن سے یکے بعد دیگرے سات اولادیں پیدا ہوئیں لیکن سب فوت ہوگئیں۔ امراؤ بیگم کے والد کا نام الٰہی بخش خاں معروف تھا جو دہلی میں رہتے تھے۔ تقریباً سولہ سترہ برس کی عمر میں غالب نے بھی دہلی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی اور تادم آخر یہیں رہے۔

غالب معاشی طور پر ہمیشہ پریشان رہے اور ان کی زندگی تنگ دستی میں بسر ہوئی۔ حالاں کہ نواب رام پور، انگریزی حکومت اور بہادر شاہ ظفر سے انھیں پینشن ملتی تھی لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی پریشانیوں میں ہی گزری۔ ان کو شراب نوشی، جوا اور شطرنج کی لت لگ گئی تھی۔ جوا کھیلنے کے جرم میں انھیں جرمانہ ادا کرنا پڑا اور جیل بھی گئے۔ گھر کی ضروریات کے سامان اکثر ادھار لایا کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ قرض میں ڈوبے رہتے تھے۔ انھوں نے نہ تو کبھی کتابیں خریدیں اور نہ ہی مکان بنایا دونوں کرایے پر لے کر کام چلاتے رہے۔ انگریزوں سے انھیں پینشن ملتی تھی لیکن وہ بھی کسی وجہ سے بند ہوگئی تھی، اسے بحال کرانے کے لیے غالب کو کلکتے تک کا سفر کرنا پڑا۔ لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، بنارس پٹنہ اور مرشدآباد کے راستے وہ کلکتہ پہنچے۔ اس دوران لکھنؤ، کانپور اور بنارس میں کچھ وقفے کے لیے قیام بھی رہا، کچھ باذوق، اہل علم اور اپنے چاہنے والوں سے ملاقات بھی کی۔ غالب دو مرتبہ رام پور بھی گئے۔ ایک مرتبہ نواب یوسف حسن خاں کی دعوت پر اور دوسری مرتبہ ان کے انتقال کے بعد تعزیت پر۔ اسی تگ و دو کے عالم میں عسرت کی زندگی گزارتے ہوئے غالب ۱۸۶۹ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

غالب اردو کے علاوہ فارسی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ دونوں زبانوں میں انھوں نے اشعار کہے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ غالب نے ملا عبدالصمد سے فارسی سیکھی۔ اردو شاعری میں میر تقی میر کی پیروی کی اور فارسی میں مرزا عبدالقادر بیدل کی۔ بیدل سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انھوں نے اردو کلام میں بھی بیدل کی روش اختیار کی۔

اردو ادب پر غالب کا بہت بڑا احسان ہے۔ انھوں نے بہت سے علمی و ادبی کارنامے انجام دیے جن میں کچھ کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ غالب نے بہادر شاہ ظفر کی ایما پر مغلیہ خاندان کی تاریخ لکھی جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ''مہر نیم روز'' کے نام سے ہے جس میں عہد تیمور سے ہمایوں تک کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ ''ماہ نیم ماہ'' کے نام سے ہے جس میں غالب نے اکبر سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک کے واقعات کو درج کرنے کا ارادہ بنایا تھا لیکن یہ کام مکمل نہیں ہو پایا۔ ایک روزنامچہ ''دستنبو'' کے نام سے لکھا۔ اس میں غالب نے غدر کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ غالب نے محمد حسین تبریزی کے فارسی لغت ''برہان قاطع'' میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشاندہی اور اصلاح کو جس کتاب میں جمع کیا اس کا نام رکھا ''قاطع برہان''۔ ''پنج آہنگ'' میں فارسی انشاپردازی کے نمونے ہیں۔ ''سبد چین'' میں غالب نے فارسی کے وہ اشعار جمع کیے ہیں جو فارسی کی کلیات میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ ''گل رعنا'' اردو اور فارسی دیوان کا انتخاب ہے جسے غالب نے مولوی سراج احمد کی فرمائش پر ترتیب دیا تھا۔ ''دعا صباح'' منظوم فارسی ترجمہ ہے۔ ''قادر نامہ'' یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ ''عود ہندی'' غالب کے اردو خطوط کا پہلا مجموعہ ہے جس میں ۱۶۲ خطوط شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۸۶۸ میں شائع ہو کر منصۂ شہود پر آیا۔ دوسرے خطوط کا مجموعہ ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا، اس میں کل ۴۷۲ خطوط شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مثنویوں میں ''باد مخالف، ابر گہر بار، چراغ دیر، مثنوی درصفت انبہ، مثنوی شان نبوت و ولایت

وغیرہ ہیں۔غالب نے قصائد بھی لکھے جن کی تعداد چار ہے۔ان میں دو حضرت علی کی شان میں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ یوں تو ان قصیدوں کی تعداد کم ہے لیکن اردو شاعری میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔اردو میں غالب کا ایک دیوان موجود ہے۔ یہ دیوان مقدار کے اعتبار سے کم ہے لیکن معیار کے اعتبار سے معتبر اور اعلیٰ ہے۔غالب نے فارسی کلام بھی کہے ہیں اور فارسی میں خطوط بھی لکھے ہیں جو کتابی شکل میں موجود ہیں۔

جواب:2.

اسلوب زبان کے غیر رسمی روایتی استعمال کا نام ہے جو زبان کے عام اور مخصوص معیار سے مختلف ہو۔مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ ''ان کا انتقال ہو گیا۔'' تو گویا یہ زبان کا روایتی استعمال ہے۔اس میں کسی کی وفات کی اطلاع دینے کے لیے مخصوص معیاری الفاظ سے فقرے کی ساخت مرتب ہوتی ہے۔یہی بات غالب جب اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

''ہائے ہائے وہ نہ بچی'' تو اس میں غالب کا اسلوب بھی شامل ہو گیا۔اب یہ محض اطلاع نہیں رہی بلکہ اس میں غالب کی نفسیاتی،سماجی اور ادبی شخصیت بھی شامل ہے۔مرنے والی سے غالب کا ذہنی رشتہ،منشی نبی بخش حقیر جن کے نام خط میں یہ فقرہ لکھا گیا ہے غالب کے تعلقات غالب کا احساس اور جذبہ اس موقع پر استعمال ہونے والی مخصوص معیاری زبان سے انحراف لفظ ''ہائے'' کی تکرار اس کا انتقال ہو گیا کے بجائے ''وہ نہ بچی'' لکھنا،غرض ان سب چیزوں نے مل کر چھوٹے سے فقرے کو اسلوب بنا دیا ہے۔یہاں زبان کے تمام اجزا کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔جن سے اسلوب بنتا ہے۔مختصر یہ کہ زبان کی مخصوص لغوی ترتیب مفہوم کی ادائیگی کے لیے مخصوص الفاظ کا استعمال بعض ایسے الفاظ کا استعمال جو متروک ہو گئے ہوں یا زبان میں کم استعمال ہوئے ہوں۔یا تحریر میں نہیں صرف گفتگو پر مشتمل ہوں۔

غالب خطوط لکھنے میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے لیکن اردو اور فارسی نثر لکھنے سے اتنا کتراتے تھے کہ کبھی کبھی اپنے عزیز شاگردوں کو سخت سست بھی کہہ دیا کرتے تھے۔گفتگو میں جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔اردو میں مکتوب نگاری کے دور میں غالب اوسطاً ایک دو صفحے روز خطوط کی شکل میں لکھتے تھے،لیکن اردو نثر میں دیباچے اور تقریظیں لکھتے ہوئے گھبراتے تھے۔کیونکہ بقول ان کے،ان میں ذہنی مشقت کی استعداد نہیں رہی تھی۔اگرچہ ابتدا میں غالب پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے اردو خطوط شائع کیے جائیں۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ خود کوشش کرتے رہے کہ ان کے خطوط کا مجموعہ جلد چھپ جائے۔

اگرچہ فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر سادہ اور سلیس ہونی شروع ہو گئی تھی۔لیکن نثر کی سادگی کا حسن غالب ہی کے ہاتھوں نکھرا۔غالب چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی بات کہنے پر قادر ہیں۔ان جملوں کی ساخت سے اثر آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ غالب جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ مخاطب کے دل نشیں ہو جاتی ہے۔غالب کے چھوٹے جملے عام طور پر چار لفظوں سے لے کر سات لفظوں تک ہوتے ہیں۔وہ جملہ طویل ہوتا ہے۔جس میں وضاحت کے طور پر فقرے شامل ہوتے ہیں۔مرزا علاالدین خان علائی کے نام خط میں غالب نے چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کیے ہیں:

''میاں! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں پاخانہ ڈھ گیا،چھتیں ٹپک

رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی کہتی ہیں ہائے دبی! ہائے مری۔ دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔''

(غالب، غالب کے خطوط، (مرتب: خلیق انجم) جلد اول، کراچی: انجمن ترقی اردو، 1995ء، ص 361)

غالب کے بیشتر خطوط تقریر اور تحریر کے درمیان کی چیز ہیں۔ ندائیہ الفاظ، بیانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کر کے غالب اپنے خطوط کو تقریر اور گفتگو سے اتنا قریب کر دیتے ہیں کہ مجلسی اور اجتماعی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ غالب مکتوب الیہ ہی کو نہیں بلکہ بہت سے افراد کو مخاطب کر رہے ہیں۔ اسی کوشش نے خطوط غالب کے ادبی حسن کو چمکایا ہے۔ اور ان کی آواز میں وہ انفرادیت پیدا کی ہے کہ آج بھی ہزاروں آوازوں میں ان کی آواز اپنی شناخت قائم کی ہوئی ہے۔

نواب علاالدین خان علائی کے نام غالب نے پورے خط میں ہندوستانیوں سے اپنی ہمدردی اور برطانوی سامراج کے خلاف براہ راست ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن واقعات کے بیان کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے کہ غالب کے ذہنی اور روحانی کرب کو مکمل طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ تمام خصوصیات ہیں۔ جنھوں نے غالب کے اسلوب کو انفرادیت بخشی ہے۔

غالب نے خطوط نویسی میں وہ کمال پیدا کیا کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ ان کی مکتوب نگاری کی ادبی اہمیت مسلم ہے۔ لیکن ان کے خطوط کی ایک اور اہمیت یہ ہے کہ اس میں خاص طور پر ایام غدر اور اس کے چشم دید حالات بیان ہوئے ہیں۔ غدر کے بعد ملک اور خاص کر دہلی کے جو حالات تھے اسے انھوں نے اپنے خطوط میں تفصیل کے ساتھ لکھا۔ غدر کے زمانے بہت سے لوگ خصوصاً مسلمان اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکل گئے تھے تا کہ وہ دہلی کی تباہی کا نشانہ نہ بن جائیں۔

11.8 فرہنگ

لفظ	:	معنی
تقلید		پیروی، کسی کے قدم بہ قدم چلنا
رفتہ رفتہ		آہستہ آہستہ
تعزیت		مردے کے اعزہ و متعلقین سے اظہار ہمدردی
روش		طرز، تحریر یا کسی فن کا اسلوب
عسرت		تنگی، مفسلی
چشم دید		آنکھوں دیکھا
رواج		کسی چیز کا عام استعمال
اقتصادی		معاشی، آمد و صرف سے متعلق
لت		بری عادت جو جڑ پکڑے
منصۂ شہود پر آنا		منظر عام پر آنا، ظاہر ہونا

معتبر	لائق احترام، جس پر بھروسہ کیا گیا ہو
القاب	احترامی الفاظ جو خط میں مکتوب الیہ کے لیے لکھے جاتے ہیں، وہ نام جو خاص صفت کی وجہ سے پڑ جائے
سر دھنا	بہت افسوس کرنا، مزے میں آ کر جھومنا
منظر کشی	الفاظ میں نقشہ کھینچنا
لطف اندوز	مزہ لینے والا
تکرار	بار بار دہرانا
ندائیہ	وہ لفظ جو کسی کو پکارنے کے لیے استعمال ہو، جیسے: اے، او، ارے وغیرہ
خطیبانہ	تقریر و وعظ کا انداز، ناصحانہ طرز خطاب

11.9 کتب برائے مطالعہ

1۔ کاظم علی خان، خطوط غالب تحقیقی مطالعہ، کتاب نگر، لکھنؤ، 1981ء
2۔ حامدہ مسعود، خطوط غالب: فنی تجزیہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1982ء
3۔ حکیم عبدالحمید دہلوی، مطالعات خطوط غالب، غالب اکیڈمی، دہلی، 2009ء
4۔ مالک رام، خطوط غالب، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، 1962ء
5۔ عبدالقوی دسنوی، مطالعہ خطوط غالب، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال، 1975ء
6۔ غلام حسین ذوالفقار، محاسن خطوط غالب، بزم اقبال، لاہور، 2003ء
7۔ غلام رسول مہر، خطوط غالب، کتاب منزل، لاہور
8۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، انتخاب خطوط غالب، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، 1960ء
9۔ مشیر احمد، خطوط غالب کے ادبی مباحث، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، 2001ء
10۔ بیگم نیلوفر احمد، اردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اور غالب، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2007ء

اکائی 12: ابوالکلام آزاد اور غبارِ خاطر

ساخت

12.1 اغراض ومقاصد
12.2 تمہید
12.3 ابوالکلام آزاد: مختصر سوانحی تعارف
12.4 ابوالکلام آزاد کی خطوط نگاری (غبار خاطر کی روشنی میں)
12.6 آپ نے کیا سیکھا
12.7 اپنا امتحان خود لیجیے
12.8 سوالات کے جوابات
12.9 فرہنگ
12.10 کتب برائے مطالعہ

12.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- ☆ مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات زندگی سے ہوں گے۔
- ☆ مولانا آزاد کے علمی اور ادبی کارناموں واقفیت حاصل کرسکیں گے۔
- ☆ مولانا آزاد کی خطوط نگاری کو جانیں گے۔
- ☆ غبار خاطر کا خصوصی مطالعہ کریں گے۔

12.2 تمہید

مولانا ابوالکلام آزاد اردو ادب کا اہم اور منفرد نام ہے۔ ان کی شخصیت کثیر الجہت ہے۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے جس میدان میں قدم رکھا خواہ وہ سیاست ہو، مذہب ہو یا ادب وصحافت سبھی میں اپنے عزم وارادے، بصیرت، ذہانت اور اپنے جوش عمل سے اپنی افضلیت کو تسلیم کرا لیا۔ انھیں کئی زبانوں پر عبور تھا۔ ہندوستانی زبانوں کے علاوہ کچھ عالمی زبانیں بھی جانتے تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے علم بردار تھے۔ آزاد بیک وقت ایک اچھے مدیر، بے باک صحافی، بے مثال مقرر، مفسر قرآن، دانشور، مفکر قوم وملت، ہندوستان کی تحریک آزادی کا ایک مجاہد، انشا پرداز، ماہر تعلیم، سیاست داں، شاعر اور خطوط نگار تھے۔ آزاد نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا لیکن وہ صرف اسی ایک میدان کے شہسوار ہو کر نہیں رہے بلکہ جملہ اصناف ادب

میں قلم فرسائی کی۔اردوادب میں ان کی شناخت جس صنف میں قائم ہوئی ہے وہ ہے خطوط نگاری۔خطوط نگاری میں مرزا غالب کے بعد جس ادیب کا نام آتا ہے وہ مولانا آزاد کا ہے۔اس اکائی میں ہم مولانا ابوالکلام آزاد کی خطوط نگاری کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

12.3 ابوالکلام آزاد کا مختصر تعارف

ابوالکلام آزاد کی پیدائش ۱۸۸۸ء میں عرب کے مکہ شہر میں ہوئی۔ان کے بچپن کا نام محی الدین احمد اور لقب ابوا کلام تھا۔ان کے والد کا نام مولانا خیرالدین بن احمد اور والدہ کا نام مسماۃ عالیہ بنت محمد تھا۔مولانا خیرالدین، محی الدین کو فیروز بخت کہہ کر پکارتے تھے۔محی الدین نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا اور آزادؔ تخلص اختیار کیا اور اسی نام سے مقبول ہوئے۔آزاد کے ددیہال اور ننہال دونوں گھرانوں میں علمی وادبی اور مذہبی رجحان تھا۔وہ بچپن سے نہایت ذہین واقع ہوئے تھے۔گھر کے علمی ماحول میں ان کی تربیت ہوئی۔کم عمری میں ہی قرآن شریف مکمل کرلیا۔اسلام کا مطالعہ بڑی گہرائی اور گیرائی سے کیا۔آزاد نے عربی وفارسی کی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی جب کہ اردو ان کی خود اکتسابی تھی۔ان کے علاوہ دوسری عالمی زبانوں میں انگریزی اور فرانسیسی کو بھی سیکھا۔اکتساب علم کے بعد ادبی زندگی کا آغاز ہوا تو شاعری کے میدان کو اختیار کیا۔دس گیارہ سال کی عمر میں ہی شعر کہنے لگے۔رفتہ رفتہ ذہن سیاست کی طرف منتقل ہوا۔۱۹۰۵ء میں انقلابی رہنماؤں کے زیر اثر برطانوی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا اور اس کے بعد سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔انھوں تحریک آزادی کو تقویت دینے کے لیے یکے بعد دیگرے مختلف رسالے جاری کیے۔جن 'الصباح' ۱۳برس کی عمر میں نکالا جو زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔۱۹۰۳میں مشہور ومعروف رسالہ 'لسان الصدق' منظر عام پر آیا۔یہ رسالہ انجمن ترقی اردو کا ترجمان بنا۔۱۹۱۲ء میں 'الہلال' جاری ہوا جو ان کا مایۂ ناز کارنامہ ہے۔اس میں زیادہ تر سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے۔اس لیے حکومت کی جانب سے اس پر پابندی بھی عائد کی گئی اور جرمانے بھی لگائے گئے۔اس کے بعد 'البلاغ' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔یہ بھی الہلال کی طرز پر تھا۔مولانا کو حکومت بنگال نے جلاوطنی کا حکم دیا، مولانا رانچی چلے گئے جہاں سے انھوں نے دو اہم رسالے 'الزکوٰۃ الحج اور ترجمان القرآن' نکالے۔جلد ہی وہ جلاوطنی سے بری ہوگئے۔اسی عہد میں گاندھی جی خلافت تحریک کی رہنمائی کررہے تھے، آزاد بھی گاندھی جی کے ساتھ ہوگئے۔اس تحریک سے وابستہ ہوکر آزاد نے کراچی، آگرہ اور بمبئی جیسے مقامات پر پُر جوش اور معرکۃ الآرا تقریریں کیں جس کی پاداش میں حکومت نے انھیں جیل بھیج دیا۔آزاد جب جیل سے رہا ہوئے تو انھوں نے کانگریس کی رکنیت اختیار کرلی اور جلد ہی صدارت کے منصب پر فائز ہوگئے۔نمک ستیہ گرہ میں شامل ہوئے تو آزاد ایک بار پھر جیل گئے۔آزاد نے 'بھارت چھوڑو آندولن' میں بھی حصہ لیا اور ۱۹۴۲میں گرفتار کرکے احمد نگر جیل بھیج دیے گئے جہاں سے ۱۹۴۵میں وہ رہا ہوئے۔اس درمیان انھوں نے گزراوقات کے لیے خطوط کو وسیلہ بنایا۔یہ تمام خطوط انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے لیکن یہ خطوط جیل سے باہر نہیں جاسکے بلکہ انھیں کے پاس رہ گئے۔احمد نگر جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ دہلی پہنچے اور کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ان کی زندگی کے تقریباً ۹ سال ۸ مہینے قید میں گزرے۔اکابرین کی بڑی قربانیوں کے بعد ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔اس کے بعد یہاں ہندوستان کا اپنا نظام نافذ ہوا۔اس کے نفاذ کے لیے یہاں کے دانشوروں کو الگ الگ ذمہ داریاں دی گئیں تاکہ عوام وخواص کی زندگی بہتر طور پر گزر سکے، ان دانشوروں نے اپنے اپنے طور پر اپنی ذمہ داری کو بہ خوبی

انجام دیا۔مولانا آزاد کو بھی ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی جس کو انھوں نے بہ طور احسن ادا کیا۔وہ ہندوستان کے وزیر تعلیم کے ایک باوقار عہدے پر فائز ہوئے۔تعلیم کے میدان میں انھوں نے غیر معمولی کارنامے سرانجام دیے۔کئی نئے نئے ادارے قائم کیے۔تعلیم کے میدان میں مزید بہتری کے لیے کمیشن اور اکادمیاں بنائیں۔یونیورسٹی گرانٹ کمیشن،ساہتیہ اکادمی،للت کلا اکادمی وغیرہ ان ہی کے قائم کردہ ہیں۔مولانا آزاد نے ہمیشہ ملک کی ترقی،امن،بھائی چارا اور قومی اتحاد کے لیے کام کیا۔

آزاد دین و مذہب،فلسفہ وحکمت،شعروادب،آثارقدیمہ،علم السنہ جیسے علوم پر دسترس رکھتے تھے۔یہاں تک کہ علم طب میں بھی کسب فیض کیا اور موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔آزاد کی تصانیف میں ''اعلان حق،قول فیصل،خطبات آزاد،نوادر ابوالکلام،تذکرہ،ترجمان القرآن،غبار خاطر،کاروان خیال،نقش آزاد،تبرکات آزاد،انبیائے کرام،ارمغان آزاد،آزادیِ ہند(انڈیا ونس فریڈم کا اردو ترجمہ)،حیات سرمد،اور ولادت نبویؐ'' وغیرہ اہم ہیں۔مولانا آزاد چائے،قہوہ اور سگریٹ کا شوق رکھتے تھے اور انھیں کثرت سے استعمال بھی کرتے تھے۔ان کی وفات ۲۲/فروری ۱۹۵۸ کو دہلی میں ہوئی۔آزاد نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا لیکن ہم یہاں پر جس موضوع کا مطالعہ کریں گے وہ ہے ان کی خطوط نگاری۔خطوط نگاری میں خصوصاً ان کے مجموعے ''غبار خاطر'' کا جائزہ لیا جائے گا۔

12.4 ابوالکلام آزاد کی خطوط نگاری (غبار خاطر کی روشنی میں)

اردو ادب میں خطوط نگاری کے حوالے سے جس ادیب کو سب سے زیادہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی وہ مرزا اسد اللہ خاں غالب ہیں۔ان کے بعد جس ادیب کا نام لیا جاتا ہے وہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ابوالکلام آزاد نے بہت سے ادیبوں اور دانشوروں کو خطوط لکھے جنھیں ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔انھیں میں ایک مجموعہ ''غبار خاطر'' ہے۔غبار خاطر میں جو خطوط شامل ہیں وہ ۹/اگست ۱۹۴۲ سے ۱۵/جون ۱۹۴۵ تک قلعہ احمد نگر کی جیل میں تحریر کیے گئے۔اس مجموعے میں کل ۲۴ خطوط ہیں۔یہ خطوط صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام لکھے گئے تھے مگر حکومت کی پابندیوں کی وجہ سے اس وقت ان تک پہنچ نہیں سکے۔مولانا آزاد شیروانی صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ان کا دوستانہ طویل عرصے پر محیط ہے۔آزاد نے غبار خاطر میں انھیں 'صدیق مکرم' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔قید سے رہائی کے بعد یہ سارے خطوط مولانا نے محمد اجمل خاں کے حوالے کر دیا جسے انھوں نے ترتیب دے کر پہلی بار ۱۹۴۶ء میں شائع کیا جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔اس کے بعد لاہور سے یہ مجموعہ اشاعت پذیر ہو کر منظر عام پر آیا،اس کے بھی کئی ایڈیشن چھپے جسے قارئین نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے نسخے جلد ہی ختم ہو گئے۔پھر اس کے بعد اسے مالک رام نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔مالک رام کا ترتیب کردہ نسخہ اب ساہتیہ اکادمی دہلی سے شائع ہو چکا ہے جسے استناد کا درجہ حاصل ہے۔

غبار خاطر کے خطوط یوں تو نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو مخاطب کر کے لکھے گئے ہیں مگر ان کے لکھنے کی اصل وجہ نواب صاحب نہیں ہیں بلکہ قید کے ایام میں وقت گزارنے کے لیے آزاد نے خطوط لکھنا ایک مشغلہ بنایا جس میں انھوں نے اپنے دل کی باتیں بیان کیں۔خط لکھنے کے لیے کاتب اور مکتوب الیہ کا ہونا ضروری ہے۔بطور کاتب آزاد خود تھے اور مکتوب الیہ کے لیے انھوں نے شیروانی صاحب کا انتخاب کیا۔چوں کہ مکتوب الیہ ایک عالم و فاضل شخصیت تھی اس لیے مولانا نے انھیں کے معیار کے مطابق زبان اور اصطلاحات استعمال کی ہیں۔کہیں کہیں زبان مشکل اور پیچیدہ ہوگئی ہے اور کہیں آسان بھی ہے۔آزاد نے جہاں جس طرح کی زبان

درکار تھی اسی کے اعتبار سے استعمال کیا ہے۔ خطوط میں جگہ جگہ اردو، عربی اور فارسی کے اشعار پیش کیے گئے ہیں جن کی تعداد تقریباً سات سو تک پہنچتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اشعار مرزا اسداللہ خاں غالب کے ہیں۔ 'غبار خاطر' سے آزاد کے ایک خط کا نمونہ ملاحظہ کیجیے جس سے ان کے خطوط لکھنے کے طرز کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا:

قلعۂ احمد نگر

۱۵/اگست ۱۹۴۲ء

مار از زبانِ شکوہ زبیدادِ چرخ نیست
از ما خطے بہ مہرِ خموشی گرفتہ اندا

صدیق مکرم

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ صراحی لبریز ہے اور جام آمادہ۔ ایک دور ختم کر چکا ہوں۔ دوسرے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست
صراحیِ مے ناب و سفینۂ غزل ست
جریدہ رو کہ گزرگاہِ عاقبت تنگ ست
پیالہ گیر کہ عمر عزیز بے بدل ست

طبیعت وقت کی کشاکش سے یک قلم فارغ اور دل فکر این وآں سے بکلی آسودہ ہے۔ اپنی حالت دیکھتا ہوں تو وہ عالم دکھائی دیتا ہے جس کی خبر خواجہ شیراز نے چھ سو سال پہلے دے دی تھی۔ زندگی کے چالیس سال طرح طرح کی کاوشوں میں بسر ہو گئے۔ مگر اب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ساری کاوشوں کا حل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ صبح کا جانفزا وقت ہو اور چین کی بہترین چائے کے پے در پے فنجان!

چل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت
تدبیر ما بدستِ شرابِ دو سالہ بود

آج تین بجے سے کچھ پہلے آنکھ کھل گئی تھی۔ صحن میں نکلا تو ہر طرف سناٹا تھا، صرف احاطہ کے باہر سے پہرہ دار کی گشت و باز گشت کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں رات کو احاطہ کے اندر وارڈروں کا تین تین گھنٹے کا پہرہ لگا کرتا ہے مگر بہت کم جاگتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اس وقت بھی سامنے کے برآمدے میں ایک وارڈر کمبل بچھائے لیٹا تھا اور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ بے اختیار مومن کا شعر یاد آ گیا:

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لیے

زندانیوں کے اس قافلہ میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملہ میں میرا شریک حال ہو۔ سب بے خبر سو رہے ہیں، اور اسی وقت میٹھی

نیند کے مزے لیتے ہیں:

دائم کسے بقافلہ بودست پاسباں
بیدار شو کہ چشم رفیقاں بخواب شد

سوچتا ہوں تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے الٹی ہی چال میرے حصے میں آئی۔ دنیا کے لیے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہو، وہی میرے لیے بیداری کی اصلی پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند کے مزے لیں۔ میں اس لیے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت یاب ہوتا رہوں:

خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من
ویں عجب کاں دم کہ می گویم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ میں نے دنیا کو ایسی جرأتوں کا سرے سے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں، جب سو جاتی ہے تو اٹھ بیٹھتا ہوں:

خوابِ غفلت ہمہ را بُردہ و بیدار یکے ست

خلائق کے کتنے ہی ہجوم میں ہوں لیکن اپنا وقت صاف بچالے جاتا ہوں کیوں کہ میری اس خلوت در انجمن پر کوئی ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتا۔ میرے عیش وطرف کی برزم اس وقت آراستہ ہوتی ہے جب نہ کوئی آنکھ دیکھنے والی ہوتی ہے، نہ کوئی کان سننے والا۔ رضی دانش نے میری زبان سے کہا تھا:

خوش زمزمۂ گوشۂ تنہائی خویشم
از جوش و خروش گل و بلبل خبرم نیست

اب بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ دل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم رہنے لگی۔ صبح کی اس مہلت میں تھوڑی سی آگ جو سلگ جاتی ہے، اس کی چنگاریاں بجھنے نہیں پاتیں، راکھ کے تلے دبی دبائی کام کرتی رہتی ہیں:

ازاں بہ دیرِ مغانم عزیز می دارند
کہ آتشے کہ نہ میرد، ہمیشہ دردلِ ماست

دن بھر اگر سوز وتپش کا سامان نہ بھی ملے، جب بھی چولھے کے ٹھنڈے پڑ جانے کا اندیشہ نہ رہا۔ عرفی کیا خوب بات کہہ گیا ہے:

سینۂ گرم نہ داری مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات عود مَخر

اس سحر خیزی کی عادت کے لیے والد مرحوم کا منت گزار ہوں ان کا معمول تھا کہ رات کی پچھلی پہر ہمیشہ بیداری میں بسر کرتے۔ بیماری کی حالت بھی اس معمول میں فرق نہیں ڈال سکتی تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ رات کو جلد سونا اور صبح جلد اٹھنا زندگی کی سعادت کی پہلی علامت ہے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے کے حالات سناتے کہ دہلی میں مفتی صدر الدین مرحوم سے صبح کی سنت وفرض کے درمیان سبق

لیا کرتا تھا اور اس امتیاز پر نازاں رہتا تھا کیوں کہ وہ چاہتے تھے، مجھے خصوصیت کے ساتھ اوروں سے علیحدہ رہ سبق دیں، اور اس کے لیے سرف وہی وقت نکل سکتا تھا۔ یہ بھی فرماتے کہ یہ فیض مجھے اپنے نانا رکن المدرسین سے ملا۔ وہ بھی شاہ عبدالعزیز سے علی الصباح سبق لیا کرتے تھے اور پچھلی پہر سے اٹھ کر اس کی تیاری میں لگ جاتے تھے۔ پھر خواجۂ شیراز کا یہ مقطع ذوق لے لے کر پڑھتے:

مرو بخواب کہ حافظ بہ بارگاہِ قبول
زور دنیم شب و درسِ صبحگاہ رسید

میرا ابھی دس گیارہ سال کی عمر ہوگی کہ یہ باتیں کام کر گئی تھیں۔ بچپنے کی نیند سر پر سوار رہتی تھی مگر میں اسے لڑتا رہتا۔ صبح اندھیرے میں اٹھتا اور شمعدان روشن کر کے اپنا سبق یاد کرتا۔ بہنوں سے منتیں کیا کرتا تھا کہ صبح آنکھ کھلے تو مجھے جگا دینا۔ وہ کہتی تھیں، یہ نئی شرارت کیا سوجھی ہے! اس خیال سے کہ میری صحت کو نقصان نہ پہنچے، والد مرحوم روکتے، لیکن مجھے کچھ ایسا شوق پڑ گیا تھا کہ جس دن دیر سے آنکھ کھلتی، دن بھر پشیمان سا رہتا۔ آنے والی زندگی میں جو معاملات پیش آنے والے تھے، یہ ان سے میرا پہلا سابقہ تھا:

اتانی ھوا ھا قبل ان اعرف الھویٰ
فصادف قلبا فارغاً فتمکنا

دیکھیے، یہاں ''پہلا سابقہ'' لکھتے ہوئے میں نے عربی کی ترکیب **کان** اور **عھدی بھا** کا بلاقصد ترجمہ کر دیا کہ دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور عالمِ تنہائی کی خلوت اندوزیوں کا پورا پورا لطف اٹھا رہا ہوں۔ گویا ساری دنیا میں اس وقت میرے سوا کوئی نہیں بستا۔ کہہ نہیں سکتا، تنہائی کا یہ احساس میری طبع خلوت پرست کی جولانیوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا کرتا ہے۔ بیدل کی خیال بندیوں کا غلو بے کیف ہو لیکن اس کی بحر طویل کی بعض غزلیں کیف سے خالی نہیں ہیں:

ستم ست گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ
توز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا، بہ چمن درآ
پئے نافہ ہائے نجستہ بو، مپسند زحمت جستجو
بخیال حلقۂ زلفِ او گرہے خورو بہ ختن در آ

پانچ بجے سے قلعہ میں ٹینکوں کے چلانے کی مشق شروع ہوتی ہے اور گھرّ گھرّ کی آواز آنے لگتی ہے مگر اس میں ابھی دیر ہے۔ چار بجے دودھ کی لاری آتی ہے اور چند لمحوں کے لیے صبح کا سکون ہنگامہ سے بدل دیتی ہے۔ وہ ابھی چند منٹ ہوئے، آئی تھی اور واپس گئی۔ اگر اس وقت کے سناٹے میں کوئی آواز مخل ہو رہی ہے تو وہ صرف جواہر لال کے ہلکے خراٹوں کی آواز ہے۔ وہ ہمسایہ میں سو رہے ہیں؛ صرف لکڑی کا ایک پردہ حائل ہے۔ خراٹے جب تھمتے ہیں تو حسب معمول نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ یہ بڑبڑانا ہمیشہ انگریزی میں ہوتا ہے:

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ھم

مؤتمن الدولہ اسحاق خان شوستری محمد شاہی امراء میں سے تھا؛ اس کا ایک مطلع آپ نے تذکروں میں دیکھا ہوگا؛ ضلع جگت کی

صنعت گری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر جب کبھی جواہر لال کو انگریزی میں بڑبڑاتے سنتا ہوں تو بے اختیار یاد آ جاتا ہے:

زبسکہ در دلِ تنگم خیالِ آں گل بود
نفیر خوابِ من امشب صفیر بلبلِ بود

نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے۔ یہ عموماً انہی طبیعتوں پر طاری ہوتا ہے جن مین دماغ سے زیادہ جذبات کام کیا کرتے ہیں۔ جواہر لال کی طبیعت سرتاسر جذباتی واقع ہوئی ہے، اس لیے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات کام کرتے رہتے ہیں۔

یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا ہے۔ فوجی صیغہ نے ہمارا چارج لے لیا، داخلہ کے وقت فہرست سے مقابلہ کر لیا، ہماری حفاظت کا اور دنیا سے بے تعلقی کا جس قدر بندوبست کیا جا سکتا تھا وہ بھی کر لیا؛ لیکن اس سے زیادہ ہمارے معاملات سے انھیں کوئی سروکار معلوم نہیں ہوتا۔ اندر کا تمام انتظام گورنمنٹ بمبئی کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اور اصلی رشتۂ کار مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔

ہمیں یہاں رکھنے کے لیے جو ابتدائی انتظام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ گرفتاری سے ایک دن پہلے یعنی ۸/ اگست کو یرودا سنٹرل جیل، پونا سے ایک سینئر جیلر یہاں بھیج دیا گیا۔ دس جیل کے وارڈز اور پندرہ قیدی کام کاج کے لیے اس کے ساتھ آئے۔ جیلر کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا صورتِ حال پیش آنے والی ہے، صرف اتنی بات بتلائی گئی تھی کہ ایک ڈیٹنشن کیمپ (Detention Camp) کھل رہا ہے، چند دنون کے لیے دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ ہم پہنچے تو معاملہ ایک دوسری ہی شکل میں نمایاں ہوا اور بیچارہ سراسیمہ ہو کر رہ گیا۔ چوں کہ میں نے یہاں آتے ہی اپنا غصہ اس غریب پر نکالا تھا، اس لیے کئی دن تک منہ چھپائے پھرتا رہا۔ جب اور کچھ نہ بنتی تو ضلع کے کلکٹر کے پاس دوڑا ہوا جاتا، وہ اس سے زیادہ بے خبر تھا۔

در ہر کس کے زدم، بے خبر و غافل بود

دوسرے دن کلکٹر اور سول سرجن آئے اور معذرت کر کے چلے گئے۔ سول سرجن ہر شخص کا سینہ ٹھونک بجا کر دیکھتا رہا کہ کیا آواز نکلتی ہے! معلوم نہیں پھیپھڑوں کی حالت معلوم کرنا چاہتا تھا یا دلوں کی۔ مجھ سے بھی معائنہ کی درخواست کی۔ میں نے کہا: میرا سینہ دیکھنا بے سود ہے، اگر دماغ کے دیکھنے کا کوئی آلہ ساتھ ہے تو اسے کام میں لائیے۔

بگذر مسیح، از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردن تو بہ صد خوں برابر ست

بہرحال چوتھے دن انسپکٹر جنرل آف پریزن آیا اور گورنمنٹ کے احکام کا پرچہ حوالہ کیا: کسی سے ملاقات نہیں کی جا سکتی؛ کسی سے خط و کتابت نہیں کی جا سکتی؛ کوئی اخبار نہیں آ سکتا؛ ان باتوں کے علاوہ اگر کسی اور بات کی شکایت ہو تو حکومت اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہے۔ اب ان باتوں کے بعد اور کون سی بات رہ گئی تھی، جس کی شکایت کی جاتی اور حکومت از راہِ عنایت اسے دور کر دیتی!

زبان جلائی، کیے قطع ہاتھ پہنچوں سے

یہ بندوبست ہونے ہیں مری دعا کے لیے

انسپکٹر جنرل نے کہا۔ اگر آپ کتابیں یا کوئی اور سامان منگوانا چاہیں تو ان کی فہرست لکھ کر مجھے دے دیں، گورنمنٹ اپنے طور پر منگوا کر آپ کو پہنچا دے گی۔ چوں کہ گرفتاری سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لیے میرے پاس دو کتابوں کے سوا جو راہ میں دیکھنے کے لیے ساتھ رکھ لی تھیں، مطالعہ کا کوئی سامان نہ تھا، خیال ہوا اگر مکان سے بعض مسودات اور کچھ کتابیں آ جائیں تو قید و بند کی یہ فرصت کام میں لائی جائے۔ بظاہر اس خواہش میں کوئی برائی معلوم نہیں ہوئی۔ دنیادار بہ امید خوردہ اند، آرزو عیب ندارد:

نقاب چہرۂ امید باشد گردِ نومیدی
غبارِ دیدۂ یعقوب آخر توتیا گردد

میں نے مطلوبہ اشیاء کا ایک پرچہ لکھ کر اس کے حوالہ کیا اور وہ لے کر چلا گیا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد جب صورت حال پر زیادہ غور کرنے کا موقعہ ملا تو طبیعت میں ایک خلش سی محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی دراصل طبیعت کی ایک کمزوری تھی کہ حکومت کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے پر راضی ہوگئی۔ جب عزیز و اقربا سے بھی ملنے اور خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی جس کا حق مجرموں اور قاتلوں تک سے چھینا نہیں جاتا تو پھر یہ توقع کیوں رکھی جائے کہ وہی حکومت گھر سے سامان منگوا کر فراہم کر دے گی! ایسی حالت میں عزت نفس کا تقاضا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ نہ تو کوئی آرزو کی جائے، نہ توقع رکھی جائے:

زتیغِ بے نیازی تا توانی، قطعِ ہستی کن
فلک تا افگند از پا ترا، خود پیش دستی کن

میں نے دوسرے ہی دن انسپکٹر جنرل کو خط لکھ دیا کہ فہرست کا پرچہ واپس کر دیا جائے؛ جب تک گورنمنٹ کا موجودہ طرز عمل قائم رہتا ہے، میں کوئی چیز مکان سے منگوانی نہیں چاہتا۔ یہاں اور تمام ساتھیوں نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا:

دامن ا سکا تو بھلا دور ہے اے دست جنوں
کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں

اب چائے کے تیسرے فنجان کے لیے ہمیشہ اس دور صبوحی کا آخری جام ہوتا ہے، ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ افسانہ سرائی ختم کرتا ہوں۔ یادش بخیر، خواجہ شیراز کے پیرِ مے فروش کی موعظت بھی وقت پر کیا کام دے گئی ہے:

دی پیرِ مے فروش کہ ذکرش بخیر باد
گفتا: ''شراب نوش و غمِ دل ببرز یاد''
گفتم: ''بباد می دہدم بادہ نام و ننگ''
گفتا: ''قبول کن سخن و ہر چہ بادبا''
''بے خار گل نہ باشد و بے نیش نوش ہم
تدبیر چیست؟ وضعِ جہاں ایں چنیں فتاد''

''پرکن زبادہ جام و دمادم بگوشِ ہوش
بشنواز و حکایتِ جمشید و کیقباد''

'غبار خاطر' کے خطوط میں آزاد نے مختلف علوم وفنون، تاریخ، دینیات اور موسیقی وغیرہ کے مضامین بیان کیے ہیں۔ مولانا آزاد نہایت ذہین تھے، ان کا مطالعہ بہت وسیع وعمیق تھا اور حافظہ کمال کا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بار جو پڑھ لیتے تھے وہ انھیں ازبر ہو جاتا تھا۔ اس تعلق سے انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''میں نے جو کتاب برسوں پہلے لکھی تھی، اس کا پورا متن میرے ذہن میں محفوظ رہتا تھا اور میں یہ تک بتا سکتا تھا کہ ایک مخصوص بات کس صفحے پر نقل ہوئی ہے۔''

مولانا آزاد کو اردو، عربی اور فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے جس کی تصدیق کے لیے ہم ان کے خطوط دیکھ سکتے ہیں۔ عام طور پر کسی مضمون یا تحریر میں لوگ کسی مناسبت کی بنا پر شعر پیش کرتے ہیں لیکن مولانا آزاد کے یہاں ایسا لگتا ہے کہ اشعار کسی مناسبت کی بنا نہیں بلکہ وہ مضمون کا جزو بن کر آئے ہیں۔

غبار خاطر میں کئی قصے بیان کیے گئے ہیں ان میں ''حکایت بادۂ تریاک، حکایت زاغ وبلبل، چڑیا چڑے کی کہانی، داستان بے ستون وکوہ کن وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے علاوہ اور دوسری بہت سی باتوں کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً پانچویں صلیبی جنگ کا انھوں نے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ آزاد چائے کے بے حد شوقین تھے جس کا ذکر انھوں نے اپنے خطوط میں بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ وائٹ جاسمین بھی انھیں بہت پسند تھی اسے بھی انھوں نے موضوع گفتگو بنایا ہے۔ ان سب سے الگ خدا کی ذات پر بھی لمبی بحث کی ہے۔ جیل کے حالات پر بھی قلم فرسائی کی ہے۔ قید کی زندگی اور جیل کے افسران کا خاکہ بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ہندوستان کے موسموں کا بھی ذکر ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ موسموں پر جس گہرائی سے گفتگو کرتے ہیں اس سے ان کے گہرے مشاہدے اور تجربے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ان کا ایک خط ملاحظہ کیجیے:

قلعہ احمد نگر

۱۴ر جون ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

حسب حالے ننو شیتم و شد آیا مے چند
قاصدے کو کہ فرستم بتو پیغامے چند

گذشتہ سال جب ہم یہاں لائے گئے تھے تو برسات کا موسم تھا۔ وہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا اور جاڑے کی راتیں شروع ہو گئیں۔ پھر جاڑے نے بھی رخت سفر باندھا، اور گرمی اپنا ساز وسامان پھیلانے لگی۔ اب پھر موسم کی گردش اسی نقطہ پر پہنچ رہی ہے جہاں سے چلی تھی۔ گرمی رخصت ہو رہی ہے اور بادلوں کے قافلے ہر طرف سے امنڈنے لگے ہیں۔ دنیا میں اتنی تبدیلیاں ہو چکیں مگر اپنے دل کو دیکھتا ہوں تو ایک دوسرا ہی عالم دکھائی دیتا ہے، جیسے اس نگری میں کبھی موسم بدلتا ہی نہیں۔ سرمدؔ کی رباعی کتنی پامال ہو چکی ہے۔ پھر بھی

بھلائی نہیں جاسکتی۔

سرما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں
گرم بگذشت و ایں دلِ زار ہماں
القصہ تما سرد و گرمِ عالم
برما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں

یہاں احاطہ کے شمالی گوشہ میں ایک نیم کا درخت ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک وارڈر نے اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی اور جڑ کے پاس پھینک دی تھی۔ اب بارش ہوئی تو تمام میدان سرسبز ہونے لگا۔ نیم کی شاخوں نے بھی زرد چیتھڑے اتار کر بہار وشادابی کا نیا جوڑا پہن لیا۔ جس ٹہنی کو دیکھو، ہرے ہرے پتوں اور سفید سفید پھولوں سے لدرہی ہے۔ لیکن اس کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھیے تو گویا اس کے لیے کوئی انقلاب حال ہوا ہی نہیں۔ ویسی ہی سوکھی کی سوکھی پڑی ہے۔ اور زبان حال سے کہہ رہی ہے:

ہیچو ماہی غیر دا غم پوشش دیگر نبود
تاکفن آمد ہمیں یک جامہ برتن داشتم

یہ بھی اسی درخت کی ایک شاخ ہے جسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادابی کا نیا جوڑا پہنا دیا۔ یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی مگر اب اسے دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بہار وخزاں، گرمی وسردی، خشکی وطراوت سب اس کے لیے یکساں ہو گئے!

کل دوپہر کو اس طرف سے گزر رہا تھا کہ یکایک اس شاخِ بریدہ سے پاؤں ٹھکرا گیا۔ میں رک گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ بے اختیار شاعر کی حسن تعلیل یاد آ گئی:

قطعِ امید کردہ نہ خواہد نعیم دہر
شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

میں سوچنے لگا کہ انسان کے دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے۔ اس باغ میں بھی امید وطلب کے بیشمار درخت اگتے ہیں اور بہار کی آمد آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں؛ لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی، ان کے لیے بہار وخزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں رکھتیں؛ کوئی موسم بھی انھیں شادابی کا پیام نہیں پہنچا سکتا!

خزاں کیا! فصلِ گل کہتے ہیں کس کو! کوئی موسم ہو!
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

موسمی پھولوں کے جو درخت یہاں اکتوبر میں لگائے گئے تھے۔ انھوں نے اپریل کے آخر تک دن نکالے، مگر پھر انھیں جگہ خالی کرنی پڑی۔ مئی میں خیال ہوا کہ بارش کے موسم کی تیاریاں شروع کر دینی چاہییں۔ چنانچہ نئے سرے سے تختوں کی درستگی ہوئی، نئے بیج منگوائے گئے، اور اب نئے پودے لگ رہے ہیں۔ چند دنوں میں نئے پھولوں سے نیا چمن آراستہ ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے

مگر میرے سامنے رہ رہ کر ایک دوسری ہی بات آ رہی ہے۔ سونچتا ہوں کہ دنیا کا باغ اپنی گل شگفتگیوں میں کتنا تنگ واقع ہوا ہے! جب تک ایک موسم کے پھول مرجھا نہیں جاتے دوسرے موسم کے پھول کھلتے نہیں۔ گویا قدرت کو جتنا خزانہ لٹانا تھا، لٹا چکی؛ اب اسی میں ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ ایک جگہ کا سامان اٹھایا، دوسری جگہ سجا دیا؛ مگر نئی پونجی یہاں مل سکتی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدسی کو پھولوں کا کھلنا پسند نہیں آیا تھا۔ اسے اندیشہ ہوا تھا کہ اگر باغ کا پھول کھلے گا تو اس کے دل کی کلی بند کی بند رہ جائے گی:

عیش ایں باغ باندازۂ یک تنگ دل ست
کاش گل غنچہ شود، تا دلِ ما بکشاید!

غور کیجیے تو یہاں کی ہر بناوٹ کسی نہ کسی بگاڑ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہاں کا ہر بگاڑ دراصل ایک نئی بناوٹ ہے:

بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

میدانوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں مگر انیٹوں کا پژاوہ بھر جاتا ہے۔ درختوں پر آریاں چلنے لگتی ہیں، مگر جہاز بن کر تیار ہو جاتے ہیں۔ سونے کی کانیں خالی ہو گئیں لیکن کا خزانہ دیکھیے تو اشرفیوں سے بھرپور ہو رہا ہے۔ مزدور نے اپنا پسینہ سر سے پاؤں تک بہا دیا مگر سرمایہ دار کی راحت وعیش کا سروسامان درست ہو گیا۔ ہم مالن کی جھولی بھری دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں مگر ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ کسی کے باغ کی کیاری اجڑی ہو گی جبھی تو یہ جھولی معمور ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب عرفی نے اپنے دامن میں پھول دیکھے تھے تو بے اختیار چیخ اٹھا تھا:

زمانہ گلشنِ عیش کرا بہ یغماد اد؟
کہ گل بدامنِ ما دستہ دستہ می آید!

اکتوبر سے اپریل تک موسمی پھولوں کی کیاریاں ہماری دلچسپیوں کا مرکز رہیں۔ صبح وشام کئی کئی گھنٹے ان کی رکھوالی میں صرف کر دیتے تھے۔ مگر موسم کا پلٹنا تھا کہ ان کی حالت نے بھی پلٹا کھایا اور پھر وہ وقت آ گیا کہ رکھوالی کرنا ایک طرف کوئی اس کا بھی روادار نہ رہا کہ ان اجل رسیدوں کی چند دن اوران کی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ ایک ایک کر کے تمام کیاریاں اکھاڑ ڈالی گئیں۔ وہی ہاتھ جو کبھی اونچے ہو ہو کر ان کے سروسینہ پر پانی بہاتے تھے، اب بے رحمی کے ساتھ ایک ایک ٹہنی کو توڑ مروڑ کر پھینک رہے تھے۔ جن درختوں کے پھولوں کا ایک ایک ورق حسن کا مرقع اور رعنائی کا پیکر تھا اب جھلسی ہوئی جھاڑیوں اور روندی ہوئی گھانس کی طرح میدان کے ایک کونے میں ڈھیر ہو رہا تھا اور صرف اسی مصرف کا رہ گیا تھا کہ جس بے سروساماں کو جلانے کے لیے لکڑیاں میسر نہ آئیں، وہ انھی کو چولھے میں جھونک کر اپنی ہانڈی گرم کر لے:

گلگونۂ عارض ہے، نہ ہے رنگِ حنا تو
اے خوں شدہ دل! تو تو کسی کام نہ آیا

زندگی اور وجود کے جس گوشہ کو دیکھیے، قدرت کی کرشمہ سازیوں کے ایسے ہی تماشے نظر آئیں گے:

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش ست

زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش ست

انسانی زندگی کا بھی بعینہ یہی حال ہوا۔ سعی وعمل کا جو درخت پھل پھول لاتا ہے، اس کی رکھوالی کی جاتی ہے۔ جو بیکار ہو جاتا ہے اسے چھانٹ دیا جاتا ہے: **فاما الزبد فیذھب جفاءً و اماما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔**

مولانا آزاد کو زبان و بیان پر عبور حاصل تھا۔ ان کے یہاں لفظ کا تخلیقی اور برمحل استعمال ملتا ہے۔ انھوں نے مختلف تحریروں کے لیے مختلف اسلوب کو استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ ہر موضوع کو ایک خاص طرح کا اسلوب درکار ہوتا ہے اور اس اسلوب میں ہی اس کا رنگ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس لیے یہ ضرور اشد ضروری ہے کہ جہاں جس اسلوب اور زبان کی ضرورت ہو وہاں وہی اسلوب اور زبان اپنائی جائے۔ مثلاً تحقیق کے لیے الگ زبان ہوتی ہے اور تنقید کے لیے الگ اور تخلیق کے لیے الگ، تاریخ کے لیے الگ تو دینیات کے لیے الگ۔ اسی لیے مولانا آزاد نے جہاں جس اسلوب اور زبان کو موزوں جانا اسے اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان اور اسلوب کے مداح اور قدر دان کثیر تعداد میں کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ مولانا نے الفاظ کی تراش خراش سے کام لیتے ہوئے ان میں نئی معنویت پیدا کر دی ہے۔ ان کے بارے میں ایک عام خیال ہے کہ وہ نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کی نثر کی خوبیوں کے تعلق سے حسرت موہانی نے اپنے ایک شعر میں اس طرح اعتراف کیا ہے:

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

مولانا آزاد کی نثر کی خوبیوں کا اعتراف اور بھی ادبا اور شعرا نے کی ہے۔ سجاد انصاری لکھتے ہیں: ''اگر قرآن اردو زبان میں اترتا تو ابوالکلام کی نثر میں اترتا۔'' غبار خاطر کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ خطوط ہونے کے ساتھ ہی انشا پردازی کا بھی ایک بہترین نمونہ ہے۔

12.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات زندگی سے واقف ہوئے۔

مولانا آزاد کے ادبی اور علمی کارناموں کو جانا۔

مولانا آزاد کے خطوط کا تفصیلی جائزہ لیا۔

مولانا آزاد کی زبان اور اسلوب کا بھی مطالعہ کیا۔

12.7 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال:1۔ مولانا آزاد کے حالات زندگی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے؟

سوال:2۔ ابوالکلام آزاد کی خطوط نگاری (غبار خاطر کے حوالے سے) پر ایک مفصل مضمون قلم بند کیجیے؟

سوال:3۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے کسی ایک خط کو تحریر کیجیے؟

12.8 سوالات کے جوابات

جواب1۔ ابوالکلام آزاد کی پیدائش ۱۸۸۸ء میں عرب کے مکہ شہر میں ہوئی۔ان کے بچپن کا نام محی الدین احمد اور لقب ابوالکلام تھا۔ان کے والد کا نام مولانا خیرالدین بن احمد اور والدہ کا نام مسماۃ عالیہ بنت محمد تھا۔مولانا خیرالدین، محی الدین کو فیروز بخت کہہ کر پکارتے تھے۔محی الدین نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا اور آزاد تخلص اختیار کیا اور اسی نام سے مقبول ہوئے۔ آزاد کے ددیہال اور ننھیال دونوں گھرانوں میں علمی وادبی اور مذہبی رجحان تھا۔وہ بچپن سے نہایت ذہین واقع ہوئے تھے۔گھر کے علمی ماحول میں ان کی تربیت ہوئی۔کم عمری میں ہی قرآن شریف مکمل کرلیا۔اسلام کا مطالعہ بڑی گہرائی اور گیرائی سے کیا۔آزاد نے عربی و فارسی کی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی جب کہ اردو ان کی خود اکتسابی تھی۔ان کے علاوہ دوسری عالمی زبانوں میں انگریزی اور فرانسیسی کو بھی سیکھا۔اکتساب علم کے بعد ادبی زندگی کا آغاز ہوا تو شاعری کے میدان کو اختیار کیا۔دس گیارہ سال کی عمر میں ہی شعر کہنے لگے۔رفتہ رفتہ ذہن سیاست کی طرف منتقل ہوا۔۱۹۰۵ء میں انقلابی رہنماؤں کے زیر اثر برطانوی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا اور اس کے بعد سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔انھوں تحریک آزادی کو تقویت دینے کے لیے یکے بعد دیگرے مختلف رسالے جاری کیے۔جن ’الصباح‘ ۱۳ برس کی عمر میں نکالا جو زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔۱۹۰۳ میں مشہور ومعروف رسالہ ’لسان الصدق‘ منظر عام پر آیا۔ یہ رسالہ انجمن ترقی اردو کا ترجمان بنا۔۱۹۱۲ء میں ’الہلال‘ جاری ہوا جو ان کا مایۂ ناز کارنامہ ہے۔اس میں زیادہ تر سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے۔اس لیے حکومت کی جانب سے اس پر پابندی بھی عائد کی گئی اور جرمانے بھی لگائے گئے۔اس کے بعد ’البلاغ‘ کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔یہ بھی الہلال کی طرز پر تھا۔مولانا کو حکومت بنگال نے جلاوطنی کا حکم دیا، مولانا رانچی چلے گئے جہاں سے انھوں نے دو اہم رسالے ’الزکوۃ الج اور ترجمان القرآن‘ نکالے۔جلد ہی وہ جلاوطنی سے بری ہوگئے۔اسی عہد میں گاندھی جی خلافت تحریک کی رہنمائی کررہے تھے، آزاد بھی گاندھی جی کے ساتھ ہوگئے۔اس تحریک سے وابستہ ہوکر آزاد نے کراچی، آگرہ اور بمبئی جیسے مقامات پر پُر جوش اور معرکۃ الآرا تقریریں کیں جس کی پاداش میں حکومت نے انھیں جیل بھیج دیا۔آزاد جب جیل سے رہا ہوئے تو انھوں نے کانگریس کی رکنیت اختیار کرلی اور جلد ہی صدارت کے منصب پر فائز ہوگئے۔نمک ستیہ گرہ میں شامل ہوئے تو آزاد ایک بار پھر جیل گئے۔آزاد نے ’بھارت چھوڑو آندولن‘ میں بھی حصہ لیا اور ۱۹۴۲ میں گرفتار کرکے احمد نگر جیل بھیج دیے گئے جہاں سے ۱۹۴۵ میں وہ رہا ہوئے۔اس درمیان انھوں نے گزراوقات کے لیے خطوط کو وسیلہ بنایا۔یہ تمام خطوط انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے لیکن یہ خطوط جیل سے باہر نہیں جاسکے بلکہ انھیں کے پاس رہ گئے۔احمد نگر جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ دہلی پہنچے اور کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ان کی زندگی کے تقریباً ۹ سال ۸ مہینے قید میں گزرے۔اکابرین کی بڑی قربانیوں کے بعد ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔اس کے بعد یہاں ہندوستان کا اپنا نظام نافذ ہوا۔اس کے نفاذ کے لیے یہاں کے دانشوروں کو الگ الگ ذمہ داریاں دی گئیں تاکہ عوام وخواص کی زندگی بہتر طور پر گزر سکے، ان دانشوروں نے اپنے اپنے طور پر اپنی ذمہ داری کو بہ خوبی انجام دیا۔مولانا آزاد کو بھی ایک اہم ذمہ داری سونپی گئی جس کو انھوں نے بہ طور احسن ادا کیا۔وہ ہندوستان کے وزیر تعلیم کے ایک باوقار عہدے پر فائز ہوئے۔تعلیم کے میدان میں انھوں نے غیر معمولی کارنامے سرانجام دیے۔کئی نئے ادارے قائم کیے۔تعلیم کے میدان میں مزید بہتری کے لیے کمیشن اور اکامیاں بنائیں۔یونیورسٹی گرانٹ کمیشن، ساہتیہ اکادمی، للت کلا

اکادمی وغیرہ ان ہی کے قائم کردہ ہیں۔مولانا آزاد نے ہمیشہ ملک کی ترقی،امن، بھائی چارااور قومی اتحاد کے لیے کام کیا۔

آزاد دین و مذہب،فلسفہ وحکمت،شعروادب،آثار قدیمہ،علم السنہ جیسے علوم پر دسترس رکھتے تھے۔یہاں تک کہ علم طب میں بھی کسب فیض کیا اور موسیقی سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔آزاد کی تصانیف میں ''اعلان حق ،قول فیصل،خطبات آزاد،نوادر ابوالکلام،تذکرہ،ترجمان القرآن ،غبار خاطر،کاروان خیال،نقش آزاد،تبرکات آزاد،انبیائے کرام،ارمغان آزاد،آزادیِ ہند(انڈیا ونس فریڈم کا اردو ترجمہ)، حیات سرمد،اور ولادت نبویؐ'' وغیرہ اہم ہیں۔مولانا آزاد چائے ،قہوہ اور سگریٹ کا شوق رکھتے تھے اور انھیں کثرت سے استعمال بھی کرتے تھے۔ان کی وفات ۲۲؍فروری ۱۹۵۸کو دہلی میں ہوئی۔

جواب 2۔ اردو ادب میں خطوط نگاری کے حوالے سے جس ادیب کو سب سے زیادہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی وہ مرزا اسداللہ خاں غالب ہیں۔ان کے بعد جس ادیب کا نام لیا جاتا ہے وہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ابوالکلام آزاد نے بہت سے ادیبوں اور دانشوروں کو خطوط لکھے جنھیں ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔انھیں میں ایک مجموعہ ''غبار خاطر'' ہے۔غبار خاطر میں جو خطوط شامل ہیں وہ ۹؍اگست ۱۹۴۲ سے ۱۵؍جون ۱۹۴۵ تک قلعہ احمد نگر کی جیل میں تحریر کیے گئے۔اس مجموعے میں کل ۲۴ خطوط ہیں۔یہ خطوط صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام لکھے گئے تھے مگر حکومت کی پابندیوں کی وجہ سے اس وقت ان تک پہنچ نہیں سکے۔مولانا آزاد شیروانی صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ان کا دوستانہ طویل عرصے پر محیط ہے۔آزاد نے غبار خاطر میں انھیں 'صدیق مکرم' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔قید سے رہائی کے بعد یہ سارے خطوط مولانا نے محمد اجمل خاں کے حوالے کر دیا جسے انھوں نے ترتیب دے کر پہلی بار ۱۹۴۶ء میں شائع کیا جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔اس کے بعد لاہور سے یہ مجموعہ اشاعت پذیر ہو کر منظر عام پر آیا،اس کے بھی کئی ایڈیشن چھپے جسے قارئین نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے نسخے جلد ہی ختم ہو گئے۔پھر اس کے بعد اسے مالک رام نے ۱۹۴۷ء میں شائع کیا۔مالک رام کا ترتیب کردہ نسخہ اب ساہتیہ اکادمی دہلی سے شائع ہو چکا ہے جسے استناد کا درجہ حاصل ہے۔

غبار خاطر کے خطوط یوں تو نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو مخاطب کر کے لکھے گئے ہیں مگر ان کے لکھنے کی اصل وجہ نواب صاحب نہیں ہیں بلکہ قید کے ایام میں وقت گزارنے کے لیے آزاد نے خطوط لکھنا ایک مشغلہ بنایا جس میں انھوں نے اپنے دل کی باتیں بیان کیں۔خط لکھنے کے لیے کاتب اور مکتوب الیہ کا ہونا ضروری ہے۔بطور کاتب آزاد خود تھے اور مکتوب الیہ کے لیے انھوں نے شیروانی صاحب کا انتخاب کیا۔چوں کہ مکتوب الیہ ایک عالم و فاضل شخصیت تھی اس لیے مولانا نے انھیں کے معیار کے مطابق زبان اور اصطلاحات استعمال کی ہیں۔کہیں کہیں زبان مشکل اور پیچیدہ ہو گئی ہے اور کہیں آسان بھی ہے۔آزاد نے جہاں جس طرح کی زبان درکار تھی اسی کے اعتبار سے استعمال کیا ہے۔خطوط میں جگہ جگہ اردو،عربی اور فارسی کے اشعار پیش کیے گئے ہیں جن کی تعداد تقریباً سات سو تک پہنچتی ہے۔ان میں سب سے زیادہ اشعار مرزا اسداللہ خاں غالب کے ہیں۔

'غبار خاطر' کے خطوط میں آزاد نے مختلف علوم وفنون،تاریخ،دینیات اور موسیقی وغیرہ کے مضامین بیان کیے ہیں۔مولانا آزاد نہایت ذہین تھے،ان کا مطالعہ بہت وسیع وعمیق تھا اور حافظہ کمال کا تھا۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بار جو پڑھ لیتے تھے وہ انھیں ازبر ہو جاتا تھا۔اس تعلق سے انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''میں نے جو کتاب برسوں پہلے لکھی تھی، اس کا پورا متن میرے ذہن میں محفوظ رہتا تھا اور
میں یہ تک بتا سکتا تھا کہ ایک مخصوص بات کس صفحے پر نقل ہوئی ہے۔''

مولانا آزاد کو اردو، عربی اور فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے جس کی تصدیق کے لیے ہم ان کے خطوط دیکھ سکتے ہیں۔ عام طور پر کسی مضمون یا تحریر میں لوگ کسی مناسبت کی بنا پر شعر پیش کرتے ہیں لیکن مولانا آزاد کے یہاں ایسا لگتا ہے کہ اشعار کسی مناسبت کی بنا نہیں بلکہ وہ مضمون کا جز و بن کر آئے ہیں۔

غبار خاطر میں کئی قصے بیان کیے گئے ہیں ان میں ''حکایت بادۂ تریاک، حکایت زاغ و بلبل، چڑیا چڑے کی کہانی، داستان بے ستون وکوہ کن وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے علاوہ اور دوسری بہت سی باتوں کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً پانچویں صلیبی جنگ کا انھوں نے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ آزاد چائے کے بے حد شوقین تھے جس کا ذکر انھوں نے اپنے خطوط میں بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ وائٹ جاسمین بھی انھیں بہت پسند تھی اسے بھی انھوں نے موضوع گفتگو بنایا ہے۔ ان سب سے الگ خدا کی ذات پر بھی لمبی بحث کی ہے۔ جیل کے حالات پر بھی قلم فرسائی کی ہے۔ قید کی زندگی اور جیل کے افسران کا خاکہ بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ہندوستان کے موسموں کا بھی ذکر ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ موسموں پر جس گہرائی سے گفتگو کرتے ہیں اس سے ان کے گہرے مشاہدے اور تجربے کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا آزاد کو زبان و بیان پر عبور حاصل تھا۔ ان کے یہاں لفظ کا تخلیقی اور برمحل استعمال ملتا ہے۔ انھوں نے مختلف تحریروں کے لیے مختلف اسلوب کو استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ ہر موضوع کو ایک خاص طرح کا اسلوب درکار ہوتا ہے اور اس اسلوب میں ہی اس کا رنگ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس لیے یہ ضرور اشد ضروری ہے کہ جہاں جس اسلوب اور زبان کی ضرورت ہو وہاں وہی اسلوب اور زبان اپنائی جائے۔ مثلاً تحقیق کے لیے الگ زبان ہوتی ہے اور تنقید کے لیے الگ اور تخلیق کے لیے الگ، تاریخ کے لیے الگ تو دینیات کے لیے الگ۔ اسی لیے مولانا آزاد نے جہاں جس اسلوب اور زبان کو موزوں جانا اسے اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان اور اسلوب کے مداح اور قدر دان کثیر تعداد میں کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ مولانا نے الفاظ کی تراش خراش سے کام لیتے ہوئے ان میں نئی معنویت پیدا کر دی ہے۔ ان کے بارے میں ایک عام خیال ہے کہ وہ نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ مولانا آزاد کی نثر کی خوبیوں کا اعتراف کئی شعرا اور ادبا نے کیا ہے۔ سجاد انصاری لکھتے ہیں: ''اگر قرآن اردو زبان میں اترتا تو ابوالکلام کی نثر میں اترتا۔'' غبار خاطر کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ خطوط ہونے کے ساتھ ہی انشا پردازی کا بھی ایک بہترین نمونہ ہے۔

جواب 3۔ اس کے لیے اوپر دو خط دیے گئے ہیں انھیں ملاحظہ کیجیے۔

12.9 فرہنگ

لفظ	:	معنی
منفرد	:	بے مثل، جس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو
بے پناہ	:	بہت زیادہ، بے انتہا

جلاوطن	:	وہ شخص جو دیس سے نکالا گیا ہو،شہر بدر
پاداش	:	بدلہ،صلہ
نافذ	:	جاری،صادر ہونے والا
اتحاد	:	دو یا دو سے زیادہ کا مل کر ایک ہونا
اسلوب	:	انداز،طرز،طریقہ
مکتوب الیہ	:	جس کے نام خط لکھا جائے
پیچیدہ	:	مشکل
درکار	:	ضروری،خواہش
جزو	:	حصہ،ٹکڑا
تراش خراش	:	کانٹ چھانٹ

12.10 کتب برائے مطالعہ

غبار خاطر : مرتبہ: مالک رام،ساہتیہ اکادمی،دہلی،۱۹۹۶

ابوالکلام آزاد (سوانح وافکار) : شورش کاشمیری،مطبوعات چٹان،لاہور،۱۹۸۸

مولانا ابوالکلام آزاد: ذہن وکردار: عبدالمغنی،انجمن ترقی اردو ہند،دہلی،۱۹۸۹

ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات : انجمن حیات نو،شاہ پور،گلبرگہ،۱۹۸۵

ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش : عبدالمغنی،ایجوکیشنل بک ہاؤس،دہلی۔

بلاک:5 طنز ومزاح

اکائی۱۳: طنز ومزاح کا فن اور آغاز وارتقا

اکائی۱۴: رشید احمد صدیقی، بحیثیت طنز ومزاح نگار مضامین رشید کے خصوصی حوالے سے

اکائی۱۵: مشتاق احمد یوسفی، بحیثیت طنز ومزاح نگار چراغ تلے کے خصوصی حوالے سے

اکائی۱۶: اردو نظم میں طنز ومزاح کی روایت: اکبرالہ آبادی کے خصوصی حوالے سے

بلاک 5 کا تعارف

اکائی 13 ''طنز و مزاح کا فن اور آغاز و ارتقا'' پر مبنی ہے۔اس اکائی میں طنز و مزاح کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اردو ادب میں طنز و مزاح کے عہد بہ عہد ارتقا پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

اکائی 14 ''رشید احمد صدیقی، بحیثیت طنز و مزاح نگار مضامین رشید کے خصوصی حوالے سے'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں رشید احمد صدیقی کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''مضامین رشید'' کا فنی جائزہ لیتے ہوئے اس کے فنی امتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 15 ''مشتاق احمد یوسفی، بحیثیت طنز و مزاح نگار چراغ تلے کے خصوصی حوالے سے'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں مشتاق احمد یوسفی کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''چراغ تلے'' کا فنی جائزہ لیتے ہوئے اس کے فنی امتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی 16 ''اردو نظم میں طنز و مزاح کی روایت: اکبر الہ آبادی کے خصوصی حوالے سے'' کے عنوان سے قائم کی گئی ہے۔جس میں اکبر الہ آبادی کی شخصیت اور احوال پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز اردو نظم نگاری میں ان کی خدمات اور فنی امتیازات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکائی:13 طنز ومزاح کا فن اور آغاز وارتقا

13.1 اغراض ومقاصد

13.2 تمہید

13.3 طنز ومزاح کا تعارف اور فن

13.4 اردو میں طنز ومزاح کے اولین نقوش

13.5 اردو میں طنز ومزاح کا آغاز وارتقا

13.6 آپ نے کیا سیکھا

13.7 اپنا امتحان خود لیجئے

13.8 سوالات کے جوابات

13.9 فرہنگ

13.10 کتب برائے مطالعہ

13.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

☆ طنز ومزاح کے فن سے واقف ہوں گے۔

☆ طنز ومزاح نگاری کی خصوصیات سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

☆ طنز ومزاح نگاری کے اصول وضوابط کا تعین کرسکیں گے۔

☆ اردو میں طنز ومزاح نگاری کے ابتدائی نقوش کی معلومات حاصل کریں گے۔

☆ اردو میں طنز ومزاح نگاری کی روایت کا جائزہ لے سکیں گے۔

☆ اردو کے اہم مزاح نگاروں اوران کے کارناموں سے متعارف ہوں گے۔

13.2 تمہید

طنز ومزاح اردو ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔ مزاح نگاری کا فن انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ انسانی صفات میں سنجیدگی جوہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن انسانی معاشرہ ہمیشہ سنجیدہ رہ کر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ مزاج کی تبدیلی انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ متانت، سنجیدگی اوراپنے روزمرہ کے مشاغل سے اکتا کر انسان کچھ دیر کے لیے فرحت اور تازگی کی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے۔ ایسے میں وہ طنز ومزاح کا دامن

تھام لیتا ہے۔طنز ومزاح ادیب کی قوتِ مشاہدہ اور ذہنی ادراک کی پیداوار ہے۔اس لیے طنز ومزاح کے عناصر معاشرہ اور انسانی زندگی پر تنقیدی نظر کا حکم رکھتے ہیں، جن کے سہارے طنز ومزاح نگار اپنے معاشرہ کی ناانصافیوں اور فرد کی نارسائیوں کا مطالعہ کرتا ہے۔اس میں فرق اتنا ہے کہ تنقیدی ادب اپنے تعقلی اور سنجیدہ مباحث کے باعث ایک نظریے اور ردِ عمل کو تحریک دیتا ہے۔لیکن ظریفانہ ادب مزاح کے ساتھ نشتریت کے ایک خوشگوار امتزاج کے باعث نہ صرف مقبول ہوتا ہے بلکہ عوامی راحت اور فرحت کا سبب بھی بنتا ہے۔

اردو کے نثری سرمائے میں اگر ظرافت کے ابتدائی نقش تلاش کئے جائیں تو ہمیں داستانوں سے ہی ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔اس پس منظر میں غالب نے اپنے خطوط کے ذریعے مزاح نگاری کا ایک شاندار سرمایہ چھوڑا ہے۔ان کے بعد اردو نثر میں 'اودھ پنچ' کی خدمات مزاح نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اودھ پنچ کے مصنفین میں سب سے اہم نام رتن ناتھ سرشار کا تھا۔اودھ پنچ کے مدیر سجاد حسین تھے جن کی نثر بھی کمال پر تھی۔اس کے بعد عبوری دور شروع ہوتا ہے۔جس کے لکھنے والوں میں مہدی افادی اور ملا رموزی، حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کے نام آتے ہیں۔جدید اردو نثر میں خالص مزاح کا رنگ اپنے مخصوص طرزِ اظہار میں واضح ہے۔پھر اس نے عملی مذاق کی صورت اختیار کر لی جس کے نمائندہ لکھنے والوں میں عظیم بیگ چغتائی، شوکت، تھانوی، اور شفیق الرحمٰن کے نام لیے جاسکتے ہیں۔پطرس بخاری نے مغربی ادب سے متاثر ہوکر اپنی تحریروں میں طنز ومزاح پیدا کیا۔لیکن اس مزاح میں مقامیت کا رنگ صاف طور سے نمایاں ہے۔ایسے مزاح نگار جو اپنے اسلوب کے سبب مقبول ہوئے ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ، عبدالعزیز فلک نما اور نیاز فتح پوری کے نام لیے جاسکتے ہیں۔رشید احمد صدیقی، کنھیا لال کپور اور کرشن چندر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ادھر جو نام منظرِ عام پر آئے ان میں یوسف ناظم، احمد جمال پاشا اور مجتبیٰ حسین ہیں لیکن اردو طنز ومزاح جس نام پر فخر کرتا ہے وہ مشتاق یوسفی ہیں۔ان کے یہاں خیال کے مزاح کی اعلیٰ شکلیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس اکائی میں ہم طنز ومزاح نگاری کے فن اور اردو میں طنز ومزاح نگاری کی روایت کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

13.3 طنز ومزاح کا تعارف اور فن

اردو ادب میں طنز ومزاح کو اکثر ایک معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔حالاں کہ دونوں میں فرق ہے۔دونوں کا اپنا دائرہ کار اور حدود ہیں۔لیکن اس کے باوجود یہ دونوں اکثر ایک دوسرے کے متوازی بھی سفر کرتے ہیں۔اور کہیں کہیں ان کی سرحدیں اس قدر مل جاتی ہیں۔کہ ان کی تفریق مشکل ہوتی ہے۔مزاح عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہنسی، خوش طبعی، ظرافت، مذاق، ٹھٹا، مذاق چہل وغیرہ ہیں۔

مزاح کا اصل سرچشمہ انسانی سرشت میں شامل خوشی کا جذبہ ہے جو ہنسی یا مسکراہٹ کی کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے انسان کے انسان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہی نہیں بلکہ حیوانِ ظریف بھی ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں اختصاص بھی حاصل ہے، اور دیگر حیوانات سے وہ عقل کی بنیاد پر ممتاز ہے حسِ مزاح ایک ایسا مزاح ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے علاوہ کسی اور حیوان کو عطا نہیں کیا۔

مزاح آزادانہ فکر اور ہمدردانہ شعور و احساس کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں مسرت اور خوش مذاقی کے عناصر پائے جاتے ہیں انسان جب بے بس ہوتا ہے تو کراہ اٹھتا ہے۔جب خوش ہوتا ہے تو مسکراتا ہے۔یہ ایک فطری عمل ہے کہ انسان کی زندگی میں غم، دکھ، درد پریشانی، کرب جیسے بے شمار جذبے رونما ہوتے ہیں۔مزاح میں زندگی کے مضحک پہلوؤں کو اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ سننے والوں کو خوشی محسوس ہوتی ہے۔

انگریزی ادب میں ایک لفظ ہومر (Humour) رائج ہے جسے اردو میں مزاح کہا جاتا ہے۔لفظ ہومر (Humour) ایک لاطینی لفظ ہے اس کے لغوی معنی رطوبت کے ہیں۔زمانۂ قدیم سے بھی علم و ادب کے مشہور مصنفین و مفکرین اور اہل قلم نے مزاح کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔بقول ارسطو:

''ہنسی کسی کسی یا بدصورتی کو دیکھ کرمعرض وجود میں آتی ہے جو دردانگیز نہ ہو''

(اردوادب میں طنزومزاح۔وزیرآغا۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،۱۹۹۹ء،ص:۳۲)

مذکورہ سطر میں ارسطو نے مزاح کے مزاح کے متعلق یہ بتایا ہے کہ مزاح احساس کمتری پر مبنی ہے۔اور جب ہم سماج کے نظام کو منتشر شکل میں پاتے ہیں تو ان کے اندر کسی نقص کے مبہم پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں،اس طرح طنز پیدا ہوتا ہے جو مزاح کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ احساسِ کمتری سے پیدا ہونے والا طنز''مرید پور کا پیر'' میں اچھی طرح نظر آتا ہے

مزاح کی تعریف کے سلسلے میں ''وزیرآغا'' ''اسٹیفن لی کاک(Stephen leacock) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔''

(اردوادب میں طنزومزاح۔وزیرآغا۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،۱۹۹۹ء،ص:۴۷)

''اسٹیفن لی کاک'' کے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں دکھ، درد، غم، پریشانی، کرب جیسے بے شمار جذبات رونما ہوتے ہیں یعنی مزاح اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جو زندگی میں پھیلی تمام ناہمواریوں کو دور کرتا ہے اور انسان کی زندگی میں مسکراہٹ اور قہقہوں کی لہر دوڑ اٹھتی ہے۔

مزاح بغیر طنز کے وجود میں نہیں آسکتا مزاح میں ہلکا سا طنز چھپا ہوتا ہے جس کی بنا پر مزاح وجود میں آتا ہے اور زیادہ تر ہنسی مزاح سے پیدا ہوتی ہے۔مزاح کوئی ایک بات، ایک جملے اور ایک فقرے میں نہیں چھپا ہوتا بلکہ پورے بیان میں پیوست ہوتا ہے۔اس کا تعلق ہمدردی سے ہے۔مزاح کا مقصد کسی کا دل دکھانا یا کسی پر طنز کرنا یا طعنہ دینا نہیں ہوتا بلکہ مزاح میں بڑی سمجھ بوجھ اور سلاست سے کام لیا جاتا ہے اور ہمدردی مزاح کا ایک خاص جز ہے۔مزاح میں خوشی، مسرت کی کیفیت آمد کی ہوتی ہے نہ کہ آورد کی یعنی مزاح انسان کی زندگی کا بے ساختہ عمل ہے۔جس سے انسانی زندگی خوشی و مسرت کے جذبے کا احساس کرتی ہے۔''خواجہ الطاف حسین حالی'' خالص مزاح کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مزاح کسی کا دل دکھانے کے لیے نہیں ہونا چاہیے بلکہ مجلس کا دل خوش کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔اور جس طرح انسان کو ٹھنڈی ہوا سے سکون ملتا ہے مزاح کو بھی سکون کا باعث بننا چاہیے، وہ لکھتے ہیں:

''مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لیے (نہ کہ کسی کا دل دکھانے کے لیے) کیا جائے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا یا ایک سہانی خوشبو کی لپٹ ہے جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ایسا مزاح فلاسفہ و حکماء بلکہ اولیاء و انبیاء نے بھی کیا ہے اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔اس سے جودت اور ذہن کو تیزی ہوتی ہے اور مزاح کرنے والا سب کی نظروں میں محبوب اور مقبول ہوتا ہے''۔

(مقالات حالی (حصّہ اوّل)،مضمون مزاح۔انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۵۵ء)

مذکورہ اقتباس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مزاح ایک ایسا انسانی جذبہ یا احساس ہے جو کسی کے دل کو تکلیف نہیں دیتا بلکہ تمام غم زدہ دلوں کو خوش کرنے کا کام کرتا ہے۔مزاح سے عہد حاضر کے لوگ ہی نہیں بلکہ قدیم دور میں تمام حکماء، فلاسفہ، اولیاء، امراء اور ادباء وغیرہ بھی محظوظ ہوتے رہے ہیں۔مزاح دلوں میں حرارت بھی پیدا کرتا ہے۔

مزاح کی تعریف کے بعد اب طنز کی تعریف پڑھتے ہیں تاکہ دونوں ہی لفظوں کے اصطلاحی مفہوم سے واقف ہو سکیں۔طنز بھی عربی

زبان کا لفظ ہے جس کے معنی طعنہ، مہنا، آوازہ، تمسخر، رمز کے ساتھ بات کرنا، چھیڑ، ہنسی، بولی ٹھولی، وغیرہ ہیں۔

طنز کسی انسان پر یا اس کے خلاف جذبہ احتجاج کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ طنز نگار طنز کے ذریعہ اُس انسان یا معاشرے کو بہتر بنانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ طنز کی تلخی اور اس کے تیر ونشتر قاری کو محظوظ اور متاثر کرنے کے بجائے اکثر بے مزہ کر دیتے ہیں۔ اس لیے طنز نگار طنز کی تلخی اور اس کے تیر ونشتر کو کم کرنے کے لیے مزاح کا استعمال کرتا ہے۔

طنز کے لیے انگریزی میں Satire کے لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ حالاں کہ اردو میں ہجو، پھبتی، مذمّت، تعریض وغیرہ جیسے دوسرے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن Satire کا صحیح ترین متبادل طنز ہی ہے۔ اور یہ بڑی حد تک طنز کے مفہوم کو بھی ادا کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر جانسن:

''طنز حماقت یا برائی کو ختم کرنے کا نام ہے۔''

(اردو میں طنز و مزاح کا تنقیدی مطالعہ (عبدالغفور) ڈاکٹر جانسن، ۱۹۸۳ء، ص: ۵۵)

انسان اشرف المخلوقات ہے مگر یہ کہنا کہ اس میں کوئی برائی موجود نہیں بے جا ہوگا۔ برائیاں اس کو ڈھونڈ لیتی ہیں اور انسان ان برائیوں سے تا حیات لڑتا رہتا ہے۔ طنز نگار سماج وانسان میں پھیلی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے طرح طرح کے Tools اور حربوں کا استعمال کرتا ہے ان کو اپنے وجود سے نکالنے کے لیے ناکام اور کامیاب کاشش کرتا رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ طنز سے وہ حماقت کی زد میں آتا ہے لیکن اس کا شعور جاگ اٹھتا ہے۔ طنز نگار تمام دنیا کے لوگوں کی برائیوں کو تو ختم نہیں کرسکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس سے تمام انسانوں کا شعور ضرور جاگ اٹھتا ہے۔

طنز کی وضاحت کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''ستائر (Satire) کا مفہوم انگریزی میں ہے اس کی پوری اور صحیح ترجمانی (ہمارے یہاں کسی ایک لفظ میں) تقریباً ممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اس موقع پر چند الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً ہجو، ہجا، ملیح، تعریض تنقیص، لعن وطعن، طعن وطنز، استہزاء، مذمت، مضحکات، شطحیات، ہجو و ہزل وغیرہ، ان الفاظ کے دینے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک ''ستائر'' (سطائر) کے مترادف ہے، اکثر ان الفاظ کی ترتیب اختیار کی جاتی ہے۔''

(طنزیات و مضحکات، رشید احمد صدیقی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء ص: ۱۹)

مذکورہ اقتباس میں رشید احمد صدیقی نے طنز کے کئی مترادف الفاظ بیان کئے ہیں۔ لیکن طنز کا لفظ اب اردو میں عام طور سے Satire کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ طنز میں نشتر کے ساتھ اصلاح کا پہلو بھی مضمر ہے معاشرے کی ناہمواریوں کی نشاندہی کے لیے طنز کا استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں:

''طنز بنیادی طور پر ایک ایسے باشعور حساس اور دردمند انسان کے ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختہ مشق بنالیا ہو۔''

(اردو ادب میں طنز و مزاح، ڈاکٹر وزیر آغا، ۱۹۹۹ء)

طنز کا مقصد کسی شخص یا معاشرے میں موجود کمیوں کو اجاگر کرنا یا ان کی نشاندہی کرنا ہے۔ اس لیے طنز نگار فرد، معاشرہ اور فطرت کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس میں ایک طرح کی نشتریت، تلخی اور بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ طنز نگار باشعور، حساس اور دردمند ہوتا ہے اور اسی سبب وہ معاشرہ میں پائی جانے والی بے انصافیوں اور ناہمواریوں کی نشاندہی کرتا ہے اور ان پر طنز کر کے اصلاح کا خواہاں ہوتا ہے۔ اچھا طنز اور طنز نگار وہ ہے جو تمام ذاتی عناد و تعصّب سے پاک ہو۔

طنز و مزاح کا بنیادی فرق یہ ہے کہ مزاح نگار اس فرد کے ساتھ جس کو وہ مزاح کا نشانہ بناتا ہے وزیر آغا کے بقول ''ایک ذہنی کھیل'' میں شریک ہو جاتا ہے۔ اور اس سے محظوظ ہونے لگتا ہے جب کہ طنز نگار اس ماحول سے خود کو صاف بچا لیتا ہے، جس پر وہ طنز کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ طنز نگار مزاح نگار کی طرح ہمدردانہ رویہ نہیں رکھتا بلکہ جارحانہ اور تمسخرانہ ہوتا ہے۔ طنز نگار اپنے تمسخر سے نفرت کرتا ہے جب کہ اپنے ہدف پر مزاح نگار کا رویہ دوستانہ اور اصلاح کا ہوتا ہے۔

طنز نگار جس چیز پر طنز کرتا ہے اس سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ مگر طنز نگاری کا محرک لازمی طور پر نفرت کا جذبہ نہیں ہوتا بلکہ اکثر صورتوں میں طنز نگاری کے پیچھے ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ طنز نگار اپنے اطراف کی ناہمواریوں کو تبدیل کرنا چاہتا ہے صرف تخریب کاری اس کا مقصد نہیں ہوتا وہ چیزوں کو توڑتا پھوڑتا اس لیے ہے کہ وہ ان چیزوں سے بہتر چیز کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس تخریب کے پیچھے طنز نگار کا مقصد تعمیر کا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مزاح میں طنز کا پہلو نہیں ہوتا اگر غور و خوض کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مزاح کے پیچھے بھی بعض اوقات نفرت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے یہ بات اور ہے کہ وہ نفرت ہنسی دل لگی میں ایسی ہوتی ہے کہ اس کو فوراً محسوس کر لینا ممکن نہیں ہوتا۔ مزاح کے پیچھے طنز نگاری کا جذبہ چھپا ہوتا ہے۔

مزاح بغیر طنز کے وجود میں نہیں آ سکتا اگر چہ مزاح میں پوری طرح سے طنز موجود نہیں ہوتا بلکہ طنز کی ہلکی پھلکی آمیزش مزاح کو جاندار بنا دیتی ہے۔ بعض مصنّفین و اہل قلم نے طنز و ظرافت پر تنقید کی ہے، کچھ ظرافت کے لیے طنز اور طنز کے لیے ظرافت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ طنز میں مزاح کا ہونا بہت ضروری ہے طنز بغیر مزاح کے طعن و تشنیع ،لعنت و ملامت کے ضمرے میں شامل ہو جائے گا۔ لیکن طنز میں مزاح کی لطافت اتنی زیادہ نہ ہو کہ طنز طنز کے بجائے مزاح محسوس ہونے لگے یعنی طنز میں تلخی کا ہونا ضروری ہے اور اس تلخی کی بنا پر انسان یا سماج اپنے آپ کو تبدیل کرنے یا اپنی اصلاح کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ بعض مصنّفین کا خیال ہے کہ ظرافت میں طنز مضر ہوتا ہے اور طنز میں ظرافت شامل نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ ظرافت میں طنز مضمر ہوتا ہے طنز میں ظرافت کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک ظرافت طنز سے مشکل جن ہے ظرافت کے لیے خوش دلی اور زحمت درکار ہوتی ہے۔ طنز میں جوش و غصہ اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

طنز کی اساس حقیقت پر رکھی جاتی ہے، کذب اور لغو پر نہیں۔ طنز کی بنیاد تخیل پر بھی نہیں رکھی جا سکتی۔ طنز نگار انسان دوست ہوتا ہے۔ ایک ہمدرد دوست کی طرح وہ معاشرہ، ملک اور دنیا کو بار بار ٹوکتا ہے بلکہ اس کے زخموں کو کریدتا ہے تاکہ حقیقت کی آنکھوں سے وہ اپنے عیوب کو دیکھے اور اس کی اصلاح کرے، اس تناظر میں طنز نگار سماج کو حقیقت شناس بناتا ہے۔ اس راہ میں جرأت مندی سے کام لے کر نظام کے نقائص کی نشان دہی کے لیے اس کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتا۔

سوال یہ ہے کہ مزاح اور طنز میں کون زیادہ اہم ہے۔ بعض لوگ طنز کی اہمیت اور اس کی مقصدیت کے سبب اسے مزاح فوقیت دیتے ہیں۔ ایسے لوگ مزاح برائے مزاح کو زیادہ اہم نہیں گردانتے۔ اردو کے پہلے عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی نے اردو شاعری کے ابتدائی دور میں ہی مزاح اور طنز کا ایک ایسا معیار قائم کیا جو ایک بلند معیار اور جدید تصور سے بہت قریب ہے۔ نظیر کی نظم روٹی سماجی حقیقت نگاری کا سفاک بیانیہ پیش

کرتا ہے۔طنز کی کاٹ بہت گہری ہے:

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے   یہ مہر وماہ نے بنائے ہیں کا ہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے   ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

غالبؔ نے بھی طنز کو اپنی شوخیٔ طبع سے اپنی شناخت کا جز بنادیا ہے۔غالب کے یہاں عشقیہ طنز کی مثال ملاحظہ کریں۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ ونام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹا تا نہ گھر کو میں

طنزومزاح دونوں کی اپنی جداگانہ اہمیت ہے اور کسی کو کسی پر تفوق حاصل نہیں۔البتہ ایسی تخلیقات کی اہمیت دو چند ہوجاتی ہے جس میں طنز اور مزاح دونوں کے تعاون سے حقیقت کی نقاب کشائی کی جائے۔طنز وظرافت دیکھنے میں تو ایک دوسرے سے جدا نظر آتے ہیں مگر جداگانہ اہمیت کے باوجود دونوں آپس میں مربوط ہوتے ہیں۔طنز میں مزاح اور مزاح میں طنز کا ہونا ضروری ہے اگر طنز میں مزاح کی چاشنی نہیں تو وہ صرف اور صرف ایک گالی بن کر رہ جائے گا اور اسی طرح مزاح میں طنز نہیں تو وہ صرف پھکڑ پن بن کر رہ جائے گا۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص صرف طنز یا مزاح کرتا ہے تو طنز ومزاح کی دنیا میں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔طنز نگار اور مزاح نگار دونوں خطرناک راستوں پر سفر کرتے ہیں طنز نگار کی ذراسی بے احتیاطی اسے طنز نگاری کے عظیم مرتبے سے سبکدوش کرسکتی ہے۔اور معمولی سی لرزش سے مزاح نگار ابتذال کی پستیوں میں گرسکتا ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ طنز نگاری اور مزاح نگاری دونوں کے لیے ریاضت کے ساتھ ساتھ فنکارانہ صلاحیت کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔

اردو طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی تاریخ اردو نثر سے بھی پرانی ہے اردو کے طنز وظرافت کے شاعروں کی فہرست میں کچھ ایسے بھی شعراء ہیں جن کے متعلق قیاس بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ طنز ومزاحیہ ادب کے میدان کے شہ سوار ہوں گے مثلاً میر تقی میر،اسداللہ خاں غالب،مصحفی،حالی، اقبال،شبلی،وغیرہ لیکن ان کے ہاں بھی طنز اور مزاح کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں جو باضابطہ مزاح گو شعراء کے پاس بھی مشکل سے نظر آتے ہیں۔اب اس کے بعد ہم آگے اردو شعر اوب میں طنز ومزاح نگاری کی روایت کا مطالعہ کریں گے۔جس آپ سب اردو کے مزاح نگاروں اور ان کی تخلیقات کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں گے۔

13.4 طنز ومزاح نگاری کے اولین نقوش

احتجاج انسانی فطرت کا لازمی حصہ رہا ہے۔انسانی زندگی اور حالات کی ناہمواریاں،احتجاج کو جنم دیتی ہیں۔اردو شاعری میں مذہبی تنگ نظری وسخت گیری،پر ہمارے سماج میں احتجاج کی روایت روزِ اول سے موجود رہی ہے۔احتجاج کا یہ رویہ واعظ،ناصح اور ان کے بعض متعلقات کا مذاق اڑانے اور ان پر طنز کی صورت میں سامنے آتا ہے۔یہ فارسی ادب کی راہ سے اردو کو وراثت میں ملا ہے چنانچہ اردو شعرا کے یہاں واعظ وناصح اور اسی قبیل کے دوسرے افراد کو طنز ومزاح کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔البتہ طنز ومزاح کے رنگ کو بطور خاص اپنانے اور اس کی جانب خصوصاً متوجہ ہونے کا رواج سترہویں صدی میں جعفر زٹلی کے ہاتھوں ہوا۔جعفر زٹلی عہد عالمگیری کا ایک بے باک و بے لگام مزاح نگار ہے۔اس نے اپنے اشعار میں عام لوگوں کی طرح وقت کے بادشاہوں کو بھی طنز وتعریض کا نشانہ بنایا ہے۔وہ اورنگ زیب کے عہد کا شاعر ہے۔ اس نے اورنگ زیب کے عہد حکومت کو قریب سے دیکھا تھا اور اس کا مداح تھا۔لہٰذا اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب ان کے بیٹوں کی آپسی

لڑائی، نادر شاہ کے حملوں اور مراٹھوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب مغلیہ سلطنت کا زوال ہوا تو اس نے طنزیہ پیرائے میں اپنی برہمی کا اظہار کیا۔

تربوزہ خربوزہ نہ رسد گر ترا بہ دست
یک سبز پھانک کھیرۂ بالم غنیمت است
گر شیوۂ گدائی و خواری طلب کنی
پس نوکری شاہِ معظم غنیمت است

اردو کے اولین شعرا میں طنز و مزاح کے حوالے سے امیر خسرو کا نام آتا ہے لیکن اس دعوے کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں، حتیٰ کہ وہ گیت، دوہے، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں جو امیر خسرو کے نام سے منسوب ہیں، انھیں بھی بالیقین خسرو کی تخلیقات کہنے میں تامل ہوتا ہے اور منظوم یا منثور ظرافت کی جو مثالیں ملتی ہیں وہ اتنی دھندلی ہیں کہ انھیں کسی طور سند تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ جعفر زٹلی پہلا باضابطہ ظرافت نگار ہے، جس نے مزاحیہ رنگِ سخن کو مستحکم کیا اور اس راہ میں جان کی پروا نہیں کی اور بالآخر مارا گیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جعفر زٹلی کے متعلق لکھا ہے کہ اس کے کلام سے نہ صرف اس دور کے حالات اور عوامل کا پتا چلتا ہے۔ بلکہ معاشرتی و تہذیبی گراوٹ اور سیاسی و اخلاقی زوال کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بلکہ اس کی ہجو یہ شاعری کا مزاج شہرآشوب کا مزاج ہے۔ چنانچہ اس نے آشوبِ زمانہ، آشوبِ ذات، اختلالِ تہذیب، فالنامے، تہذیب ذات اور اسی نوع کی دیگر پچاس سے زائد نظمیں کہی ہیں، جن نظموں کی بنیاد طنز و تعریض پر استوار ہے۔ ان میں ہجویات کا حصہ زیادہ ہے۔

دکنی شعرا کے یہاں عام طور سے معاصرانہ چشمک، آپسی نوک جھونک اور فقرے بازی کی صورت میں ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ملا وجہی، غواصی، سیوک اور لطیف کی چشمک مشہور ہے۔ بادشاہ قلی قطب شاہ کا درباری شاعر ملا وجہی کا ذکر ملتا ہے، جو غواصی کو زیر کرنے کی نت نئی ترکیبیں کرتا تھا۔ اپنے معاصرین سے ولی دکنی کی بھی تاتنی رہتی تھی۔ محتسب، واعظ اور ملائیت پر ان کے طنزیہ وار نے دکن میں طنز کی راہ ہموار کی۔ ولی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آسماں اوپر نہ بوجھو چادر ابر سفید
جانمازِ زاہدِ عزلت نشیں برباد ہے
شیخ مت گھر سے نکل آج کہ خوباں کے حضور
گول دستار تیری باعث رسوائی ہے

سودا کے یہاں بھی ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔ قصائد اور ہجویات میں سودا کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ سودا نے اپنی ہجو نگاری میں اولاً اپنے کسی حریف یا بدخواہ جیسے فدوی، ضاحک اور فوقی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے یا ذاتی سطح پر اپنے انتقامی جذبے سے کام لیا ہے۔ دوسرے اپنے حریف کو نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ اس نے زمانے کی نارسائیوں اور ابتری پر وار کیا ہے۔

ہجویاتِ سودا کے علاوہ میر کی ہجویات بھی قابلِ توجہ ہیں جن میں ذاتیات سے گریز کرتے ہوئے میر نے قلبی انتشار اور بے قراری کی طرح 'گھر' کی ابتری اور بے ترتیبی کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال — اس خرابے میں میں ہوا پامال
گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے — سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق — سو شکستہ تر از دلِ عاشق

طنزیہ ومزاحیہ عناصر ہمیں کسی نہ کسی صورت میں میر تقی میر، جرأت، مصحفی، ناسخ، انشا، مومن، شیفتہ اور ذوق کے یہاں بھی ملتے ہیں۔

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں
جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا
(میر)

سامنے میرے جو منھ کرکے تم نہیں بیٹھتے
کیا کسی کے سامنے ہے یہ قسم کھائی ہوئی
(جرأت)

اسی طرح دیگر شعرا کے یہاں بھی طنز ومزاح کے نمونے پائے جاتے ہیں طوالت کے سبب مثالوں سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ سماجی کمیوں، کوتاہیوں اور نارسائیوں کے ضمن میں نظیر اکبرآبادی نے بھی اپنی نظموں میں طنز سے کام لیا ہے۔ ان کا سماجی شعور بڑا پختہ اور گہرا تھا۔ آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، اور روٹی نامہ جیسی اپنی نظموں میں انھوں نے سماجی طنز کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔

اردو نثر میں طنز وظرافت کا ابتدائی نمونہ شاہ حاتم (۱۶۹۹ء۔۱۷۷۳ء) کے یہاں ایک طبی نسخہ ''نسخہ مفرح الضحک معتدل من طب الظرافت'' کی شکل میں ملتا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ نسخہ زٹلی سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہوگا۔ نسخے کی عبارت مسجع ومقفیٰ ہے تاہم اس کی زبان زٹلی سے زیادہ آسان اور صاف ہے۔ یہ فحش نہیں ہے اور فارسی کا اثر بھی کچھ کم ہے۔

اس دور میں داستانیں عوام کی تفریح طبع کا ذریعہ تھیں۔ ظرافت کے ابتدائی نقوش ہمیں انھیں داستانوں سے ملنے شروع ہوجاتے ہیں۔ یہ نقوش اگر چہ کہیں ہلکے اور گہرے رنگ میں نظر آتے ہیں۔ داستانوں کے بیشتر قصے اپنی مضحکہ خیز نوعیت کے اعتبار سے ہمارے استہزائیہ حس کو بیدار کرتے ہیں۔ میر امن کی داستان باغ و بہار میں لطف بیان، اختصار اور سادگی اتنی زبردست ہے کہ ظرافت کے نقوش دب کر رہ گئے ہیں۔ دوسری طرف رجب علی بیگ سرور کی داستان فسانہ عجائب ہے جس میں تصنع اور تکلف اور مقفیٰ و مسجع اندازِ بیان کے باوجود چست انداز نگارش کے ایسے نمونے ملتے ہیں جو کبھی کبھی ظرافت کی سرحدوں کو چھو لیتے ہیں۔ رتن ناتھ سرشار کی فسانۂ آزاد میں فقرہ بازی، چہل اور الھڑ پن کے مناظر پست و چست شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ سرور اور سرشار کی تحریریں مزاح نگاری کے سلسلے میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ داستان داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال میں ظرافت کا انداز تھوڑا مختلف ہے۔ ان داستانوں میں عیاروں کی عیاری سے تفریح طبع کے سامان بہم پہنچائے گئے ہیں۔ اس دور کی بعض داستانوں مثلاً حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی، حاتم طائی اور الف لیلیٰ کے تراجم میں مزاح کے نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن ان کا رنگ اتنا گہرا نہیں کہ انھیں مزاح نگاری کے ضمن میں لایا جائے۔ انشاء اللہ خاں انشا کی رانی کیتکی کی کہانی میں ان کا مخصوص ظریفانہ انداز جھلکتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اجتہادی روش کے نقوش موجود ہیں البتہ مہجور کی کتاب ''نورتن'' اس زمانے کی ظرافت کا نچوڑ ضرور پیش کرتی ہے۔

اردو نثر میں طنز ومزاح کے اعلیٰ نمونے ہمیں خطوطِ غالب میں ملتے ہیں۔ انھیں بنیادوں پر الطاف حسین نے حالی کو حیوانِ ظریف کہا ہے۔ شوخیِ تحریر غالب کے خطوط کی اولین شناخت ہے اور اسی نے ان کے خطوط کو ناول اور ڈرامے کی طرح قابلِ توجہ بنادیا ہے۔ اپنے خطوط میں غالب نے خود کو نشانہ بنایا ہے اور ساتھ ہی دوستوں پر بھی تیر ونشتر چلائے ہیں۔ بے تکلف احباب کے خطوط میں ظرافت کا رنگ زیادہ گہرا ہوگیا ہے۔ غالب کا طنز تلخی اور زہرناکی سے پاک ایک خالص طنز ہے جو دیرپا اثرات اپنے اندر رکھتا ہے۔ غالب کو خود اپنے اوپر ہنسنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ

اپنے جسم کے رستے ہوئے زخموں کے بیان میں بھی شوخی سے باز نہیں آتے تھے۔ مرزا علاءالدین احمد خاں کے نام خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب وگل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہ گاروں کو دنیا میں بھیج کر سزا دی جاتی ہے۔ چنانچہ ۸/رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ ۱۳/برس حوالات میں رہا۔ ۱۷/رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا۔ نظم اور نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیل خانے میں سے بھاگا، تین برس تک بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب یہ دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں، سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مرادآباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔'' (خطوطِ غالب، جلد اول، مطبوعات مجلسِ یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء ص۔ ۲۵۱)

غالب کے یہاں طنز میں ایک نوع کی تمثیلی شگفتگی ملتی ہے۔ اپنے اعزا اور احباب کے انتقال پر انھوں نے جس طرح تعزیت کی، اس سے بھی غالب کے اچھوتے اسلوب بیان اور ان کے داخلی ظریفانہ کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نثر میں شاعری ہی کی طرح غالب نے اپنی الگ راہ نکالی۔ غالباً اس کا انھیں احساس بھی تھا۔ مرزا حاتم علی مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

ناقدینِ ادب کو غالب کی نثر میں ظرافت کا بخوبی احساس ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ اگر اردو انشائیہ پرداز یہ چاہتے ہیں کہ وہ میدانِ ظرافت میں آگے بڑھیں تو وہ اپنی راتیں اور اپنے دن غالب کے مطالعہ میں صرف کریں۔''

13.5 اردو میں طنز و مزاح نگاری کا آغاز و ارتقا

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ ظرافت کے ابتدائی نقوش ہمیں داستانوں میں ہی نظر آنے لگتے ہیں۔ اور اس کے بعد ظرافت کی توانا روایت ہمیں غالب کے خطوط میں نظر آتی ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر آچکا ہے۔ اس کے بعد ہمیں طنز و مزاح کے نمونے اودھ پنچ میں دکھائی پڑتے ہیں۔ جسے طنز و مزاح کا دوسرا بڑا سنگ میل کہنا غلط نہ ہوگا۔ یہ اخبار ۱۸۷۷ء میں اس وقت جاری کیا گیا جب ۱۸۵۷ء کی جدو جہد میں ناکامی کے بعد ہندوستان کا نظام تیزی سے بدل رہا تھا۔ مسلمان نہ صرف حیران اور متوحش تھے بلکہ نئی صورتِ حال بھی ان کی فہم و فراست سے بالاتر تھی۔ ان کے اس یقین کو شدید دھچکا لگ چکا تھا کہ باطل قوتوں کے ہاتھوں ان کی تہذیب پامال نہ ہو سکے گی۔ وقت کے جبر نے انھیں فرنگی تہذیب کے سامنے بے بس کر دیا تھا۔ یہ کہا جانے لگا کہ پرانی تہذیب فرسودہ ہو چکی ہے اور تہذیب نو ترقی اور سرفرازی کا واحد ذریعہ ہے۔ اس صورتِ حال نے نئی تہذیب کی ترقی اور اس کی تقلید کی راہ ہموار کی۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا چراغ رفتہ رفتہ گل ہونے لگا۔ مایوسی کے اس عمومی ماحول میں ہندوستانیوں میں اپنی تہذیب کے تحفظ کا احساس بیدار ہوا۔ انگریزی سامراج کے خلاف عوام میں بیداری لانے اور جدو جہدِ آزادی کی تحریک کو تیز تر کرنے کی غرض سے اودھ پنچ معرضِ وجود میں آیا۔ اودھ پنچ نے ظریفانہ رنگ اپنایا، طنز و مزاح کو ایک مقدس ہدف کے حصول کا وسیلہ بنایا اور ایک مشن کے تحت نثر اور نظم میں طنز و مزاح کو تخلیقی صورت میں پیش کرنے کی ابتداء ہوئی۔ اس میں سب سے اہم لکھنے والے رتن ناتھ سرشار تھے۔ ان کے یہاں طنز کم اور مزاح زیادہ ہے جو بلند بانگ قہقہوں کا محرک ہے۔ ناظران کی طلسمِ ہوشربا میں بے اختیار ہنسنے

لگتا ہے۔ بے شک اس گونج میں گہرائی موجود ہے تاہم بلند بانگ اورنوکیلی کیفیت کا احساس فی الفور ہو جاتا ہے۔ یہی سرشار کا طریقہ امتیاز ہے سرشار کا اسلوب بیان زبردست ہے۔ انھیں زبان پر بڑا عبور ہے اور وہ زبان و بیان سے ظرافت پیدا کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔ اس لیے ان کی تحریریں قدم قدم پر حاضر جوابی، ضلع جگت، پھبتی، اشعار کا بے تکلف استعمال، لطافت، فارسی اور اردو کا مضحکہ خیز امتزاج تلفظ اور الفاظ کا الٹ پھیر جیسے حربوں سے مزاح کا میاب نمونے پیش کرتی ہیں۔ ان کی بیشتر تحریریں 'اودھ' اخبار میں چھپیں جس کے وہ ایڈیٹر بھی تھے۔

اودھ پنچ کے ایڈیٹر سجاد حسین تھے۔ اس کے نثر نگار معاونین میں تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، بابو جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق، منشی احمد علی کسمنڈوی اور نواب سید محمد آزاد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اودھ پنچ کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس نے اردو نثر میں طنز و مزاح کو رائج کرنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔ اودھ پنچ اپنے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف ردِ عمل کے طور پر نمودار ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے انسانی زندگی سے سکون چھین لیا تھا۔ سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول میں سنجیدگی اور انہماک کا دور دورہ تھا۔ انتہا پسندی اپنے عروج پر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہر شخص اس طوفانی بہاؤ کے ساتھ تنکے کی طرح بہہ جائے گا۔ ایسے دور میں اودھ پنچ نے معاشرے کے انسان کو روک کر اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھما دیا۔ یہ اہم کام سجاد حسین نے اودھ پنچ کے ذریعے کیا۔ وہ بلا کے لکھنے والے تھے۔ وہ حاجی بغلول، طرحدار لونڈی اور احمق الدین کے مصنف کی حیثیت سے آج مقبول عام کی سندر رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی رؤسا کے نام انتہائی دلچسپ اور طنزیہ انداز میں خطوط لکھے۔ مزید برآں 'لوکل' اور موافقت زما' کے زیر عنوان جو مضامین اودھ پنچ میں شائع ہوئے وہ ملک کے سیاسی اور سماجی حالات پر بڑی دلیری سے طنز کرتے ہیں سجاد حسین تقریباً چھتیس برس تک اس پرچے کے ذریعے ملک وقوم کی خدمت کرتے رہے۔ اس دوران اودھ پنچ کے بیشتر لکھنے والوں نے لوگوں کا مزاق بنایا اور طنز بھی کیا۔ مچھو بیگ نے 'ستم ظریف' کے فرضی نام سے کئی برس تک اودھ پنچ میں مضامین لکھے۔ یہ مضامین اپنی بول چال کی زبان، محاورہ کی صفائی اور مزاح کی دھیمی دھیمی آنچ سے بہت مشہور ہیں۔ نواب محمد آزاد کو اپنے دور کا سب سے بڑا طنز نگار کہا جا سکتا ہے۔ انھون تیز اور درشت لہجہ بھی اختیار کیا ہے تاہم ان کے یہاں تلخی اور کینہ پروری کے عناصر بہت کم ہیں۔ انھوں نے مغربی تہذیب اور اپنی تہذیب دونوں کو طنز نشانہ بنایا ہے۔

اودھ پنچ کے قلم کار شعرا میں اکبرالہ آبادی، حاجی لق لق اور ظریف لکھنوی کے نام اہم ہیں۔ اکبر پرانی قدروں کے علم بردار تھے۔ مشرقی اور مغربی تہذیب کے تصادم میں اسلامی تہذیب کا شیرازہ بکھر جانے کا اندیشہ تھا، اکبر کے طنز و مزاح نے مشرقی اقدار کے تحفظ کا سامان کیا۔ یہ کام انھوں نے برطانوی سنگینیوں کے زیر سایہ انجام دیا۔ اکبر مغرب کی تقلید اس طرح نہیں چاہتے کہ 'بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے'، بلکہ ان کا نقطۂ نظر واضح طور پر یہ تھا:

عزم کر تقلیدِ مغرب کا ہنر کے زور سے
لطف کیا ہے لد لیے موٹر پہ زر کے زور سے

مغرب پرستی کے سیاق میں اکبر کا رویہ جارحانہ ہے۔ اسی تناظر میں وہ سرسید کی جدید تعلیم اور تعلیم نسواں سے اپنی بے زاری کا اظہار کرتے ہیں:

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنھیں پڑھ پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

حاجی لق لق کا سیاسی شعور بالیدہ تھا۔ اسی لیے ان کے یہاں سیاست کے عصری منظرنامے پر طنز و تعریض اور غزلوں میں سیاسی مضامین

کا بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ظریف لکھنوی شوخی اور تمسخر سے کام لیتے ہیں۔انھیں ادنیٰ اور معمولی مضامین کی فنکارانہ پیش کش میں مہارت حاصل ہے۔ان کی زندگی نوابانہ ماحول میں گزری، انھیں سیاست سے دلچسپی نہ تھی تاہم اپنی شاعری میں وہ سماجی کوتاہیوں اور نارسائیوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے اور شعروسخن وری کو تفریحِ محض بننے نہیں دیا۔

تربھون ناتھ ہجر نے نثر وشعر دونوں میں سماجی بے اعتدالیوں کو اپنی طنز وظرافت کا نشانہ بنایا۔زہرنا کی کے برعکس ان کے طنز میں لطافت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ان کی نگارشات میں قاری کے لیے قہقہے کا سامان ہوتا ہے تاہم وہ خود قہقہے میں شامل نہیں ہوتے۔انھوں نے اودھ پنچ کے لیے انگریزی مزاحیہ ادب کا اردو میں ترجمہ بھی کیا اور اخبار کے مشن کو آگے بڑھایا۔وہ فارسی، ناگریزی، پنجابی اور بنگالی زبان دسترس رکھتے تھے۔ترجمے میں انھوں نے اپنی زبان دانی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

اودھ پنچ کا زمانہ انیسویں صدی پر محیط ہے۔اس صدی کے اختتام تک اودھ پنچ کی بساط تقریباً سمٹ چکی تھی۔اس کے بعد طنز وظرافت کا عبوری دور شروع ہوا، جو بیسویں صدی کے تقریباً پچیس بروسوں تک جاری رہا۔مواد کے مقابلے اسلوبِ بیان میں تبدیلی اور طنزیہ لہجے میں اودھ پنچ جیسی سابقہ زہرنا کی پر ضبط وامتناع اور اخلاقی قیود اس دور کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ یہاں طنز ومزاح کا ادبی رنگ البتہ نمایاں نظر آتا ہے۔اس دور کے اہم قلم کاروں میں خواجہ حسن نظامی، مہدی افادی، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم، سجاد علی انصاری، پریم چند، محفوظ علی بدایونی، قاضی عبدالغفار اور ملا رموزی کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔مہدی افادی اور محفوظ علی بدایونی گرچہ براہِ راست ظرافت تخلیق نہیں کر رہے تھے تاہم ان کے انشا میں ظرافت کی زیریں لہریں صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔افاداتِ مہدی کے مطالعے سے ان کے ستھرے ذوقِ مزاح کا علم ہوتا ہے۔تاہم مضامین کے مقابلے میں مہدی افادی کے خطوط زیادہ دلکش، بے تکلف اور لطافت سے مملو ہیں۔محفوظ علی بدایونی کی تحریروں میں اسلوب کی رنگینی اور بے ساختگی نے مزاحیہ عناصر کا کام کیا ہے۔خواجہ حسن نظامی نے لفظی صنعت گری سے مزاح پیدا کیا۔اور اپنی تحریروں میں گدگدیاں پیدا کرتے ہیں۔ سلطان حیدر جوش خوالناظر میں شائع ان کے مضامین کے سبب شہرت ملی۔ وہ طنز، مزاح اور رمز و ایمائیت کا ہنر رکھتے ہیں اور انھی عناصر سے اپنی تحریروں میں شگفتگی پیدا کرتے ہیں۔انھوں نے مغربی ظرافت نگاروں کے لہجے کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔سجاد حیدر یلدرم کا نام اگرچہ رومانوی قلم کاروں میں آتا ہے تاہم ان کی انشاپردازی میں طنز ومزاح کے عناصر ملتے ہیں۔ زبان وبیان پر عبور اور ترکی ادب سے واقفیت کے سبب ان کی تحریر میں بڑی شگفتگی پائی جاتی ہے۔'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' اور 'حکایاتِ لیلیٰ مجنوں' میں وہ اپنے گردوپیش کے ماحول اور اس کی ناہمواریوں کی بہترین عکاسی پر قادر نظر آتے ہیں۔

اردو کے نثری ادب میں دوفن کار ایسے ہیں جو اپنے زمانے سے آگے نظر آتے ہیں۔منشی پریم چند کے یہاں ایسا سماج شعور ہے جو ان کے معاصرین کی تحریروں میں موجود نہیں۔ جزئیات نگاری، ماحول کا پرخلوص تجزیہ اور کرداروں کے دھڑکتے ہوئے دلوں سے ہم آہنگی ان کی تحریروں میں طنز کی تلخی پیدا کر دیتی ہیں۔البتہ یہ چیزیں ان کے طرز میں ظرافت کے عناصر کو دبا دیتی ہے۔ان کا طنز سماجی مسائل کے بجائے سیاسی مسائل پر مبنی ہے۔انھوں نے طنز ومزاح سے اپنی تحریروں میں صرف دلچسپی پیدا کرنے کا ہی نہیں بلکہ اسے تنگ نظری، توجہات، کمینگی اور بوسیدہ روایات پر چوٹ کرنے کا حربہ بھی بنایا ہے۔ جہاں تک سجاد علی انصاری کی تحریروں کا تعلق ہے ان کے یہاں بظاہر سنجیدگی کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔لیکن اس کے باوجود ان کی نگارشات تلخ اندیشی کے بہت قریب ہوجاتی ہیں۔انھیں پہلا تلخ اندیش بھی کہا جاتا ہے۔ان کے افکار میں تازگی اور گہرائی کے ساتھ ساتھ ایک ایسا تیکھا پن بھی ہے جو ہمیں چونکا دیتا ہے وہ چونکاتے زیادہ ہیں مائل بہ تبسم کم کرتے ہیں۔

اس عبوری دور کے آخری دو لکھنے والوں میں قاضی عبدالغفار اور ملا رموزی آتے ہیں۔قاضی عبدالغفار پر حقائق کی بڑی گہری نظر ہے۔

سیاسی زندگی کے تجربات، وطن پرستی کے جذبات اور فلسفے سے فطری لگاؤ نے ان کی نگارشات میں طنزیہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ملا رموزی کی تحریروں میں ظرافت زیادہ تر سیاسی مسائل سے متعلق ہے اور چوں کہ سیاسی مسائل ہنگامی اور وقتی نوعیت کے ہوتے ہیں لہٰذا وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ اس میں طنز کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے۔ ان کے طنز کے بارے میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس کا روئے سخن اپنی ذات کی طرف ہی ہوتا ہے۔ 'میں' کے پردے میں دوسروں کی ناہمواریوں کو اجاگر کیا ہے۔ ملا رموزی کی سب سے بڑی خوبی ان کا اندازِ بیان ہے وہ دراصل اپنی' گلابی اردو' کے لیے مشہور ہیں۔

جدید اردو نثر میں خالص مزاح کا رنگ اپنی مخصوص شگفتگی اور رعنائی کے اعتبار سے واضح ہے۔ اس کا آغاز غیر رسمی انداز سے ہوا۔ پھر اس نے عملی مزاح کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بعد لفظی شعبدہ بازیوں اور تحریر و تقریر کی بازیوں کے روپ میں ظاہر ہوا اور اپنے ارتقائی منازل میں واقعہ اور کردار سے پیدا ہونے والی ناہمواریوں تک جا پہنچا۔ جن ادیبوں نے عملی مذاق سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ان میں نمایاں نام عظیم بیگ چغتائی کا ہے۔ شوکت تھانوی اور شفیق الرحمٰن بھی اس کا سہارا لیتے ہوئے نظر آتے ہیں عظیم بیگ چغتائی کی دنیا میں محبت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جو عملی مذاق کے طور پر گردش کرتی ہے۔ 'کولتار' اور 'شریر بیوی' وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے مذاق کو واقعہ، کردار اور لفظی بازیگری سے بھی تحریک ملتی ہے۔ اس دور میں الفاظ اور لطائف وغیرہ سے جن ادیبوں نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں شفیق الرحمٰن اور شوکت تھانوی کے نام پیش پیش ہیں۔ شفیق الرحمٰن تو محض لطائف ہی سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ عام انشا پردازی میں بھی ذو معنی الفاظ اور رعایت لفظی سے ان کے مزاح کی تخلیق ہوئی ہے۔ ایسے مزاح کو سطحی مزاح کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بعض موقعوں پر کرداروں سے بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جیسے 'بڈی اور شیطان' وغیرہ لیکن وہ کرداروں کی ناہمواریوں دکھانے کے بجائے محض اس کی شرارتوں پر اکتفا کر بیٹھتے ہیں۔ اس سلسلے میں شوکت تھانوی نسبتاً زیادہ کامیاب ہیں۔ الفاظ یا محاورے کے ذریعے مزاح پیدا کرنے میں ان کے یہاں بے ساختگی اور روانی ہے۔ شوکت تھانوی کی مزاحیہ تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو 'سودیشی ریل، تعزیت اور لکھنؤ کانگریس سیشن، بہت اہم ہیں۔ یہاں ان کے مزاح کے معیار میں خاصی بلندی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ملی مذاق اور واقعہ و کردار سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ قاضی صاحب، میں مخصوص ناہمواریاں ہیں اور اس میں کردار کی تعمیر کو لے کر ہمدردانہ طریق بھی اختیار کیا ہے لیکن قاضی صاحب کو لگتا ہے کہ 'چچا چھکن' کا چربہ ہے۔

پطرس بخاری کی مزاح نگاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سراسر مغربی اثرات کا نتیجہ ہے۔ مواد اور تکنیک کے اعتبار سے وہ مغربی مزاح نگاروں سے کافی متاثر نظر آتے ہیں لیکن ان کے موضوعات میں ہر جگہ مقامی رنگ جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اردو مزاح نگاری میں نیا اسلوب اختیار کیا جو نئے اسکول کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو میں ابھی تک ہزل، پھکڑ اور عامیانہ پن کے عناصر موجود تھے۔ ان میں مغربی ادب کے خالص مزاح کے حربوں کو پطرس بخاری نے متعارف کرایا۔ ان کی مزاح نگاری میں موازنہ، مبالغہ، کردار، واقعہ، اسلوب اور ایک مخصوص زاویہ نگاہ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ اگر بغور ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو واقعہ سے مزاح پیدا کرنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ کتے ان کی مشہور تخلیق ہے۔ ان کے یہاں مزاحیہ کردار نہیں ہے اس لیے وہ اپنے ہمزاد سے کئی موقعوں پر مزاحیہ کردار کا کام لیتے ہیں۔

اردو میں ایسے مزاح نگار بھی ہیں جو اپنے اسٹائل یا اسلوب کی وجہ سے مقبول ہوئے۔ ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ، عبدالعزیز فلک پیما اور نیاز فتح پوری کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ کا اسلوب اپنی خوش مذاقی کے باعث بڑا مقبول ہے۔ اس اسلوب کی امتیازی

خصوصیت یہ ہے کہ یہاں واقعہ یا موازنہ وغیرہ سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ الفاظ اور جملوں کو ایسی شگفتہ کیفیت میں سمو کر پیش کیا جاتا ہے کہ دل و دماغ ایک نفسی انبساط میں ڈوب جاتے ہیں۔فرحت اللہ بیگ کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کسی پر اسرار طریق سے اس انشا پرداز کی فطری بشاشت الفاظ اور جملوں میں منتقل ہو کر سامنے آتی ہے۔ پھول والوں کی سیر، دہلی کا یادگار مشاعرہ اور نذیر احمد کی کہانی۔۔۔خوش مذاقی کے اسلوب کے بہترین نمونے ہیں۔عبدالعزیز پیا نے بھی اسلوب کی شگفتگی کے سبب بڑی شہرت پائی وہ اپنی نگارشات میں دقیق فلسفیانہ مسائل بیان کرتے ہیں لیکن ان پر ظرافت کی ملمع کاری ہوتی ہے کہ ادق مسائل کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

جدید دور میں طنز و مزاح کے میدان میں رشید احمد صدیقی، کنھیا لال کپور، کرشن چندر نے بڑا نام پیدا کیا۔طنز ان کی تحریروں کا بنیادی وصف ہے۔ رشید احمد صدیقی لفظی بازیگری اور فلسفیانہ اطوار سے کام لیتے ہیں۔ان کا طنز استعاروں، کنایوں اور اشاروں کے پردے میں سامنے آتا ہے۔ وہ خیال، کردار اور اپنے مخصوص اسلوب سے طنز کی سبیل پیدا کرتے ہیں۔ان کے فن میں عامیانہ پن نہیں بلکہ تفکر و گیرائی پائی جاتی ہے۔ان کے طنز میں زہرنا کی اور تلخی کی بہ جائے شگفتگی ہوتی ہے۔آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ'اکبر کے بعد اردو میں طنزیاتی روح سب سے زیادہ رشیدہ صدیقی کے یہاں ہے۔ان کی سوجھ بوجھ بہت اچھی ہے اور ان کا تخیل خلاق ہے۔ وہ معمولی باتوں میں مضحک پہلو بہت جلد دیکھ لیتے ہیں۔ وہ قولِ محال کے ماہر ہیں اور الفاظ کے الٹ پھیر سے خوب کام لیتے ہیں۔ان میں ایک سولیٹ کی تیزی، برناڈ شاہ کی بت شکنی، جسٹرٹن کی طباعی تینوں کے نمونے ملتے ہیں''۔ رشید احمد صدیقی کے طنز کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے طنز کا نشانہ خود اپنی ذات اور ناظر کو بتاتے ہیں۔ موضوعات کی سطح پر ان کے یہاں بڑا تنوع ہے۔سامراج، پارلیمان، آئی سی ایس عہدیدار، چارپائی، گواہ، وکیل، ریل کا سفر اور دیہاتی ڈاکٹر سبھی نوعیت کے موضوعات اور مضامین پر ان کی تحریریں ملتی ہیں۔

کنھیا لال کپور بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں۔ان کی تحریروں میں سماجی ناہمواریوں پر شدید طنز ملتا ہے۔ انھوں نے بیشتر ادبی موضوعات کو اپنی طنز کے لیے منتخب کیا۔غالب جدید شعرا کی مجلس میں، چینی شاعری اور اہلِ زبان، جیسی نگارشات میں ان کے طنز کے کمالات موجود ہیں۔

کرشن چندر بنیادی طور ایک مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی تحریروں میں ظریفانہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ رومان پسند قلم کار تھے، اس لیے ان کے یہاں طنز کی کاٹ گہری نہیں بلکہ خفیف ہے۔ وہ چٹکیاں لیتے ہیں۔ سماجی امور و مسائل پر ان کی نظر گہری ہے۔ان کے طنز کا دائرہ کافی وسیع ہے اور عالم گیر نارسائیوں تک پھیلا ہوا ہے۔'ہوائی قلعے' ان کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔علاوہ ازیں 'غسلیات، سوراج سے پچاس سال بعد، مانگے کی کتابیں، وغیرہ کرشن چندر کی بہترین فکاہی تحریریں ہیں۔

جدید عہد میں طنز و مزاح کے حوالے سے مشتاق احمد یوسفی، بہت اہم ہے۔مشتاق احمد یوسفی نے اردو ادب میں مزاح نگاری کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ان کی تحریریں زمان و مکان کی قید سے ماورا خیال کی جاتی ہیں۔ان کے یہاں لفظی بازیگری بھی ہے اور فکر و فلسفہ بھی۔ان کے طنز کی وسعت میں عالم گیری اقدار کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ان کا اسلوب شگفتہ ہے۔ وہ بڑی خوبی سے فرد، سماج، ملک اور عالم کی ناہمواریوں کو اپنے شگفتہ اسلوب میں پیش کرتے ہیں کہ ناگواری کا احساس تک نہیں ہوتا اور ہم کمیوں اور کوتاہیوں سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔مشتاق یوسفی کردار نگاری سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ان کے وضع کردہ کردار ایسے ہنسے بولتے نظر آتے ہیں گویا وہ ہمارے درمیان ہو اور ہم انھیں دیکھ رہے ہوں۔موجودہ دور میں فکاہی ادب میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔انھوں نے چراغ تلے ۱۹۶۱ء، خاکم بدہن، زرگزشت، آب گم اور شامِ شعرِ یاراں، کی صورت میں ادبی دنیا کو نایاب تحفہ دیا ہے۔ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے صدر پاکستان نے ۱۹۹۹ء میں ستارہ امتیاز اور ۲۰۰۲ء میں 'ہلال

امتیاز' سے نوازا۔اردو میں یوسفی نے اپنی نگارشات کے ذریعے اپنے لیے ایک مستقل جگہ مختص کر لی۔

معاصر عہد میں طنزیہ ومزاحیہ ادب میں احمد جمال پاشا، تخلص بھوپالی، ہوش ترمزی، یوسف ناظم، کرنل محمد خاں اور مجتبیٰ حسین کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔احمد جمال پاشا کے یہاں طنز ومزاح کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔وہ سماجی اور ادبی ناہمواریوں کو بڑی کامیابی سے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ان کے یہاں طنزیہ رجحان توانا ہے۔'ادب میں مارشل لا' اس کا عمدہ نمونہ ہے۔تخلص بھوپالی کا حسِ مزاح بھی بڑا الطیف ہے۔ ان کے خاکے مرقع نگاری کی خوبیوں سے مزین ہیں۔ناہمواریوں پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ہوش ترمزی نے پطرس کی فکاہی روایت کو آگے بڑھایا۔یوسف ناظم، کرنل محمد خاں اور مجتبیٰ حسین بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں۔ان کے یہاں طنز پر مزاح کو فوقیت حاصل ہے۔ان کی تحریریں شگفتہ ہوتی ہیں اور پر مغز بھی، جو مزاج کو فرحت ومسرت پہنچاتی ہیں۔وہ الفاظ کے الٹ پھیر اور کرداروں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ان کی نگارشات طنز ومزاح کی عمدہ مثال ہیں۔

13.6 آپ نے کیا سیکھا

آپ نے سیکھا کہ طنز کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں۔

آپ نے سیکھا کہ مزاح کے لغوی اور اصطاحی معنی کیا ہے۔

آپ نے یہ بھی سیکھا کہ طنز اور مزاح میں کیا فرق ہے۔اور دونوں کی کیا اہمیت ہے۔

آپ نے اردو میں طنز ومزاح کی روایت کا جائزہ لیا۔

آپ نے اردو کے اہم طنز ومزاح نگاروں کے فن کا مطالعہ کیا ہے۔

آپ نے اردو کے طنزیہ تخلیقات کا بھی مطالعہ کیا اور اس فن کی خصوصیات سے واقف ہوئے۔

آپ اردو طنز ومزاح کے اسالیب سے واقف ہوئے۔

13.7 اپنا امتحان خود لیجئے

1۔ طنز کے لغوی اور اصطلاحی معنی کا بیان کیجئے؟

2۔ مزاح کے لغوی معنی اور اصطلاحی معنی کا بیان کیجئے۔

3۔ اردو شاعری میں طنز ومزاح کے ابتدائی نقوش کی نشاندہی کیجیے۔

4۔ اردو نثر میں طنز ومزاح نگاری کے ابتدائی نقوش کی وضاحت کیجیے۔

5۔ غالب کے خطوط میں طنز ومزاح نگاری کی نشاندہی کیجئے۔

13.8 سوالات کے جوابات

جواب نمبر1: طنز عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی طعنہ، مہنا، آوازہ، تمسخر، رمز کے ساتھ بات کرنا، چھیڑ، ہنسی، بولی ٹھولی، وغیرہ ہیں۔ طنز کسی انسان پر یا اس کے خلاف جذبہ احتجاج کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ طنز نگار طنز کے ذریعہ اُس انسان یا معاشرے کو بہتر بنانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔طنز کی تلخی اور اس کے تیر ونشتر قاری کو محظوظ اور متاثر کرنے کے بجائے اکثر بے مزہ کردیتے ہیں۔اس لیے طنز نگار طنز کی تلخی اور اس کے تیر و نشتر کو کم کرنے کے لیے مزاح کا استعمال کرتا ہے۔

طنز کے لیے انگریزی میں Satire کے لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ حالاں کہ اردو میں ہجو، پھبتی، مذمّت، تعریض وغیرہ جیسے دوسرے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن Satire کا صحیح ترین متبادل طنز ہی ہے۔ اور یہ بڑی حد تک طنز کے مفہوم کو بھی ادا کرتا ہے۔

انسان اشرف المخلوقات ہے مگر یہ کہنا کہ اس میں کوئی برائی موجود نہیں بے جا ہوگا۔ برائیاں اس کو ڈھونڈ لیتی ہیں اور انسان ان برائیوں سے تا حیات لڑتا رہتا ہے۔ طنز نگار سماج و انسان میں پھیلی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے طرح طرح کے Tools اور حربوں کا استعمال کرتا ہے ان کو اپنے وجود سے نکالنے کے لیے ناکام اور کامیاب کاشش کرتا رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ طنز سے وہ حماقت کی زد میں آتا ہے لیکن اس کا شعور جاگ اٹھتا ہے۔ طنز نگار تمام دنیا کے لوگوں کی برائیوں کو تو ختم نہیں کرسکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس سے تمام انسانوں کا شعور ضرور جاگ اٹھتا ہے۔

طنز کی وضاحت کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ستائر (Satire) کا مفہوم انگریزی میں ہے اس کی پوری اور صحیح ترجمانی (ہمارے یہاں کسی ایک لفظ میں) تقریباً ممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اس موقع پر چند الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً ہجو، ہجا، ملیح، تعریض تنقیص، لعن وطعن، طعن وطنز، استہزاء، مذمت، مضحکات، شطحیات، ہجو و ہزل وغیرہ، ان الفاظ کے دینے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک ''ستائر'' (سطائر) کے مترادف ہے، اکثر ان الفاظ کی ترتیب اختیار کی جاتی ہے۔''

(طنزیات ومضحکات، رشید احمد صدیقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء ص:۱۹)

مذکورہ اقتباس میں رشید احمد صدیقی نے طنز کے کئی مترادف الفاظ بیان کئے ہیں۔ لیکن طنز کا لفظ اب اردو میں عام طور سے Satire کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ طنز میں نشتر کے ساتھ اصلاح کا پہلو بھی مضمر ہے معاشرے کی ناہمواریوں کی نشاندہی کے لیے طنز کا استعمال ہوتا ہے۔

جواب نمبر ۲: مزاح عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہنسی، خوش طبعی، ظرافت، مذاق، ٹھٹا، مذاق چہل وغیرہ ہیں۔ مزاح کا اصل سرچشمہ انسانی سرشت میں شامل خوشی کا جذبہ ہے جو ہنسی یا مسکراہٹ کی کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے انسان کے انسان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہی نہیں بلکہ حیوانِ ظریف بھی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں اختصاص بھی حاصل ہے، اور دیگر حیوانات سے وہ عقل کی بنیاد پر ممتاز ہے حسِ مزاح ایک ایسا مزاح ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے علاوہ کسی اور حیوان کو عطا نہیں کیا۔

انگریزی ادب میں ایک لفظ ہومر (Humour) رائج ہے جسے اردو میں مزاح کہا جاتا ہے۔ لفظ ہومر (Humour) ایک لاطینی لفظ ہے اس کے لغوی معنی رطوبت کے ہیں۔ زمانۂ قدیم سے بھی علم وادب کے مشہور مصنفین ومفکّرین اور اہل قلم نے مزاح کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بقول ارسطو:

> ''ہنسی کسی کسی یا بدصورتی کو دیکھ کر معرض وجود میں آتی ہے جو دردانگیز نہ ہو''

(اردو ادب میں طنز ومزاح۔ وزیر آغا۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۹ء، ص:۳۲)

مذکورہ سطر میں ارسطو نے مزاح کے مزاح کے متعلق یہ بتایا ہے کہ مزاح احساس کمتری پر مبنی ہے۔اور جب ہم سماج کے نظام کو منتشر شکل میں پاتے ہیں تو ان کے اندر کسی نقص کے مبہم پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں،اس طرح طنز پیدا ہوتا ہے جو مزاح کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ احساسِ کمتری سے پیدا ہونے والا طنز ''مرید پور کا پیر'' میں اچھی طرح نظر آتا ہے

مزاح کی تعریف کے سلسلے میں ''وزیر آغا'' ''اسٹیفن لی کاک (Stephen leacock) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔''

(اردو ادب میں طنز و مزاح۔وزیر آغا۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،۱۹۹۹ء،ص:۴۷)

جواب نمبر۳: اردو شاعری میں مذہبی تنگ نظری و سخت گیری، پر ہمارے سماج میں احتجاج کی روایت روزِ اول سے موجود رہی ہے۔ احتجاج کا یہ رویہ واعظ، ناصح اور ان کے بعض متعلقات کا مذاق اڑانے اور ان پر طنز کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ فارسی ادب کی سے اردو کو وراثت میں ملا ہے چنانچہ اردو شعرا کے یہاں واعظ و ناصح اور اسی قبیل کے دوسرے افراد کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔البتہ طنز و مزاح کے رنگ کو بطور خاص اپنانے اور اس کی جانب خصوصاً متوجہ ہونے کا رواج سترہویں صدی میں جعفر زٹلی کے ہاتھوں ہوا۔ وہ اورنگ زیب کے عہد کا شاعر ہے۔اس نے اورنگ زیب کے عہد حکومت کو قریب سے دیکھا تھا اور اس کا مداح تھا۔لہٰذا اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب ان کے بیٹوں کی آپسی لڑائی، نادر شاہ کے حملوں اور مراٹھوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب مغلیہ سلطنت کا زوال ہوا تو اس نے طنزیہ پیرائے میں اپنی برہمی کا اظہار کیا۔

اردو کے اولین شعرا میں طنز و مزاح کے حوالے سے امیر خسرو کا نام آتا ہے لیکن اس دعوے کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں، حتیٰ کہ وہ گیت، دوہے، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں جو امیر خسرو کے نام سے منسوب ہیں، انھیں بھی بالیقین خسرو کی تخلیقات کہنے میں تامل ہوتا ہے اور منظوم یا منثور ظرافت کی جو مثالیں ملتی ہیں وہ اتنی دھندلی ہیں کہ انھیں کسی طور سند تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

دکنی شعرا کے یہاں عام طور سے معاصرانہ چشمک، آپسی نوک جھونک اور فقرے بازی کی صورت میں ملتے ہیں۔اس سلسلے میں ملا وجہی، غواصی، سیوک اور لطیف کی چشمک مشہور ہے۔ بادشاہ قلی قطب شاہ کا درباری شاعر ملا وجہی کا ذکر ملتا ہے، جو غواصی کو زیر کرنے کی نت نئی ترکیبیں کرتا تھا۔اپنے معاصرین سے ولی دکنی کی بھی تناتنی رہتی تھی۔محتسب، واعظ اور ملائیت پر ان کے طنزیہ وار نے دکن میں طنز کی راہ ہموار کی۔ولی کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

شیخ مت گھر سے نکل آج کہ خوباں کے حضور
گول دستار تیری باعث رسوائی ہے

سودا کے یہاں بھی ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔قصائد اور ہجویات میں سودا کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔سودا نے اپنی ہجو نگاری میں اولاً اپنے کسی حریف یا بدخواہ جیسے فدوی، ضاحک اور فوقی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے یا ذاتی سطح پر اپنے انتقامی جذبے سے کام لیا ہے۔ دوسرے اپنے حریف کو نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ اس نے زمانے کی نارسائیوں اور ابتری پر وار کیا ہے۔

ہجویاتِ سودا کے علاوہ میر کی ہجویات بھی قابلِ توجہ ہیں جن میں ذاتیات سے گریز کرتے ہوئے میر نے قلبی انتشار اور بے قراری کی طرح 'گھر' کی ابتری اور بے ترتیبی کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال　　　اس خرابے میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے　　سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق　　سو شکستہ تر از دلِ عاشق

طنزیہ ومزاحیہ عناصر ہمیں کسی نہ کسی صورت میں میر تقی میر، جرأت، مصحفی، ناسخ، انشا، مومن، شیفتہ اور ذوق کے یہاں بھی ملتے ہیں۔

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں
جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا
(میر)

سامنے میرے جو منھ کرکے تم نہیں بیٹھتے
کیا کسی کے سامنے ہے یہ قسم کھائی ہوئی
(جرأت)

اسی طرح دیگر شعرا کے یہاں بھی طنز ومزاح کے نمونے پائے جاتے ہیں طوالت کے سبب مثالوں سے پرہیز کیا جاتا ہے۔سماجی کمیوں، کوتاہیوں اور نارسائیوں کے ضمن میں نظیر اکبرآبادی نے بھی اپنی نظموں میں طنز سے کام لیا ہے۔ان کا سماجی شعور بڑا پختہ اور گہرا تھا۔آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، اور روٹی نامہ جیسی اپنی نظموں میں انھوں نے سماجی طنز کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔

جواب نمبر۴: اردو نثر میں طنز وظرافت کا ابتدائی نمونہ شاہ حاتم (۱۶۹۹ء-۱۷۷۳ء) کے یہاں ایک طبی نسخہ ''نسخہ مفرح الضحک معتدل من طب الظرافت'' کی شکل میں ملتا ہے۔قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ نسخہ زٹلی سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہوگا۔نسخے کی عبارت مسجع ومقفیٰ ہے تاہم اس کی زبان زٹلی سے زیادہ آسان اور صاف ہے۔یہ فحش نہیں ہے اور فارسی کا اثر بھی کچھ کم ہے۔

اس دور میں داستانیں عوام کی تفریح طبع کا ذریعہ تھیں۔ظرافت کے ابتدائی نقوش ہمیں انھیں داستانوں سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔یہ نقوش اگرچہ کہیں ہلکے اور گہرے رنگ میں نظر آتے ہیں۔داستانوں کے بیشتر قصے اپنی مضحکہ خیز نوعیت کے اعتبار سے ہمارے استہزائیہ حس کو بیدار کرتے ہیں۔میرامن کی داستان باغ و بہار میں لطف بیان، اختصار اور سادگی اتنی زبردست ہے کہ ظرافت کے نقوش دب کر رہ گئے ہیں۔دوسری طرف رجب علی بیگ سرور کی داستان فسانہ عجائب ہے جس میں تصنع اور تکلف اور مقفیٰ و مسجع اندازِ بیان کے باوجود چست انداز نگارش کے ایسے نمونے ملتے ہیں جو کبھی کبھی ظرافت کی سرحدوں کو چھو لیتے ہیں۔رتن ناتھ سرشار کی فسانہ آزاد میں فقرہ بازی، چہل اور الھڑ پن کے مناظر پست و چست شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔سرور اور سرشار کی تحریریں مزاح نگاری کے سلسلے میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔داستان داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال میں ظرافت کا انداز تھوڑا مختلف ہے۔ان داستانوں میں عیاروں کی عیاری سے تفریح طبع کے سامان بہم پہنچائے گئے ہیں۔اس دور کی بعض داستانوں مثلاً حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی، حاتم طائی اور الف لیلیٰ کے تراجم میں مزاح کے نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن ان کا رنگ اتنا گہرا نہیں کہ انھیں مزاح نگاری کے ضمن میں لایا جائے۔انشاءاللہ خاں انشا کی رانی کیتکی کی کہانی میں ان کا مخصوص ظریفانہ انداز جھلکتا ہے۔لیکن یہاں بھی اجتہادی روش کے نقوش موجود ہیں البتہ مہجور کی کتاب ''نورتن'' اس زمانے کی ظرافت کا نچوڑ ضرور پیش کرتی ہے۔

جواب نمبر۵: اردو نثر میں طنز ومزاح کے اعلیٰ نمونے ہمیں خطوطِ غالب میں ملتے ہیں۔انھیں بنیادوں پر الطاف حسین نے حالی کو حیوانِ ظریف کہا ہے۔شوخیِ تحریر غالب کے خطوط کی اولین شناخت ہے اور اسی نے ان کے خطوط کو ناول اور ڈرامے کی طرح قابلِ توجہ بنا دیا ہے۔

اپنے خطوط میں غالب نے خود کو نشانہ بنایا ہے اور ساتھ ہی دوستوں پر بھی تیر و نشتر چلائے ہیں۔ بے تکلف احباب کے خطوط میں ظرافت کا رنگ زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ غالب کا طنز تلخی اور زہرناکی سے پاک ایک خالص طنز ہے جو دیرپا اثرات اپنے اندر رکھتا ہے۔ غالب کو خود اپنے اوپر ہنسنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ اپنے جسم کے رستے ہوئے زخموں کے بیان میں بھی شوخی سے باز نہیں آتے تھے۔ مرزا علاءالدین احمد خاں کے نام خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہ گاروں کو دنیا میں بھیج کر سزا دی جاتی ہے۔۔۔۔۔ ۱۳/ برس حوالات میں رہا۔ ۱۷/ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا۔ نظم اور نثر کو مشقت ٹھہرایا۔۔۔۔۔ جب یہ دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں، سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔''
>
> (خطوطِ غالب، جلد اول، مطبوعات مجلسِ یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء ص ۔۲۵۱)

غالب کے یہاں طنز میں ایک نوع کی تمثیلی شگفتگی ملتی ہے۔ اپنے اعزا اور احباب کے انتقال پر انھوں نے جس طرح تعزیت کی، اس سے بھی غالب کے اچھوتے اسلوب بیان اور ان کے داخلی ظریفانہ کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نثر میں شاعری ہی کی طرح غالب نے اپنی الگ راہ نکالی۔ غالباً اس کا انھیں احساس بھی تھا۔ مرزا حاتم علی مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

13.9 فرہنگ

الفاظ	معانی
معرض وجود	ظاہر ہونے کی جگہ
جبلت	سرشت، فطرت، اصلی طبیعت، خلقت
سنگ میل	میل کی پتھر
مضحک	مذاق، ہنسی
رمز	نوک جھونک، باریکی، بھید
رعایتِ لفظی	کسی لفظ کی رعایت سے
بذلہ سنجی	لطیفہ گوئی
تمسخر	مسخرہ پن
سقم	عیب، خرابی، نقص
ضلع جگت	پلو دار بات، جس میں لفظی کا رعایت پائی جائے
عبوری	عارضی، وقتی، ہنگامی

13.10 کتب برائے مطالعہ

1۔وزیر آغا،اردو ادب میں طنز و مزاح،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،2007

2۔رشید احمد صدیقی،طنزیات و مضحکات،مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،2011

3۔خواجہ عبدالغفور،طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ،ماڈرن پبلشنگ ہاؤس،دہلی 1983

4۔ڈاکٹر خالد محمود(مرتب)اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت،اردو اکادمی دہلی،2005

5۔احمد جمال پاشا،ظرافت اور تنقید،نشاط پریس ٹانڈہ،1982

6۔طارق سعید،اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،1996

7۔نامی انصاری،آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح،معیار پبلی کیشنز،دہلی،1997

اکائی:14 رشید احمد صدیقی بحیثیت طنز و مزاح نگار مضامین رشید کے خصوصی حوالے سے

14.1 اغراض ومقاصد
14.2 تمہید
14.3 رشید احمد صدیقی کی شخصیت
14.4 رشید احمد صدیقی کے ادبی کارنامے
14.5 رشید احمد صدیقی بحیثیت طنز و مزاح نگار
14.5.1 ''مضامین رشید'' کا تعارف
14.5.2 ''مضامین رشید'' کا تفصیلی مطالعہ
14.5.3 ''مضامین رشید'' کا اسلوب
14.6 آپ نے کیا سیکھا
14.7 اپنا امتحان خود لیجئے
14.8 سوالات کے جواب
14.9 فرہنگ
14.10 کتب برائے مطالعہ

14.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں رشید احمد صدیقی کی شخصیت کے بارے میں جانیں گے۔

اس اکائی میں ہم رشید احمد صدیقی کے ادبی کارناموں کے متعلق جانیں گے۔

اس اکائی میں ہم رشید احمد صدیقی کی طنز ومزاح نگاری پر گفتگو کریں گے۔

اس اکائی میں ہم ''مضامین رشید'' کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

اس اکائی میں ہم ''مضامین رشید'' کے اسلوب پر گفتگو کریں گے۔

14.2 تمہید

شعروادب میں خوش طبع یا مزاح ایک حسین اور دلآویز صفت ہے اور دنیا کی ہر زبان کا ادب اس صفت سے مالا مال ہے۔ کیونکہ اس فن

کا تعلق براہ راست انسانی معاشرے اور اس کے مسائل سے منسلک ہے۔ فرد اور معاشرے کی اصلاح اس کا خاص مقصد ہے۔ یہ گہرے شعور، زندگی کے وسیع مشاہدات، گہرے تجربات اور عرفان ذات کے عمیق مطالعے سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ابتدائی نمونوں سے لے کر عصر حاضر کے ترقی یافتہ مزاحیہ نمونوں تک میں سماجی مسائل اور انسانی اخلاقیات کا عکس اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ رشید احمد صدیقی اسی روایت کو اردو ادب میں مضبوطی سے قائم کرتے ہیں۔ وہ اردو ادب میں ایک روایت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کو مختلف حیثیتوں سے متاثر کیا ہے۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین، ان کی پر مغز تنقیدیں اور ان کی مرقع نگاری ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

14.3 رشید احمد صدیقی کی شخصیت

رشید احمد صدیقی کے جد امجد حضرت پیر زکریا صاحب سترہویں صدی میں ترکستان سے تبلیغ دین کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ وہاں سے آنے کے بعد انھوں نے پہلے پنجاب میں قیام کیا۔ اس کے بعد دہلی اور الہ آباد ہوتے ہوئے مڑریاہو میں رہنے لگے جو ضلع جونپور کا ایک قصبہ ہے۔ رشید احمد صدیقی کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: رشید احمد صدیقی ابن عبدالقدیر ابن رمضان علی ابن خدا بخش ابن روشن علی ابن پیر زکریا۔ رشید احمد صدیقی کے والد عبدالقدیر جونپور اور غازی پور علاقہ میں سب انسپکٹر پولیس رہے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور اپنی دینداری کے لئے مشہور تھے۔ ان کا خاندان متوسط درجے کا تھا۔ ان کا نکاح بھدوئی کے ایک شخص سید باسط علی کی صاحبزادی چھنکا بی بی سے ہوا تھا جو بہت نیک سیرت اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ عبدالقدیر کے پاس کچھ بیگھا زمین کاشتکاری کے لئے موجود تھی۔ ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد وہ روزی کے لئے کاشتکاری کیا کرتے تھے اور ساری زندگی محنت اور حلال کی کمائی پر گزاری۔ ان کی تین بیٹیاں اور چار بیٹے تھے۔ صاحبزادوں میں عبدالصمد صدیقی، رشید احمد صدیقی، نیاز احمد صدیقی اور نذیر احمد صدیقی تھے۔ صاحبزادیوں میں سائرہ، طاہرہ اور آمنہ تھیں۔ رشید احمد صدیقی ان کے دوسرے نمبر کے بیٹے تھے۔

رشید احمد صدیقی ۲۵ ر دسمبر ۱۸۹۴ء کو قصبہ بیریا ضلع بلیا میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں ان کا ننہال تھا۔ وہ بچپن میں بہت بیمار رہا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کی تعلیم پر کم توجہ دی گئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے استاد مولوی قدرت اللہ صاحب سے حاصل کی۔ انھوں نے دینیات، بغدادی قاعدہ اور عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی اسکولی زندگی کا آغاز باضابطہ طور پر جونپور سے ہوا جہاں ۱۹۰۸ء میں ان کا داخلہ چوتھی جماعت میں ہوا اور ۱۹۱۴ء میں انھوں نے انٹر پاس کیا۔ انھیں انگریزی زبان میں بہت دلچسپی تھی اور اس میں ہمیشہ اول آتے البتہ ریاضی میں ہمیشہ ہی ناکام ہو جاتے۔ انھیں ٹینس کھیلنا بہت پسند تھا۔ اس کے علاوہ فٹ بال اور کرکٹ بھی ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے وہ علی گڑھ میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ علی گڑھ میں داخلہ سے پہلے وہ جونپور کی عدالت دیوانی میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے لئے انھوں نے نوکری چھوڑ دی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۱۹ء میں بی۔ اے اور ۱۹۲۱ء میں ایم۔ اے۔ پاس کیا۔ انھیں علی گڑھ میں ایسے لوگوں کا ساتھ ملا جو نایاب تھے۔ ان میں سرفہرست ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا نام آتا ہے جو بعد میں ہندوستان کے صدر جمہوریہ بھی مقرر ہوئے۔ ذاکر حسین رشید احمد صدیقی سے دو سال سینئر تھے۔ ان کے علاوہ شفیق الرحمٰن قدوائی، شجاع الدین، اقبال احمد سہیل اور سید نور اللہ جیسے افراد رشید احمد صدیقی کے ساتھیوں میں رہے جن کی صحبت نے انھیں بہت کچھ سکھایا۔ انھوں نے علی گڑھ میں صرف تعلیم ہی حاصل نہیں کی بلکہ دیگر ادبی مصروفیات میں بھی حصہ لیا۔ وہ ڈیوٹی سوسائٹی کے سرگرم کارکن تھے اور اسی سلسلہ میں انھوں نے کلکتہ، چٹاگانگ اور رنگون کا دورہ بھی کیا۔ ۱۹-۱۹۱۸ء میں وہ 'انجمن اتحاد طلبہ' کے معتمد بھی مقرر ہوئے۔ ''علی گڑھ منتھلی'' کے نام سے مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کا علمی و ادبی جریدہ نکلتا تھا۔ وہ کئی برسوں تک اس کے مدیر رہے۔ بعد میں یہ جریدہ ''علی گڑھ میگزین'' کے نام سے شائع ہونے لگا اور بہت مشہور ہوا۔ انھوں

نےBehiman کے نام سے انگریزی زبان میں مضامین لکھے۔اس وقت وہاں کھیل کود کو بھی تعلیم کے برابر اہمیت حاصل تھی۔رشید احمد صدیقی کا پسندیدہ کھیل ٹینس تھا اور اس کھیل کے لئے وہ نٹ کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے درمیان میں چار پائی کا استعمال کرتے تھے۔

انھیں اپنی زندگی میں مالی مشکلات کا بہت سامنا کرنا پڑا۔لیکن انھوں نے صبر کے ساتھ سب برداشت کیا۔گرمی کے موسم میں وہ بنارس چلے جاتے اور وہاں سب جج کی عدالت میں کلرکی کرتے۔ یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا۔اس کام کی وجہ سے ان کی لکھنے کی اچھی مشق ہوگئی جو بعد میں ان کی تخلیقی زندگی میں کارآمد ثابت ہوئی۔

انھوں نے ایم۔اے۔کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہائی اسکول میں مدرسی کی اور انٹرمیڈیٹ کالج میں ۱۹۲۲ء سے اردو کے مولوی کی حیثیت سے درس وتدریس کا کام انجام دینے لگے۔اس کے بعد انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عارضی طور پر لکچرر بننے کا موقع ملا۔مستقل طور پر نوکری کے لئے اس وقت کسی تحقیقی کام کی ضرورت تھی۔اسی کے مدنظر انھوں نے اپنی کتاب ''طنزیات ومضحکات'' ترتیب دی۔ان کی ملازمت کے استقلال کے لئے علامہ اقبال نے بھی سفارش کی تھی۔۱۹۲۶ء میں بطور لکچرار ان کا مستقل تقرر عمل میں آیا۔۱۹۳۵ء میں وہ ریڈر بن گئے اور ۱۹۵۴ء میں پروفیسر کے عہدے پر ان کی ترقی ہوگئی۔۱۹۵۷ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ وہ اپنی ملازمت کی ابتدا سے سبکدوش ہونے تک وہ اپنے شعبے کے صدر رہے۔جب تک وہ شعبے میں وہاں کا ماحول بہت اچھا بنائے رکھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ محبت اور اپنائیت کا سلوک رکھا۔وہ اپنے طلبہ سے بھی بہت شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔اگر کوئی طالب علم ہونہار ہوتا تھا تو وہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ان کے شاگردوں میں بہت ساری اہم ادبی شخصیات کے نام موجود ہیں جن میں اسرارالحق مجاز، معین احسن جذبی، اختر الایمان، جاں نثار اختر اور خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے لوگ شامل ہیں۔سبکدوشی کے بعد وہ آزاد میموریل لائبریری (علی گڑھ) میں جنرل ایجوکیشن کے شعبے کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔

لکچرر ہونے کے بعد ۱۹۲۳ء میں ان کی شادی مڑیاہو سے ۱۴ میل کے فاصلے پر ضلع بنارس کے ایک قصبہ بھدوئی میں ہوئی۔ان کے سسر شمس الحق پولیس انسپکٹر تھے۔ان کی بیٹی جمیلہ خاتون رشید احمد صدیقی کی شریک حیات بنیں۔ان کی گھریلو زندگی بہت خوشگوار گزری۔ان کی اولادوں میں پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔سبھی کی تعلیم وتربیت کا انھوں نے خاص خیال رکھا۔آخری وقت میں وہ بہت علیل رہنے لگے تھے۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کے دماغ میں دوران خون بہت کم تھا۔اسی حالت میں جنوری ۱۹۷۷ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔انھیں مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

14.4 رشید احمد صدیقی کے ادبی کارنامے

رشید احمد صدیقی کے ادبی کارناموں میں ''مضامین رشید''، ''خنداں''، ''گنج ہائے گراں مایہ''، ''طنزیات ومضحکات''، ''اردو طنز ومزاح کی تنقیدی تاریخ''، ''خطوط رشید احمد صدیقی''، ''نقش ہائے رنگ رنگ''، ''ہم نفسان رفتہ''، ''اطفار''، ''آشفتہ بیانی میری'' اور ''علی گڑھ۔ماضی وحال''، ''علی گڑھ کی مسجد قرطبہ''، ''عزیزانندوہ کے نام''، ''غالب کی شخصیت اور شاعری''، ''ہمارے ذاکر صاحب''، ''اقبال شخصیت اور شاعری'' اور ''جدید غزل'' ان کی اہم تصانیف ہیں۔

14.5 رشید احمد صدیقی بحیثیت طنز ومزاح نگار

رشید احمد صدیقی کے طنز ومزاح پر مشتمل دو مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔''مضامین رشید'' اور ''خنداں''۔اس کے علاوہ بہت سے

مضامین و مقالات مختلف اخبارات ورسائل میں بھی شائع ہوئے ہیں جن کو یکجا نہیں کیا جا سکا ہے۔''مضامین رشید'' نقش اول ہونے کے باوجود فنی اعتبار سے نقش ثانی ''خنداں'' پر فوقیت رکھتا ہے۔''مضامین رشید'' سے، رشید احمد صدیقی کی شعور کی بالیدگی، وسیع النظری، تخلیقی صلاحیت، اور علمی عظمت کا پتہ بھی چلتا ہے۔''خنداں'' میں یہ طنز و مزاح کا ٹھہراؤ، جدت فکر اور شائستگی ورچاؤ کم نظر آتا ہے۔''خنداں'' میں زبان و بیان کا لطیف انداز اور متنوع موضوعات کا احساس تو ہوتا ہے لیکن اس میں وہ تازگی اور طنز و مزاح کی چاشنی نہیں ملتی جس سے''مضامین رشید'' عبارت ہیں۔

رشید احمد صدیقی نے زندگی کے ہر شعبے کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ ہر شئے کو معاشرتی ڈھانچے میں دیکھتے ہیں۔ انھوں نے اداروں اور جماعتوں پر نظر معاشرتی پس منظر میں ڈالی ہے۔ اس طرح ان کے یہاں تمدنی تنقید کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ مشرقی اقدار کو عزیز رکھنے کی وجہ سے انھوں نے مغربی تہذیب پر بھی طنز کے تیر برسائے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو پر وہ تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور پورے خلوص کے ساتھ معاشرتی زندگی کے جھول اور زندگی کے مختلف گوشوں میں پائی جانے والی ناہمواری کو دور کرنا چاہتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کی ایک مخصوص ذہنی سطح ہے جس سے وہ کبھی سمجھوتا نہیں کرتے۔ اس لیے ان کے یہاں عام لوگوں کی تسکین ذوق کا سامان کم ہی مل پاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا انداز زیادہ تر عالمانہ ہوتا ہے۔ چونکہ ان کے طنز و مزاح میں شعر و ادب کے ساتھ سیاست، تاریخ اور دیگر علوم و فنون کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس لئے ان سے وہی قاری محظوظ ہوسکتا ہے جو اعلیٰ مذاق کے ساتھ ساتھ اردو کے ادبی پس منظر سے واقفیت رکھتا ہو۔ ان کے فن کے مخصوص دائرے تک محدود ہونے کی وجہ ان کا مخصوص مقامی رنگ بھی ہے جو ان کی علی گڑھ سے جذباتی وابستگی کا وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے لیے علی گڑھ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ان کی زندگی کا آئیڈیل ہے۔ دنیا کے کسی خطے کا ذکر ہو، بات علی گڑھ تک ضرور پہنچ جائے گی۔ ان کی شخصیت کی تشکیل میں علی گڑھ کا اہم کردار تھا اور ان کے ذہن پر اس شہر علم و فن کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ زندگی کی آخری سانسوں تک اس میں کمی نہیں آئی۔ ان کی تحریروں میں علی گڑھ اپنی مخصوص تہذیب کے ساتھ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ علی گڑھ کی اس وابستگی و وارفتگی کی وجہ سے کسی نے انھیں ''محرک علی گڑھ'' قرار دیا ہے۔ ان کی علی گڑھ سے اس جذباتی وابستگی کو بعض نقادوں نے ان کے فن کے لیے نیک فعل قرار دیا ہے۔

14.5.1 ''مضامین رشید'' کا تعارف

''مضامین رشید'' پروفیسر رشید احمد صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۶۴ء میں انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں کل ۲۰ مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ رشید احمد صدیقی نے اپنے مضامین کے متعلق بھی ایک مضمون تحریر کیا ہے جو اس کتاب میں بطور پیش لفظ درج ہے اور جس کا عنوان '' کچھ اپنے کچھ ان مضامین کے بارے میں'' ہے۔ اس مجموعے میں ''سر گذشت عہد گل''، ''حاجی صاحب''، ''مولانا سہیل''، ''دھوبی''، ''وکیل صاحب''، ''اپنی یاد میں''، ''چارپائی''، ''پاسبان''، ''ارہر کا کھیت''، ''گواہ''، ''شیطان کی آنت''، ''ماتابدل''، ''کارواں پیداست''، ''گھاگھر''، ''آمد میں آورد''، ''مغالطہ''، ''مرشد''، ''مثلث''، '' کچھ کا کچھ'' اور ''سلام ہونجد پر'' شامل ہیں۔

14.5.2 ''مضامین رشید'' کا تفصیلی مطالعہ

''مضامین رشید'' اور ''خنداں'' یہ دونوں رشید احمد صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ جس میں ''مضامین رشید'' پہلے اور ''خنداں'' بعد میں منظر عام پر آیا ہے۔''مضامین رشید'' میں کل بیس مضامین شامل ہیں۔ جن میں ہر قسم کے عنوان کو شامل کیا گیا ہے۔ مذکورہ

مجموعے سے رشید احمد صدیقی کے طنز ومزاح کی تخلیقی وفطری صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کے شعور کی پختگی اور نظروں کے عقابی صفت ہونے کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔حالانکہ انھوں نے ''مضامین رشید'' جس دور میں لکھا اس دور میں اردو ادب میں طنز ومزاح کا فن اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا اس کے باوجود آج بھی جب کہ طنز ومزاح کا معیار کافی بلند ہو چکا ہے ''مضامین رشید'' نہ صرف یہ کہ رشید احمد صدیقی کا اہم کارنامہ ہے بلکہ آج کے طنز ومزاح کے ادب میں اس کی منفرد ومسلم حیثیت بھی ہے۔

''دھوبی'' کے عنوان سے مضمون میں انھوں نے دھوبی کے متعلق بہت ہی منفرد انداز سے لکھا ہے۔دھوبی کو معاشرت میں مرکز میں رکھ کر انھوں نے بتایا ہے کہ اس کا تعلق زمانے کے ہر شخص سے ہے اور وہ ہر طبقے کے کپڑے دھونے کی وجہ سے ہر طبقے میں اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے منطقی انداز میں دھوبی کی صفات کو واضح کیا ہے۔دھوبی کے کپڑے دھونے سے لے کر اس کو کرائے پر دینے اور خود پہننے کی داستان بھی انشائیے کا حصہ ہے جو نہایت دلچسپ اور مزاحیہ ہے۔ایک مثال دیکھئے:

> ''علی گڑھ میں میرے زمانہ طالب علمی کے ایک دھوبی کا حال سنئے جواب بہت معمر ہو گیا ہے وہ اپنے گاؤں میں بہت معزز مانا جاتا ہے۔دو منزلہ وسیع پختہ مکان میں رہتا ہے کاشتکاری کا کاروبار بھی اچھے پیمانہ پر پھیلا ہوا ہے۔گاؤں میں کالج کے قصے اس طور بیان کرتا ہے جیسے پرانے زمانے میں سورماؤں کی بہادری وفیاضی اور حسن وعشق کے افسانے اور نظمیں بھاٹ سنایا کرتے تھے۔کہنے لگا میاں وہ بھی کیا دن تھے اور کیسے کیسے اشراف کالج میں آیا کرتے تھے۔قیمتی خوبصورت نرم و نازک کپڑے پہنتے تھے جلد اتارتے تھے دیر میں منگاتے تھے ہر مہینہ دو چار کپڑے ادھر ادھر کر دیئے وہاں خبر بھی نہ ہوئی یہاں مالا مال ہو گئے۔ان کے اتارے کپڑوں میں بھی میرے بچے اور رشتہ دار ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے علی گڑھ کی نمائش۔آج کل جیسے کپڑے نہیں ہوتے تھے گویا بوری اور چھولداری لٹکائے پھر رہے تھے ایک کپڑا دھونا پچاس ہاتھ مگدر ہلانے کی طاقت لیتا ہے۔کیسا ہی دھوؤ بناؤ آب نہیں چڑھتا۔اس پر یہ کہ آج لے جاؤ کل دے جاؤ کوئی کپڑا بھول چوک میں آ جائے تو عمر بھر کی آبرو خاک میں ملا دیں۔میاں ان رئیسوں کے کپڑے دھونے میں بھی مزہ آتا تھا جیسے دودھ ملائی کا کاروبار دھونے میں مزا، استری کرنے میں مزا، دیکھنے میں مزا، دکھانے میں مزا، کنوئیں کے پاس کپڑے دھوتے تھے کہ کوتوالی کرتے تھے۔''

''مرشد'' مضامین رشید میں شامل انشائیہ ہے۔اس انشائیے میں رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک دوست مرشد کا ذکر کیا ہے جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔اس انشائیہ کے مرکزی کردار مرشد اور خود رشید احمد صدیقی ہیں۔ان دونوں کے درمیان دوستانہ گفتگو ہوتی ہے جو کئی قسم کے موضوعات پر مبنی ہوتی ہیں۔اس انشائیہ میں انھوں نے مولوی، جماعتی اصحاب کے افعال، ریاکار نمازیوں کی حرکات، حکیموں اور طبیبوں کی مکاریاں، روزے دار، مارواڑی عورتوں اور بنگالیوں پر نہایت ہی لطیف انداز میں طنزیہ ومزاحیہ پیرائے میں لکھا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''میرے نزدیک مارواڑی عورتیں مجموعہ تین چیزوں کا گھونگھٹ، گندگی اور گہنا، کم ذی روح ملے ہوں گے جن پر سونے چاندی اور گندگی کا اتنا انبار ہو، ان کو دیکھ کر اکثر مجھے وہ تصویریں یاد آ جاتی

ہیں جو ہفتہ وار مصور ٹائمس کے پہلے صفحہ پر نظر آتی ہیں، زیور کا منشا، اولین تو شاید ظاہری جسمانی آرائش رہی ہوگی، اس کے بعد ممکن ہے اس کا شمار دولت میں ہونے لگا ہو، لیکن اس میں کوئی شک نہیں مارواڑیوں نے اس کو صرف دولت قرار دے دیا ہے اور یہی نہیں بلکہ اپنی عورتوں کو انھوں نے زیور کی بار برداری کا ایک رہلی جانور سمجھ رکھا ہے۔''

(مضامین رشید:صفحہ:19)

انشائیہ ''شیطان کی آنت'' رشید صاحب کے گردے کے آپریشن پر مبنی ہے۔ یہ آپریشن کنگ جارج میڈیکل کالج، لکھنؤ میں ہوا تھا۔ اس بارے میں انھوں نے کئی دلچسپ باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کو پڑھ کر فرحت وانبساط کا احساس ہوتا ہے۔ ایک جگہ اپنے ایک دوست کے تانگے کا ذکر نہایت لطیف پیرائے میں کرتے ہیں:

''حکیم صاحب کے تانگے پر بیٹھنے کے بعد کوئی شخص نہ اپنے آپ کو محفوظ خیال کر سکتا ہے اور نہ دوسروں کو جو سڑک پر چل رہے ہوں یا دکان پر بیٹھے ہوں۔ چال جیسے کڑی کمان کا تیر۔ تیور جیسے کسی دیہاتی تھانہ کا تھانہ دار کسی دیہاتی ہی زمیندار کے گھوڑے پر سوار ہو۔ جلیل صاحب کی موٹر کی مانند صبا رفتار نہیں بلکہ ان کے گھوڑے کی مانند طوفان رفتار!

میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ اس تانگے پر انسان سوائے تحفظ ذات کے گردوپیش کے حالات ومناظر پر مطلق غور نہیں کر سکتا اور یہی نہیں بلکہ اس پر سے اترنے کے بعد بھی تھوڑی دیر اپنے اعضاو جوارح کو ٹٹولتا رہتا ہے کہ سب کے سب اپنے اپنے مقام پر صحیح وسالم موجود بھی ہیں یا نہیں۔''

(مضامین رشید:صفحہ:30-28)

اس انشائیہ میں انھوں نے ظرافت کے ساتھ سنجیدہ اور فکر انگیز موضوع پر بھی لکھا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے جذباتی لگاؤ بھی اس میں ملتا ہے۔ وہاں کی تہذیب وتمدن، اخوت وہمدردی، باہمی تعاون اور شفقت ومحبت کا برملا اظہار انھوں نے کیا ہے۔ اس انشائیہ کے کرداروں میں ڈاکٹر ظریف، ڈاکٹر صدیقی، ڈاکٹر بھاٹیا، جیل صاحب اور حکیم عبدالمعید صاحب اہم کرداروں میں ہیں۔

''پاسبان'' میں رشید صاحب نے فلسفیانہ گفتگو کی ہے۔ اس میں مزاح وطنز دونوں شامل ہے۔ عورت، شاعر، مولوی اور شیطان کو پاسبان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس کرداروں کے درمیان جو مکالمے ہیں ان میں فلسفیانہ جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس میں فرضی مذہبی رہنما بن کر قوم کو گمراہ کرنے والوں کی بھی قلعی کھولی گئی ہے۔ ان میں مندر کا پروہت، درگاہوں کو مجاور اور مساجد کا متولی شامل ہیں جن کا مقصد ان عہدے پر رہ کر پیسہ کمانا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''آخر ہم دونوں ایک کھڑکی کے قریب پہنچے۔ اچھا اب ایک روپیہ نذر کیجئے اور کھڑکی میں منھ ڈال کر دعا مانگیے قبول ہوگی۔ میں نے کہا جناب یہ ایک روپیہ نقد حاضر ہے، میں دعا سے باز آیا کہنے لگے جناب یہ یہاں کا دستور ہے، آپ مزار شریف کی توہین کرتے ہیں۔ میں نے کہا بھائی توہین نہیں کرتا۔ 'رہیے وائے' دعا مانگی جس میں رقت، خفت اور خفگی سب کچھ شامل تھی۔''

(مضامین رشید:صفحہ:94)

انشائیہ ''ما تا بدل'' ایک افسانوی نوعیت کا انشائیہ ہے۔اس کا مرکزی کردار ما تا بدل ہے۔ یہ ایک غریب مزدور کے جس کے پڑوس میں ایک بہت ہی زیادہ جھگڑالو عورت رہتی ہے جس کا نام چھتیا ہے اور یہ مزدور اس سے پناہ مانگا رہتا ہے۔اس مضمون میں مزاحیہ عناصر تو ملتے ہیں لیکن انشائیہ کے عناصر کی کمی پائی جاتی ہے۔ایک شریر اور بدزبان عورت کی عکاسی اس میں ملتی ہے جس کی زبان سے ایک مرد کی زندگی میں پریشانیاں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ما تا بدل کوٹھے کی کھپریل درست کر رہے تھے۔معلوم نہیں زمانہ کے نشیب وفراز پر غور کر رہے تھے اور حقہ نوشی کے کن مدارج سے گزر رہا تھا کہ یکا یک چھت سے پھسلے اور کوٹھے کی دوسری سمت چھتیا کے صحن میں حقہ سمیت جا گرے۔دھماکے کی آواز سن کر چھتیا دوڑ پڑی اور چور چور چلا کر تمام محلّہ سر پر اٹھالیا۔ پاس پروس کے لوگ جمع ہو گئے۔چھتیا کی زبان سے مغلظات کا ایک آبشار رواں تھا۔ادھر ما تا بدل کا قریب قریب وصال ہی ہو چکا تھا۔ما تا بدل بیچارے بیہوش تھے۔لوگوں نے آ کر ان کو پہچانا اور بہزار دوقت لاد پھاند کر گھر پہنچایا۔''

(مضامین رشید:صفحہ:124)

''ارہر کا کھیت'' رشید صاحب کا بہت مشہور انشائیہ ہے۔اس میں انھوں نے ارہر کے کھیت کی زندگی میں اہمیت ومعنویت کو اپنے تجربے اور تخیل کی بنیاد پر عیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے ساتھ ہی ارہر کے کھیت میں جو عیاشیاں یا بدعنوانیاں ہوتی ہیں جن کا سماج پر برا اثر پڑتا ہے اس کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔اس کے ذریعہ انھوں نے سماج میں پھیلی عریانیت کو بھی دکھایا ہے کہ ہر ایک قاری اس کو پڑھنے کے بعد دیہاتی زندگی میں ارہر کے کھیت کے استعمال کے نئے نئے طریقوں سے آشنا ہو جائے۔اس کی زبان میں مزاح لطیف، نیا زاویۂ نگاہ اور اسلوب کی شگفتگی سب شامل ہے۔ایک مثال دیکھئے:

''جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں ایسا مسئلہ ہے جس پر ناک بھوں پر زور دینے سے پہلے، دل ودماغ پر زور دینا ضروری ہے۔ ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ اکثر شفاخانے میں ورنہ جیل میں۔جیل خانے کا راستہ تو اکثر ارہر کے کھیت ہی سے ہو کر گزرتا ہے اور شفاخانہ کا شہروں کی صاف، شفاف سڑکوں سے جس پر سے موٹر گزرتے ہیں اور مولوی بھی۔''

(مضامین رشید:صفحہ:135)

انشائیہ ''وکیل صاحب'' میں مصنف نے ایک نہایت مفلوک الحال اور تنگ دست وکیل کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ان صاحب کی کسم پرسی اور لاچاری کو مزاح اور لطیف انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان سے ہمدردی بھی پیدا ہوتی ہے۔وکیل صاحب کی وکالت بالکل بھی نہیں چلتی ہے جس کی وجہ سے وہ مالی مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔وکیل صاحب خالی ہاتھ گھر لوٹتے ہیں اور بچوں کی فرمائش پوری نہیں کر پاتے ہیں۔وکیل صاحب کی مالی مشکلات کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''وکیل صاحب نے تھوڑا بہت کھا پی کر اپنا بستہ سنبھالا۔شہر کے چوراہے پر یکہ کی تلاش میں آ کھڑے ہوئے... یکہ والے ۲؍ فی سواری پر مصر، یہ ا؍ سے زیادہ دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ جتنے یکہ والے سامنے سے گزرے سبھی سے ردوقدح ہوئی کسی نے ان کا خیال نہ کیا...ایک نہایت حقیر اور شکستہ یکہ پر دو سواریاں پہلے سے موجود تھیں...بہزار دقت ا؍ پر معاملہ طے ہوا۔گھوڑے کی چال ان سواریوں کی حالت زار پر دال تھی۔ ہر ایک پر وجد طاری تھا اور ہچکولوں کی تال وسر پر ہر ایک سر

دھنتا تھا...کہ گھوڑے نے ٹھوکر لی.. بستہ مع ٹوپی کے زمین پر گرا اور خود گھوڑے کی پیٹھ پر کہنیوں کے بل آرہے۔''

(مضامین رشید:صفحہ:196-195)

رشید صاحب کے اسلوب کی نیرنگی نے اس انشائیہ کو شاہکار انشائیہ بنا دیا ہے۔

''چار پائی'' کو رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں بلند مقام حاصل ہے۔سماجی زندگی میں چار پائی جیسی ادنیٰ سی چیز جو بیٹھنے اور سونے کے کام آتی ہے رشید صاحب نے اس کے استعمال کے بے شمار طریقے بتائے ہیں۔موضوع کے اعتبار سے ان کے اسلوب میں جدت، حلاوت اور نئے زاویۂ نگاہ کا نہایت ہی حسین امتزاج پیدا کر دیا ہے۔اس کے استعما کے جو دیگر طریقے بتائے ہیں اس میں ادبی رچاؤ کے علاوہ مزاح لطیف کا عنصر بھی غالب ہے۔ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

''ہندوستانی گھرانوں میں چار پائی کو ڈائننگ روم، سونے کا کمرہ، غسل خانہ، پائخانہ، قلعہ، مورچہ، خیمہ، دواخانہ، صندوق، دار المطالعہ، دار الکتب، دار الشفا، دار الحکومت وغیرہ سب کچھ مجموعی و انفرادی حیثیت حاصل ہے۔''

(مضامین رشید:صفحہ:266)

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ''مضامین رشید'' میں رشید صاحب نے نہ صرف طنزیہ ومزاحیہ انداز اپنایا ہے بلکہ سنجیدہ اور فکر انگیز موضوع پر بھی لکھا ہے۔ان کے انشائیوں کی خاص بات یہ ہے کہ ہر ایک میں کسی نہ کسی طرح علی گڑھ کو ضرور شامل کرتے ہیں۔اس سے ان کی علی گڑھ سے گہری وابستگی اور دلی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔کچھ انشائیوں میں سماج کی بدتر حالت، غریبی ہمدردی اور آپسی نا اتفاقی کو بھی موضوع بنایا ہے۔وہ گہرا سماجی شعور رکھتے ہیں اور ان کے انشائیوں کے مطالعے سے اس بات کا خاص احساس ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ کس قدر عمیق ہے۔

14.5.3 ''مضامین رشید'' کا اسلوب

رشید احمد صدیقی کے اسلوب میں موجود شگفتگی، رعنائی اور طرفگی نے اردو طنز ومزاح کے سرمایے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔انشائیہ میں اسلوب کی بہت اہمیت ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سنجیدہ موضوع کو طرز اسلوب کے ساتھ ہی طنز ومزاح کے پیرائے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔طنز ومزاح کی بنیاد اسلوب ہی ہے اور رشید احمد صدیقی کے یہاں اسی اسلوب کی جدت بدرجۂ اتم موجود ہے جس کی وجہ سے ان کا انداز مختلف ہے اور ان کی انفرادیت قائم ودائم ہے۔ان کی تحریروں میں مختلف انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے یہاں فکر وفن میں نیا رنگ، خیالات کی ندرت اور انداز بیان کی جدت موجود ہے۔جس زمانے میں رشید احمد صدیقی نے قلم اٹھایا اس زمانے میں بہت سارے طنز ومزاح نگار نے بھی اپنی کوششیں کی لیکن جو فکری بصیرت، اسلوب کی پختگی اور فنی بالیدگی ان کا خاصہ ہے وہ کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔رشید احمد صدیقی کا اسلوب ان کی فطری ذہانت اور شگفتہ طبیعت کا نتیجہ ہے جس میں منفرد رنگ وآہنگ ملتا ہے۔اردو نثر میں انھیں نمائندہ طرز تحریر اور منفرد اسلوب کا مالک سمجھا جاتا ہے۔وہ ایک طرز خاص کے موجد ہیں۔

زبان کے تخلیقی اور ترسیلی استعمال کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم طنزیہ ومزاحیہ ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ طنزیہ ومزاحیہ اسلوب ایسا اسلوب ہے جس میں زبان کا تخلیقی استعمال اپنی انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ طنز ومزاح کی تخلیق میں زبان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔زبان کے استعمال کی مختلف صورتیں ہی طنز ومزاح میں جان ڈالنے کا کام کرتی ہیں۔رشید احمد صدیقی نے

طنز ومزاح کی تخلیق میں زبان کے تمام تخلیقی امکانات کا سہارا لیا ہے۔انھوں نے زبان کو ہر نئے انداز سے برتنے کی کوشش کی ہے اور زبان کی صرفی،صوتی،نحوی اور معنیاتی سطحوں پر اس کے تخلیقی امکانات کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کی ہے۔طنز ومزاح میں کامیابی کے لئے زبان پر اعلی قدرت اور اسے تخلیقی طور پر برتنے کی صلاحیت دونوں کا ہونا ضروری ہے اور یہ دونوں خوبیاں رشید احمد صدیقی میں موجود ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک کامیاب مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ طنز ومزاح میں زبان کی الگ اہمیت ہے۔زبان میں رعایت لفظی اور الفاظ کے الٹ پھیر سے انھوں نے نیرنگی پیدا کی ہے۔ان کے یہاں کہیں معنی کا تضاد اور کہیں معنوی تناسب سے تحریر کو سجایا گیا ہے۔ان کے یہاں اکثر معنوی تناسب سے کام لیا گیا ہے۔وہ بات سنجیدگی سے شروع کرتے ہیں لیکن پھر کچھ ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں کہ معنوی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور مزاح پیدا ہو جاتا ہے اور قاری بغیر مسکرائے رہ نہیں پاتا۔ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

''ڈاکٹر عبدالحمید صدیقی ہاؤس سرجن تھے اور میری دیکھ بھال ان کے سپرد تھی، کتنے محنتی، محبتی اور اپنے فن میں طاق تھے کسی وقت سرجری میں اپنے استاد ڈاکٹر بھاٹیہ کے ہم اثر بن جائیں گے اس میں اتنا عرصہ لگے گا جتنا 'فتنہ' کو 'قیامت' ہونے میں لگتا ہے۔''

(رشید احمد صدیقی۔شیطان کی آنت۔مشمولہ ''مضامین رشید''۔انجمن ترقی اردو ہند، دہلی،ص:۱۵۰)

یہاں فتنہ قیامت ایسا لفظ ہے جن میں معنیاتی اعتبار سے ایک تناسب اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کے یہاں صوتی ردو بدل کے ذریعہ بھی مزاح کا رنگ پیدا کرنے کی صورتیں ملتی ہیں۔ایک مثال ملاحظہ فرمائیں جس میں حرف 'ٹ' کو 'ت' سے بدل کر مزاح کا پہلو پیدا کر دیا گیا ہے:

''ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔یہ میرس روڈ پر حال ہی میں تیار ہوئی ہے وسیع، خوش قطع، سامنے گھاس، کشادہ میدان، آمد و رفت کا راستہ چوڑا، صاف ستھرہ، داکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی انفلوئنزا میں مبتلا تھے، دیکھتے ہی بولے خوب آئے کوٹھی کا نام تجویز کرو۔میں نے کہا آپ نے روکا پر کیا لکھوا رکھا ہے، فرمایا حمید بٹ اور محمود بٹ، عرض کیا یہ کوٹھی کا نام ہے یا خاندان کا شجرۂ نسب، کہنے لگے حرج کیا ہے، میں نے کہا ایسا نام بھی کیا جس کو نہ ثواب سے لگاؤ نہ آرٹ سے تعلق۔ثواب کی خاطر رکھتے تو کراماً کاتبین میں کیا قباحت تھی اور آرٹ مدنظر تھا تو یاجوج ماجوج رکھتے، اکتا کر بولے ناک میں دم ہے، تم ہی بتاؤ لیکن میں منزل ونزل کا قائل نہیں میں نے کہا بٹ کدہ نام رکھیے رفتہ رفتہ بت کدہ بن جائے گا۔''

(رشید احمد صدیقی۔کارواں پیداست۔مشمولہ ''مضامین رشید''۔انجمن ترقی اردو ہند، دہلی،ص:۲-۱۷۱)

رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں اکثر غیر جگہ معنوی اعتبار سے دو غیر مناسب الفاظ ایک جگہ یکجا کر دیے جاتے ہیں جن جا ذہن میں آنا

مشکل ہے لیکن یک بیک ان کی ایک جگہ موجودگی ظرافت کا سامان پیدا کرتی ہے:

''گواہ قرب قیامت کی دلیل ہے۔ عدالت سے قیامت تک جس سے مفر نہیں وہ گواہ ہے۔ عدالت مختصر نمونۂ قیامت ہے اور قیامت وسیع پیمانے پر نمونۂ عدالت۔ فرق یہ ہے کہ عدالت کے گواہ انسان ہوتے ہیں ور قیامت کے گواہ فرشتے جو ہمارے اعمال دیکھتے ہیں اور خدا کی عبادت کرتے ہیں۔''

(رشید احمد صدیقی۔ گواہ۔ مشمولہ ''مضامین رشید''۔ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ص:۱۳۲)

ایک مثال اور ملاحظہ فرمائیں جس میں کھچڑی اور کیمیا کے الفاظ کو یکجا کر دیا ہے:

''ایک دفعہ عطا اللہ خاں درانی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ خان کو کیمیا بنانے اور کھچڑی بنانے کا غیر معمولی شوق تھا۔ صبح سے شام تک سید محمود (کچی بارک) کے برامدے میں انگیٹھی دہکتی رہتی۔ کیمیا سے سیر ہو جاتے تو کھچڑی کی دیگچی آگ پر رکھ دیتے اور کھچڑی سے فراغت پاتے تو کیمیا میں مصروف ہو جاتے۔''

(رشید احمد صدیقی۔ مرشد۔ مشمولہ ''مضامین رشید''۔ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ص:۲۱۹)

رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں جگہ جگہ مزاح کے ساتھ ظرافت کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ جہاں کہیں طنز کی لہر تیز ہوتی ہے وہاں مزاح اس کے اثر کو متوازن کرتی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ اس کے متعلق لکھا ہے کہ:

''ہر اچھی ظرافت ایک قسم کی خوش گوار طنز ہوتی ہے اور ہر خوش گوار طنز بجائے خود ایک لطیف ظرافت ہے۔''

(رشید احمد صدیقی۔ طنزیات و مضحکات۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ ص:۱۶۵)

اس قول کا ثبوت ان کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں میں جا بجا نظر آتا ہے۔

14.6 آپ نے کیا سیکھا

آپ نے رشید احمد صدیقی کی شخصیت کے بارے میں جانا۔

آپ نے رشید احمد صدیقی کے ادبی کارناموں سے واقفیت حاصل کی۔

آپ نے رشید احمد صدیقی کی طنز و مزاح نگاری کے اوصاف جانے۔

آپ نے ''مضامین رشید'' کا تفصیلی جائزہ لیا۔

آپ نے ''مضامین رشید'' کے اسلوب کے متعلق جانا۔

14.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ رشید احمد صدیقی کی شخصیت پر روشنی ڈالیے۔

2۔ رشید احمد صدیقی کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

3۔ ''مضامین رشید'' کا تعارف پیش کیجیے۔

4۔ ''مضامین رشید'' کے کسی ایک مضمون کا خلاصہ لکھیے۔

5۔ رشید احمد صدیقی کی طنز و مزاح نگاری پر ''مضامین رشید'' کے خصوصی حوالے سے روشنی ڈالیے۔

14.8 سوالات کے جواب

جواب 1: رشید احمد صدیقی ۲۵ر دسمبر ۱۸۹۴ء کو قصبہ بیریا ضلع بلیا میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں ان کا ننہال تھا۔ وہ بچپن میں بہت بیمار رہا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کی تعلیم پر کم توجہ دی گئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے استاد مولوی قدرت اللہ صاحب سے حاصل کی۔ انھوں نے دینیات، بغدادی قاعدہ اور عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی اسکولی زندگی کا آغاز باضابطہ طور پر جونپور سے ہوا جہاں ۱۹۰۸ء میں ان کا داخلہ چوتھی جماعت میں ہوا اور ۱۹۱۴ء میں انھوں نے انٹر پاس کیا۔ انھیں انگریزی زبان میں بہت دلچسپی تھی اور اس میں ہمیشہ اول آتے البتہ ریاضی میں ہمیشہ ہی ناکام ہو جاتے۔ انھیں ٹینس کھیلنا بہت پسند تھا۔ اس کے علاوہ فٹ بال اور کرکٹ بھی ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے وہ علی گڑھ میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ علی گڑھ میں داخلہ سے پہلے وہ جونپور کی عدالت دیوانی میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے لئے انھوں نے نوکری چھوڑ دی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۱۹ء میں بی۔ اے اور ۱۹۲۱ء میں ایم۔ اے۔ پاس کیا۔ انھیں علی گڑھ میں ایسے لوگوں کا ساتھ ملا جو نایاب تھے۔ ان میں سرفہرست ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا نام آتا ہے جو بعد میں ہندوستان کے صدر جمہوریہ بھی مقرر ہوئے۔ ذاکر حسین رشید احمد صدیقی سے دو سال سینئر تھے۔ ان کے علاوہ شفیق الرحمٰن قدوائی، شجاع الدین، اقبال احمد سہیل اور سید نور اللہ جیسے افراد رشید احمد صدیقی کے ساتھیوں میں رہے جن کی صحبت نے انھیں بہت کچھ سکھایا۔ انھوں نے علی گڑھ میں صرف تعلیم ہی حاصل نہیں کی بلکہ دیگر ادبی مصروفیات میں بھی حصہ لیا۔ وہ ڈیوٹی سوسائٹی کے سرگرم کارکن تھے اور اسی سلسلہ میں انھوں نے کلکتہ، چٹا کانگ اور رنگون کا دورہ بھی کیا۔ ۱۹۔۱۹۱۸ء میں وہ 'انجمن اتحاد طلبہ' کے معتمد بھی مقرر ہوئے۔ ''علی گڑھ منتھلی'' کے نام سے مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کا علمی و ادبی جریدہ نکلتا تھا۔ وہ کئی برسوں تک اس کے مدیر رہے۔ بعد میں یہ جریدہ ''علی گڑھ میگزین'' کے نام سے شائع ہونے لگا اور بہت مشہور ہوا۔ انھوں نے Behiman کے نام سے انگریزی زبان میں مضامین لکھے۔ اس وقت وہاں کھیل کود کو بھی تعلیم کے برابر اہمیت حاصل تھی۔ رشید احمد صدیقی کا پسندیدہ کھیل ٹینس تھا اور اس کھیل کے لئے وہ نٹ کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے درمیان میں چارپائی کا استعمال کرتے تھے۔

جواب 2: رشید احمد صدیقی کے ادبی کارناموں میں ''مضامین رشید''، ''خنداں''، ''گنج ہائے گراں مایہ''، ''طنزیات و مضحکات''، ''اردو طنز و مزاح کی تنقیدی تاریخ''، ''خطوط رشید احمد صدیقی''، ''نقش ہائے رنگ رنگ''، ''ہم نفسان رفتہ''، ''اطفار''، ''آشفتہ بیانی میری'' اور ''علی گڑھ۔ ماضی و حال''، ''علی گڑھ کی مسجد قرطبہ''، ''عزیز انندوہ کے نام''، ''غالب کی شخصیت اور شاعری''، ''ہمارے ذاکر صاحب''، ''اقبال شخصیت اور شاعری'' اور ''جدید غزل'' ان کی اہم تصانیف ہیں۔

جواب 3: ''مضامین رشید'' پروفیسر رشید احمد صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۶۴ء میں انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں کل ۲۰ مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ رشید احمد صدیقی نے اپنے مضامین کے متعلق بھی ایک مضمون تحریر کیا ہے جو اس کتاب میں بطور پیش لفظ درج ہے اور جس کا عنوان ''کچھ اپنے کچھ ان مضامین کے بارے میں'' ہے۔ اس مجموعے میں ''سر گذشت عہد گل''، ''حاجی صاحب''، ''مولانا سہیل''، ''دھوبی''، ''وکیل صاحب''، ''اپنی یاد میں''، ''چارپائی''، ''پاسبان''، ''ارہر کا کھیت''، ''گواہ''، ''شیطان کی آنت''، ''ما تا بدل''، ''کارواں پیداست''، ''گھاگھر''، ''آمد میں آورد''، ''مغالطہ''، ''مرشد''، ''مثلث''، ''کچھ کا کچھ'' اور

''سلام ہو نجد پر'' شامل ہیں۔

14.9 فرہنگ

الفاظ	معنی
استقلال	ثابت قدمی
مضحکات	وہ لطیفے یا باتیں جنھیں پڑھ کر ہنسی آئے
سپردخاک	دفن کرنا
قائم ودائم	ہمیشہ باقی رہنے والا
بالیدگی	نشو ونما
پختگی	پکا ہونا، باشعور
انفرادیت	ذاتی خصوصیت میں دوسروں سے الگ ہونا
جدت	نیا پن
بصیرت	عقل، فہم
صرفی	قواعد
صوتی	آواز سے منسوب
نحوی	جملے کی ساخت سے متعلق
معنیاتی	معنی کے لحاظ سے
رعایت لفظی	الفاظ کی ایسی ترکیب جس میں سادگی، بے تکلفی اور فطری پن ہو
معنوی ہم آہنگی	معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مطابقت رکھنا
مغالطہ	غلطی میں مبتلا ہونا
بت کدہ	بت خانہ
خنداں	کھلا ہوا، ہنستا ہوا
عقابی صفت	تیز رفتار
رقت	آنسوؤں سے رونے کی حالت
خفت	شرمندگی

14.10 کتب برائے مطالعہ

1۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، مضامین رشید، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، 1964ء

2۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی (مرتبہ)، رشید احمد صدیقی: شخصیت اور ادبی قدر و قیمت، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1998ء

3۔ خواجہ محمد اکرام الدین، رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ،تخلیق کار پبلشرز، دہلی،1994ء

4۔ سلیمان اطہر جاوید، رشید احمد صدیقی (مونوگراف)، ساہتیہ اکادمی، دہلی،1988ء

5۔ پروفیسر عبدالحق، رشید احمد صدیقی کا ثقافتی منظر نامہ،2010ء

6۔ ڈاکٹر خالد محمود، اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، اردو اکادمی، دہلی،2005ء

7۔ رشید احمد صدیقی، آشفتہ بیانی میری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،1958ء

اکائی 15: مشتاق احمد یوسفی کی طنز و مزاح نگاری چراغ تلے کے خصوصی حوالے سے

ساخت

15.1 اغراض و مقاصد
15.2 تمہید
15.3 مشتاق احمد یوسفی کی طنز و مزاح نگاری
15.3.1 مشتاق احمد یوسفی کے حالات زندگی
15.3.2 مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات
15.3.3 مشتاق احمد یوسفی کی طنز و مزاح نگاری
15.3.4 ''چراغ تلے'' مختصر متن
15.3.5 ''چراغ تلے'' کا تجزیہ
15.4 آپ نے کیا سیکھا
15.5 اپنا امتحان خود لیجیے
15.6 سوالات کے جوابات
15.7 فرہنگ
15.8 کتب برائے مطالعہ

15.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

مشتاق احمد یوسفی کے حالات زندگی اور ادبی خدمات سے متعارف ہوں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کی طنز و مزاح نگاری کی خصوصیات ے آگاہ ہوں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کی مجموعہ مضامین ''چراغ تلے'' کا جائزہ لیں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کے اسلوب پر نظر ڈالیں گے۔

مشتاق احمد یوسفی کے اردو ادب میں مرتبہ و مقام کا تعین کریں گے۔

15.2 تمہید

اردو مزاح نگاری کی تاریخ میں مشتاق احمد یوسفی ایک باوقار اور سنجیدہ فن کار کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ان کی مزاح نگاری محض چند لمحوں کے لئے ہنسانے والی نہیں بلکہ ایک سنجیدہ عمل ہے جو ہمارے ذہن پر دیرپا نقش چھوڑ جاتا ہے۔انہوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو مزاح کے پیرائے میں اس طرح سے پیش کیا ہے کہ قاری لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور طبیعت کہیں بوجھل نہیں ہونے پاتی۔ان کی مضحکہ خیز طبیعت نے ان کے مضامین میں چار چاند لگا دیے۔انہوں نے بہت کم لکھا لیکن جو بھی لکھا وہ بے حد شاندار ہے اور بقائے دوام تک اردو ادب میں ان کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ابن انشا مشتاق احمد یوسفی سے متعلق لکھتے ہیں ۔

''اگر مزاحیہ ادب کے موجودہ دور کو ہم کسی نام سے منسوب کر سکتے ہیں تو وہ یوسفی ہی کا نام ہے۔''

15.3 مشتاق احمد یوسفی کی طنز و مزاح نگاری

15.3.1 مشتاق احمد یوسفی کے حالات زندگی

مشتاق احمد یوسفی کی پیدائش 4 ستمبر 1923ء کو ہندوستان کے شہر جے پور،ٹونک،راجستھان کے ایک تعلیم یافتہ خاندان میں ہوئی۔ان کے والد کا نام عبدالکریم خان یوسفی تھا جو جے پور بلدیہ کے صدر نشین تھے اور بعد میں جے پور قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر مقرر ہوئے۔مشتاق احمد یوسفی نے راجپوتانہ میں اپنی ابتدائی تعلیم پوری کی اور بی اے کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد آگرہ یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کیا اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔بلا کے ذہین تھے۔مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا۔تقسیم ہند کے بعد ان کا خاندان پاکستان کے کراچی میں جا بسا۔قیام پاکستان کے بعد سنہ 1950ء میں وہ مسلم کمرشیل بینک (ایم سی بی بینک لمیٹڈ) سے متعلق ہوئے اور ڈپٹی جنرل مینیجر کے عہدے کو سرفراز کیا۔1965ء میں الائڈ بینک لمیٹڈ میں بحیثیت مینیجنگ ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔1974ء میں یونائیٹڈ بینک کے صدر اور 1977ء میں پاکستان بینکنگ کونسل کے صدر منتخب ہوئے۔بینکاری کے شعبہ میں انہوں نے غیر معمولی خدمات انجام دیں جن پر انہیں قائداعظم میموریل تمغا عطا کیا گیا۔

15.3.2 مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات

مشتاق احمد یوسفی نے اپنے کیریئر کا آغاز بینکر کی حیثیت سے کیا۔بعد ازاں انہوں نے اردو میں طنز و مزاح نگاری کی جانب رجوع کیا اور اس میدان میں نمایاں مقام حاصل کیا۔مشتاق احمد یوسفی کی پہلی کتاب ''چراغ تلے'' 1961ء میں شائع ہوئی،دوسری ''خاکم بدہن'' 1970ء میں،تیسری ''زرگزشت'' 1976ء میں اور آخری شاہکار ''آب گم'' 1990ء میں شائع ہوئی۔اپنی ان تصانیف میں مشتاق احمد یوسفی نے طنز و ظرافت کے جو اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔ان کی تمام تصانیف میں ان کی شخصیت کی وہ جھلک ملتی ہے جس کو سمجھ پانا عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

2014ء میں ان کی ایک اور کتاب ''شام شعر یاراں'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی جو ان کی متفرق تحریروں کو جہاں تہاں سے جمع کر کے مرتب کر لی گئی تھی۔جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ان کے مداحوں کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ یہ ان کی پہلی کتابوں کی طرح طنز و مزاح کی کسوٹی پر کھری نہیں اتری۔اس کتاب میں وہ شگفتگی اور عمدہ اسلوب نہیں تھے جو ان کی گزشتہ تصنیف میں دیکھا گیا

تھا۔

مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے صدر پاکستان کے ہاتھوں انہیں کئی اعزازات دیے گئے ۔ 1999ء میں صدر پاکستان کے ہاتھوں 'ستارۂ' امتیاز ملا۔2002ء میں پھر صدر پاکستان کے ہاتھوں 'ہلال' امتیاز ملا۔1990ء میں پاکستان اکیڈمی برائے خطوط سب سے بہترین کتاب کے لیے ملا۔اسی طرح انہیں قائداعظم ،ہجرہ انعام اور آدم جی انعام سے بھی سرفراز کیا گیا۔

15.3.3 مشتاق احمد یوسفی کی طنز و مزاح نگاری

مشتاق احمد یوسفی کا شمار ایسے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے فن کو زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں سے اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر طرف شگفتگی ہی شگفتگی نظر آتی ہے۔مزاح نگاری مشتاق احمد یوسفی کی خاص جولاں گاہ ہے۔ یہ طنز نگاری سے کہیں زیادہ نازک شئے ہے اور اس کے لیے اعلیٰ ظرفی ،فراخ دلی ، بلند حوصلہ اور ہمدردانہ نقطہ نظر کی ضرورت ہے۔ یہ صلاحیت بس اسی میں موجود ہوسکتی ہے جو زندگی کی خامیوں اور ناہمواریوں سے مایوس نہ ہوکر اس پر خوش دلی سے ہنسنے کی ہمت رکھتا ہو اور جھنجھلاہٹ کے بجائے انہیں فلسفیانہ نقطے نظر سے دیکھنے کا ہنر رکھتا ہو۔

مشتاق احمد یوسفی اپنے مضامین میں فنی تکمیل کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ ہر دور کے لوگ اور ہر طرح کے کردار پر ان کی خاص نظر رہتی تھی۔ایک چھوٹی سی شے کو بھی مضحکہ خیز انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔بعض اوقات خود کو بھی ایک کردار بنا کر پیش کر دیتے تھے جو مضمون میں مزید چار چاند لگا دیتا تھا۔آپ اپنا نشانہ بننا ظرافت نگار کے لیے مشکل ضرور ہے لیکن اعلیٰ درجے کی ظرافت اسی تکنیک سے وجود میں آتی ہے۔ یہ ان کی خاص بات ہے کہ انہوں نے دوسروں کے ساتھ خود کو بھی نہیں بخشا۔''چراغ تلے'' کے مقدمہ میں خود کا تعارف یوں کرواتے ہیں:

- ''نام: سرورق پر ملاحظہ فرمائیے
- خاندان: سو پشت سے پیشۂ آبا سپہ گری کے سوا سب کچھ رہا ہے۔
- تاریخ پیدائش: عمر کی اس منزل پر آ پہنچا ہوں کہ اگر کوئی سنہ ولادت پوچھ بیٹھے تو اسے فون نمبر بتا کر باتوں میں لگا لیتا ہوں۔اور یہ منزل بھی عجیب ہے......
- ......جسامت: یوں سانس روک لوں تو 38 انچ کی بنیان بھی پہن سکتا ہوں ۔ بڑے لڑکے کے جوتے کا نمبر 7 ہے جو مجھے بھی فٹ آتا ہے......''

ظرافت پیدا کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ایک ہے الفاظ کا الٹ پھیر کرنا اور دوسرا واقع کا بیان۔جس ظرافت مین صرف الفاظ کا الٹ پھیر ہوتا ہے وہ معمولی درجے کی ظرافت ہوتی ہے جو سطحی ہوتی ہے۔اور جو ظرافت کسی دلچسپ واقعے کے بیان سے پیدا کی جاتی ہے وہ اعلیٰ درجے کی ظرافت ہوتی ہے۔حالانکہ بہترین ظرافت کے لیے دونوں کا ہونا لازمی ہے۔بغیر الفاظ کے استعمال کے کوئی واقعہ دلچسپ نہیں بن سکتا۔مشتاق احمد یوسفی اس طرح کے واقعات پیش کرتے ہیں اور اس طرح کے مناسب الفاظ کا بھی استعمال کرتے ہیں کہ لامحالہ ہنسی آ جاتی ہے۔اعلیٰ درجے کا ادب نہ صرف بہترین لفظوں سے وجود میں آتا ہے اور نہ صرف بلند خیال سے۔کامیاب

ادب وہ ہے جس میں خیال اور لفظ دونوں آپس میں شیر وشکر ہو جاتے ہیں۔مشتاق احمد یوسفی اس فن کے ماہر تھے۔

مشتاق احماد یوسفی اپنی تخلیقات میں اول سے آخر تک لوگوں سے ہمدردانہ رویہ قائم رکھتے ہیں۔اس سے بڑھ کر ایک فن کار کی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ سخت سے سخت موضوع پر جھنجھلاہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ ان پر مسکرا دینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔اس طرح سے وہ زندگی کو نئے زاویہ سے دیکھتا بھی ہے اور قاری کو بھی دکھاتا ہے۔لیکن مزاح نگاری کا مقصد محض ہنسنے ہنسانے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ ایک سنجیدہ عمل کارفرما ہے۔ہر زمانے میں ایک کامیاب ادب تخلیق کرنا ایک سنجیدہ ادیب کی ذمہ داری ہوتی ہے۔اگر مزاحیہ ادب کی روایت کو بھی دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مزاح نگاری نے وقت کی آواز بن کر سچا کردار ادا کیا ہے۔جس میں معاشرے کی ناہمواریوں کے پہلوؤں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔یوسفی صاحب نے اس فن کو بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ڈاکٹر محمد طاہر ان کی انہیں خصوصیات کی بنا پر لکھتے ہیں:

> ''ہم عصر مزاح نگاروں میں مشتاق احمد یوسفی اپنی فکر اور تدابیر کے پیش نظر بلا شبہہ اور معاصرین سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ان کی کتابوں کے مطالعے سے اس حقیقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان تہذیبی اور فکری اعتبار سے ارتقاء کے کتنے منازل طے کر چکی ہے۔اور اظہار کے کتنے لطیف اسالیب اردو زبان میں موجود ہے۔یوسفی کی تحریریں بلا شبہہ ہماری تہذیبی ترقی اور فکر و نظر کی بالیدگی کا اشاریہ ہیں۔''

(مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات۔ڈاکٹر محمد طاہر۔2003۔ص۔11)

پیروڈی کو اردو زبان میں ''تحریف'' کہتے ہیں۔تحریف کے معنی ہے الٹ دینا۔کسی تصنیف کو یا اس کے لفظوں یا مواد میں ایسا پھیر بدل کرنا کہ اس کی مضحکہ خیز صورت سامنے آ جائے۔پہلی نظر میں تو اس پر اصل کا دھوکہ ہو مگر غور کرنے پر محسوس ہو کہ اس کی صورت بگاڑ دی گئی ہے۔اس طرح تحریف کسی تصنیف کی مسخ شدہ نقل ہوتی ہے۔یوسفی جب اپنی نثر میں اشعار کا ستعمال کرتے ہیں تو وہ اتنا برمحل ہوتا ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ اشعار اس کی نثر کے لیے کہے گئے ہوں۔مثلاً مرغیوں کی گھر میں آمد پر یوسفی کو اپنا گھر اپنا نہیں لگتا تو لکھتے ہیں:

یہ گھر جو میرا ہے تیرا نہیں　　　　پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

مشتاق احمد یوسفی نے اپنی کتابوں میں بے شمار ایسے جملے لکھے ہیں جو ضرب المثل بن گئے ہیں۔لوگ ان کو اقوال زریں کی طرح پھیلاتے ہیں۔انہوں نے طنز و مزاح کو شیر و شکر کر کے پیش کیا ہے۔مزاح میں اگر طنز کی تھوڑی سی تلخی شامل نہ ہو تو صرف مٹھاس رہ جاتی ہے۔جو وقت گزاری کا تو اچھا ذریعہ ہے لیکن اس سے کوئی بڑا کام نہیں لیا جا سکتا اور وہ بے مقصد ادب کہلاتا ہے۔یوسفی صاحب بھی مزاح میں طنز کے نشتر چلاتے ہیں جو معیوب نہیں معلوم ہوتے بلکہ اس سے عبارت کا لطف دوگنہ ہو جاتا ہے۔اپنی تخلیق کو اور بھی لطف اندوز بنانے کے لیے انہوں نے خالص ادبی اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ان کے یہاں ہر بات کہنے کا اپنا سلیقہ ہے۔یوسفی صاحب بڑے نستعلیق آدمی تھے اور اپنی تخلیق میں زبان کے رکھ رکھاؤ اور اسلوب کو موضوع کی مناسبت سے استعمال کرتے تھے۔انہوں نے اپنی

تحریروں میں کئی جگہ ذکر کیا ہے کہ وہ پیدائشی مصنف نہیں ہیں اور اردو ان کی مادری زبان بھی نہیں ہے۔انہوں نے اردو سیکھنے کے لیے کافی محنت کی تھی۔

15.3.4 ’’چراغ تلے‘‘ کا مختصر متن

- نام: سرورق پر ملاحظہ فرمایئے
- خاندان: سو پشت سے پیشہ آبا سپہ گری کے سوا سب کچھ رہا ہے۔
- تاریخ پیدائش: عمر کی اس منزل پر آ پہنچا ہوں کہ اگر کوئی سنہ ولادت پوچھ بیٹھے تو اسے فون نمبر بتا کر باتوں میں لگا لیتا ہوں۔اور یہ منزل بھی عجیب ہے......
- ......جسامت: یوں سانس روک لوں تو 38 انچ کی بنیان بھی پہن سکتا ہوں ۔بڑے لڑکے کے جوتے کا نمبر 7 ہے جو مجھے بھی فٹ آتا ہے......

مقدمہ خود لکھنا کارِ ثواب ہے اس طرح دوسرے لوگ جھوٹ بولنے سے بچ جاتے ہیں۔دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کسی کتاب کو پڑھ کر قلم اٹھاتا ہے ورنہ ہمارے نقاد عام طور سے کسی کتاب کو اس وقت تک نہیں پڑھتے جب تک انہیں اس پر ’’سرکے‘‘ کا شبہ نہ ہو۔

ان کا آنا فرشتہ موت کا آنا ہے،مگر مجھے یقین ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ اسلام بھی روح قبض کرتے وقت اتنی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے ہوں گے۔

دائیں جانب ایک طاقچے میں جو فرش کی بہ نسبت چھت سے زیادہ نزدیک تھا،ایک گراموفون رکھا تھا،جس کی بالانشینی پڑوس میں بچوں کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی۔ٹھیک اس کے نیچے چیڑ کا ایک لنگڑا اسٹول پڑا تھا،جس پر چڑھ کر آغا چابی دیتے اور چھپن چھری اور بھائی چھیلا پٹیالے والے کے گھسے گھسائے ریکارڈ (سنن میں کانوں سے زیادہ حافظے سے کام لیتے تھے)اس سے ذرا ہٹ کر برتنوں کی الماری تھی جس میں کتابیں بھری پڑی تھیں ان کے محتاط انتخاب سے ظاہر ہوتا تھا کہ اردو میں جو کچھ لکھا جانا تھا وہ پچیس سال قبل لکھا جا چکا ہے۔

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے،مگر یہ واقعہ ہے کہ جب بھی میں نے کافی کے بارے میں استصوابِ رائے عامہ کیا اس کا انجام اسی قسم کا ہوا۔شائقین میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔اب میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسکی موسیقی کے بارے میں استفسارِ رائے عامہ کرنا بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔یہ بالکل ایسی ہی بد مذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا (اس کا یہ مطلب نہیں کہ نیک مرد کی عمر اور خوب صورت عورت کی آمدنی دریافت کرنا خطرے سے خالی ہے)زندگی میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو

واقعی کافی سے بیزار تھا۔لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابل التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔

یہ وہی چارپائی ہے جس کی سیڑھی بنا کر سگھڑ بیویاں مکڑی کے جالے اور چلبلے لڑکے چڑیوں کے گھونسلے اتارتے ہیں۔اسی چارپائی کو وقت ضرورت پٹیوں سے بانس باندھ کر اسٹریچر بنا لیتے ہیں......اسی طرح مریض جب کھاٹ سے لگ جائے تو تیماردار مؤخرالذکر کر کے وسط میں بڑا سا سوراخ کر کے اول الذکر کی مشکل آسان کر دیتے ہیں۔اور جب ساون مین اُودی اُودی گھٹائیں اٹھتی ہیں تو ادوان کھول کر لڑکیاں دروازے کی چوکھٹ اور والدین چارپائیوں میں جھولتے ہیں۔

آج کل کھاتے پیتے گھرانوں میں دبلے ہونے کی خواہش ہی ایک ایسی صفت ہے جو سب خوب صورت لڑکیوں میں مشترک ہے۔اس خواہش کی محرک دور جدید کی ایک جمالیاتی دریافت ہے، جس نے تندرستی کو ایک مرض قرار دے کر بدصورتی اور بدہئیتی سے تعبیر کیا۔مردوں کی اتنی بڑی اکثریت کو اس رائے سے اتفاق ہے کہ اس کی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔جہاں یرقان حسن کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہو جائے اور چشمِ بیمار و تنِ لاغر حسن کا معیار بن جائیں، وہاں لڑکیاں اپنے تندرست و توانا جسم سے شرمانے اور بدن چرا کر چلنے لگیں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔یوں سمجھئے کہ حوّا کی جیت کا راز آدم کی کمزوری میں نہیں بلکہ خود اس کی اپنی کمزوری میں مضمر ہے۔

مرزا کرتے وہی ہیں جو ان کا دل چاہے۔لیکن اس کی تاویل عجیب وغریب کرتے ہیں۔صحیح بات کو غلط دلائل سے ثابت کرنے کا یہ ناقابل رشک ملکہ شاذونادر ہی مردوں کے حصے میں آتا ہے۔اب سگرٹ ہی کو لیجئے۔ہمیں کسی کے سگرٹ نہ پینے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن مرزا سگرٹ چھوڑنے کا جو فلسفیانہ جواز ہر بار پیش کوتے ہیں وہ عام آدمی کے دماغ میں بغیر آپریشن کے نہیں گھس سکتا......مہینوں وہ یہ ذہن نشیں کراتے رہے کہ سگرٹ پینے سے گھریلو مسائل پر سوچ بچار کرنے میں مدد ملتی ہے اور جب ہم نے اپنے حالات اور ان کی حجت سے قائل ہو کر سگرٹ شروع کر دی اور اس کے عادی ہو گئے تو انہوں نے چھوڑ دی۔کہنے لگے، بات یہ ہے کہ گھریلو بجٹ کے جن مسائل پر میں سگرٹ پی پی کر غور کیا کرتا تھا، وہ دراصل پیدا ہی کثرت سگرٹ نوشی سے ہوئے تھے۔

اوروں کا حال معلوم نہیں، لیکن اپنا تو یہ نقشہ رہا کہ کھیلنے کھانے کے دن پانی پت کی لڑائیوں کے سن یاد کرنے، اور جوانی دیوانی نپولین کی جنگوں کی تاریخیں رٹنے میں کٹی۔اس کا قلق تمام عمر رہے گا کہ جو راتیں سکھوں کی لڑائیوں کے سن حفظ کرنے میں گزریں، وہ ان کے لطیفوں کی نذر ہو جاتیں تو زندگی سنور جاتی۔محمود غزنوی لائق صدر احترام سہی، لیکن ایک زمانے میں ہمیں اس سے بھی یہ شکایت

رہی کہ سترہ حملوں کے بجائے اگر وہ جی کڑا کر کے ایک ہی بھر پور حملہ کر دیتا تو آنے والی نسلوں کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ پیدا ہی نہ ہوتیں (ہمارا اشارہ مشکلات کی طرف ہے)

بڑا مبارک ہوتا ہے وہ دن، جب کوئی نیا خانساماں گھر میں آئے اور اس سے بھی زیادہ مبارک وہ دن جب وہ چلا جائے! چونکہ ایسے مبارک دن سال میں کئی بار آتے ہیں اور تلخی کام و دہن کی آزمائش کر کے گزر جاتے ہیں، اس لیے اطمینان کا سانس لینا، بقول شاعر، صرف دو ہی موقعوں پر نصیب ہوتا ہے:

اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ بد ذائقہ کھانا پکانے کا ہنر صرف تعلیم یافتہ بیگمات کو آتا ہے۔لیکن ہم اعداد وشمار سے ثابت کر سکتے ہیں کہ پیشہ ور خانساماں اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں۔اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے ہنسنا اور کھانا آتا ہے۔اسی وجہ سے پچھلے سو برس سے یہ فن کوئی ترقی نہیں کر سکے۔ایک دن ہم نے اپنے دوست مرزا عبدالودود بیگ سے شکایتاً کہا کہ اب وہ خانساماں جو ستّر قسم کے پلاؤ پکا سکتے تھے، من حیث الجماعت رفتہ رفتہ ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ جواب میں انہوں نے بالکل الٹی بات کہی۔

عرض کیا'' کچھ بھی ہو۔ میں گھر میں مرغیاں پالنے کا روادار نہیں۔ مرا راسخ عقیدہ ہے کہ ان کا صحیح مقام پیٹ اور پلیٹ ہے اور شاید......''

''اس راسخ عقیدے میں میری طرف سے تپلی کا اضافہ کر لیجئے۔''انہوں نے بات کاٹی۔

پھر عرض کیا'' اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی مرغی عمر طبیعی کو نہیں پہنچ آتی۔آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ ہماری ضیافتوں میں میزبان کے اخلاص و ایثار کا اندازہ مرغیوں اور مہمانوں کی تعداد اور ان کے تناسب سے لگایا جاتا ہے۔''

ہم آج تک کرکٹ نہیں کھیلے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں اس کی برائی کرنے کا حق نہیں۔ اب اگر کسی شخص کو کتے نے نہیں کاٹا، تو کیا اس بدنصیب کو کتّوں کی مذمت کرنے کا حق نہیں پہنچتا؟ ذرا غور کیجئے۔افیم کی برائی صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو افیم نہیں کھاتے۔افیم کھانے کے بعد ہم نے کسی کو افیم کی برائی کرتے نہیں دیکھا......

برائی کرنا تو بڑی بات ہے، ہم نے کچھ بھی تو کرتے نہیں دیکھا۔

انگریزوں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ طبعاً کم گو واقع ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ فقط

کھانے اور دانت اکھڑوانے کے لیے منہ کھولتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر انگلستان کا موسم اتنا واہیات نہ ہوتا تو انگریز بولنا بھی نہ سیکھتے اور انگریزی زبان میں کوئی گالی نہ ہوتی۔کم وبیش یہی حال ہم اہالیانِ کراچی کا ہے۔ میں اپنے شہر کی برائی کرنے میں کوئی بڑائی محسوس نہیں کرتا۔لیکن میرا خیال ہے کہ جو شخص کبھی اپنے شہر کی برائی نہیں کرتا وہ یا تو غیر ملکی جاسوس ہے یا میونسپلٹی کا بڑا افسر! یوں بھی موسم، معشوق اور حکومت کا گلہ ہمیشہ سے ہمارا قومی تفریحی مشغلہ(INDOOR PASTIME) رہا ہے۔ ہر آن بدلتے ہوئے موسم سے جس درجہ شغف ہمیں ہے اس کا اندازہ یوں لگائیے کہ یہاں بہت سے نجومی ہاتھ دیکھ کر آئندہ چوبیس گھنٹوں کے موسم کی پیشین گوئی کرتے ہیں اور الغاروں کماتے ہیں۔

15.3.5 ''چراغ تلے'' کا تجزیہ

''چراغ تلے'' مشتاق احمد یوسفی کا پہلا مجموعہ مضامین ہے جس میں یوسفی کے 12 مضامین شامل ہیں اور مقدمہ بھی شامل کر لیا جائے تو یہ 13 ہو جاتے ہیں۔ یہ مجموعہ 1961ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔اس تصنیف میں جو سب سے دلچسپ اور خاصے کی چیز ہے وہ اس کا مقدمہ ہے جو کہ ''پہلا پتھر'' کے عنوان سے ہے۔اس میں مقدمہ نگاری سے متعلق انگریزی اور اردو کے بعض مقدموں کا ذکر کیا گیا ہے۔جس کے باعث یہ کتاب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔اس میں یوسفی صاحب نے پیشاور مقدمہ نگاروں کی کتاب کی جھوٹی تعریف کرنے کا بیان مضحکہ خیز انداز میں کیا ہے:

> ''مقدمہ خود لکھنا کارِ ثواب ہے اس طرح دوسرے لوگ جھوٹ بولنے سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کسی کتاب کو پڑھ کر قلم اٹھاتا ہے ورنہ ہمارے نقاد عام طور سے کسی کتاب کو اس وقت تک نہیں پڑھتے جب تک انہیں اس پر ''سرکے'' کا شبہ نہ ہو۔''
>
> (چراغ تلے۔مشتاق احمد یوسفی۔ص۔10)

اس مقدمہ میں انہوں نے پہلا وار خود کی ذات پر کیا ہے۔انہوں نے بڑے خلوص اور کشادہ دلی کے ساتھ اپنی ظرافت کو اپنی ہی ذات پر آزمایا ہے۔اپنی ذات کو موضوع بناتے ہوئے بڑی ہی ہنرمندی اور چابکدستی سے کام لیا ہے۔ یوسفی صاحب کی اپنی زندگی کے متعلق مختلف ذیلی عنوانات کے تحت سوالاً جواباً کچھ اس انداز میں اپنا تعارف کرایا ہے۔جیسے: تاریخ پیدائش، نام، خاندان، پہچان، جسامت، پسند، مشاغل، تصانیف، کیا لکھتے ہیں؟ اور کیوں لکھتے ہیں؟ ان تمام جزیات کا اس طرح جواب دیتے ہیں کہ ہر جواب لاجواب کر دیتا ہے۔مزاح پر ان کی مضبوط گرفت ہے جس سے عبارت کہیں بوجھل نہیں معلوم ہوتی اور قاری ان کی حس مزاح کا قائل بھی ہو جاتا ہے۔ان کے مقدموں سے متعلق مظہر احمد رقم طراز ہیں:

> ''صاحب طرز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی تصنیفات کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کی کتابوں کے مقدمے، اتنے دلچسپ اور پر از مزاح ہوتے ہیں کہ جز و کتاب لگتے ہیں۔ان مقدموں میں یوسفی

کتاب کی وجہ تصنیف وتالیف ہی بیان نہیں کرتے بلکہ اپنے اور زمانے کے تعلق سے بڑی معنی خیز اور فکر انگیز باتیں ہنسی ہنسی میں بیان کر جاتے ہیں۔ان مقدموں کی افادیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کئی یونیورسٹیوں کے کورس میں یوسفی کے اصل مضامین کی جگہ یہ مقدمے داخل نصاب ہیں۔''

(مشتاق احمد یوسفی۔ایک مطالعہ۔مظہر احمد۔1996 شبانہ پبلیکیشنز،دہلی۔ص8.)

''پڑیئے اگر بیمار''یوسفی کا نہایت ہی عمدہ مضمون ہے جو طنز و مزاح کا بہترین نمونہ ہے۔یوسفی کو اپنے اردگرد کے ماحول کا اتنا گہرہ مشاہدہ تھا کہ ان کے اس ہنر کی داد دینی پڑتی ہے۔وہ دوستوں کی محفل میں ہنسی مزاق اور طنز و مزاح کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ قاری ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔لیکن اس مزاق کے پس پردہ طنز بھی کارفرما ہوتا ہے جو دیرپا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ہمارے معاشرے میں مریض کی عیادت کو آنے والے،مریض پر کیسے کیسے طنز کرتے ہیں اور مریض کو یہ سب ضبط کرتے ہوئے خوش اخلاقی کا مظاہرہ بھی کرنا ہوتا ہے۔اس کو یوسفی نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن یہ تفصیل سیدھی سادی نہیں ہے بلکہ اس میں بڑے پیچ وخم ہے۔اس میں دوستوں کی مزاج پرسی کے وہ ہولناک طریقے ہیں جو بیمار کو لب گور تک پہنچادیتے ہیں۔جگہ جگہ مبالغے سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن یوسفی نے ان کو اس تحریر میں یوں کھپایا ہے کہ وہ بھی درست معلوم ہوتے ہیں۔عیادت کرنے والوں کا اس تعارف کرواتے ہیں کہ قاری بے جا ہنس پڑتا ہے۔کسی دوست کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان کا آنا فرشتہ موت کا آنا ہے،مگر مجھے یقین ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ اسلام بھی روح قبض کرتے وقت اتنی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے ہوں گے۔''

(چراغ تلے۔مشتاق احمد یوسفی۔ص۔21)

''یادش بخیر''چراغ تلے کا ایک اہم مضمون ہے جس میں یوسفی ان نوجوانوں پر طنز کرتے ہیں جو ہمیشہ اپنے ماضی میں ہی ڈوبے رہتے ہیں اور مستقبل اور حال سے بے خبر اور ناآسودہ ہوتے ہیں۔مضمون کا مجموعی کردار''آغا چاکسوری''ہے جو کہ ماضی پرست ہے۔ان کے نزدیک وقت ماضی میں ہی رک گیا ہے اور اسی دور میں ساری تہذیبی ترقی بھی ہوئی ہے جو کہ حال میں ممکن ہی نہیں اور مستقبل میں تو ان کے ہونے کے کوئی امکانات بھی نہیں ہیں۔ان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ساری ترقی ان کی جوانی کے ساتھ ہی رک گئی ہے۔آئندہ نسل سست اور نکمی ہے جس کے باعث معاشرہ پستی کی جانب گامزن ہو رہا ہے۔وہ زندگی کو پچیس سال پرانی روش پر لے جانے کے خواہش مند ہیں۔وہ پرانی چیزوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں بھلے ہی وہ کام کی ہوں نہ ہوں۔ان کے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے یوسفی لکھتے ہیں:

''دائیں جانب ایک طاقچے میں جو فرش کی بہ نسبت چھت سے زیادہ نزدیک تھا،ایک گراموفون رکھا تھا،جس کی بالانشینی پڑوس میں بچوں کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھی۔ٹھیک اس کے نیچے چیڑ کا ایک لنگڑا اسٹول پڑا تھا،جس پر چڑھ کر آغا چابی دیتے اور چھپن چھری اور بھائی چھیلا پٹیالے والے

کے گھسے گھسائے ریکارڈ (سنن میں کانوں سے زیادہ حافظے سے کام لیتے تھے) اس سے ذرا ہٹ کر برتنوں کی الماری تھی جس میں کتابیں بھری پڑی تھیں ان کے محتاط انتخاب سے ظاہر ہوتا تھا کہ اردو میں جو کچھ لکھا جانا تھا وہ پچیس سال قبل لکھا جا چکا ہے۔''

(چراغ تلے۔مشتاق احمد یوسفی۔ص51-50)

''چارپائی اور کلچر'' مشتاق احمد یوسفی کا نہایت ہی بلند پایہ مضمون ہے جو اردو ادب میں معرکے کی حیثیت رکھتا ہے۔یوسفی نے چارپائی کو استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے جس کے ذریعے ہماری پوری تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا ایسا نقشہ پیش کیا ہے جس میں ہماری روزمرہ کی نشست و برخاست، عام آدمی کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور مختلف رویوں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔انہوں نے ایک معمولی سی شے کے ذریعے زندگی کے بڑے بڑے پیچ و خم سے پردہ اٹھایا ہے۔''چارپائی اور کلچر'' کو فن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس میں واقعات کا بیان اور الفاظ کا الٹ پھیر دونوں کا خوبصورت امتزاج ہے۔کہیں واقعہ کے بیان سے وہ مضمون کو زندہ جاوید بنا دیتے ہیں تو کہیں الفاظ کے الٹ پھیر سے اپنی عبارت میں الگ ہی رنگ بھر دیتے ہیں۔ایک بڑے فنکار کی یہی خاصیت ہے کہ وہ معمولی سی شے کو بھی اپنی قلم کے ذریعے زیر بحث لاتا ہے اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری کے دماغ کے بند دریچے کھل جاتے ہیں۔یوسفی کی انسانی نفسیات سے واقفیت نے ان کی تخلیق کو توانائی بخشی۔انہیں انسانی نفسیات اور جذبات و احساسات کا مکمل اور گہرا شعور تھا۔ان کی نظر ہر بڑے چھوٹے، بوڑھے جوان، عورت مرد سبھی پر تھی۔وہ ہر عمر کے شخص کی نفسیات سے بہ خوبی واقف تھے جس کے باعث ان کے یہاں ہر طرح کے کردار بھی نظر آتے ہیں۔اس مضمون کا ایک مزاحیہ اقتباس پیش نظر ہے:

''یہ وہی چارپائی ہے جس کی سیڑھی بنا کر سگھڑ بیویاں مکڑی کے جالے اور چلبلے لڑکے چڑیوں کے گھونسلے اتارتے ہیں۔اسی چارپائی کو وقت ضرورت پٹیوں سے بانس باندھ کر اسٹریچر بنا لیتے ہیں......اسی طرح مریض جب کھاٹ سے لگ جائے تو تیماردار مؤخرالذکر کر کے وسط میں بڑا سا سوراخ کر کے اول الذکر کی مشکل آسان کر دیتے ہیں۔اور جب ساون مین اُودی اُودی گھٹائیں اٹھتی ہیں تو ادوان کھول کر لڑکیاں دروازے کی چوکھٹ اور والدین چارپائیوں میں جھولتے ہیں۔''

(چراغ تلے۔مشتاق احمد یوسفی۔ص۔104)

''صنف لاغر'' مشتاق احمد یوسفی کا ایک شاہکار مضمون ہے جس کا موضوع، انداز بیان اور اسلوب نگاری دوسرے مضامین سے قدرے مختلف ہے۔اس میں انہوں نے عورتوں کی نفسیات اور ان کے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔یوسفی عورتوں کے جذبات و احساسات اور نفسیات سے بخوبی واقف ہیں خواہ وہ کسی بھی قسم کی عورت ہو۔۔اس مضمون میں انہوں نے عورتوں کے متعدد اقسام کا احاطہ کیا ہے اور ان کا ہر نسوانی کردار اپنے آپ میں لافانی ہے۔ہر دور کی، ہر عمر کی، مختلف شہر کی عورتوں کے متعلق جوان کی معلومات تھی وہ کسی ذخیرے سے کم نہ تھی۔اس میں انہوں نے اچھے خاصے کھاتے، پیتے گھروں کی موٹی عورتوں پر طنز کیا ہے جو فیشن کے طور پر مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر دبلی پتلی دکھنے کے لیے دن رات اپنا وزن کم کرنے میں مشغول رہتی ہیں۔اسی سبب وہ اپنے کھانے پینے میں

احتیاط برتتی ہیں ۔وزن کم کرنے کے اور جو بھی طریقے ہیں اس پر پوری طرح عمل کرتی ہیں ۔ یہاں تک کے وہ بیمار نظر آنے لگتی ہیں ۔اس لیے یوسفی نے ان کو صنف نازک کی جگہ ''صنف لاغر'' مثلاً کمزور دکھنے والی عورت کا نام دیا ہے ۔اقتباس ملاحضہ فرمائیں:

''آج کل کھاتے پیتے گھرانوں میں دبلے ہونے کی خواہش ہی ایک ایسی صفت ہے جو سب خوب صورت لڑکیوں میں مشترک ہے۔اس خواہش کی محرک دورِ جدید کی ایک جمالیاتی دریافت ہے، جس نے تندرستی کو ایک مرض قرار دے کر بدصورتی اور بدہئیتی سے تعبیر کیا۔مردوں کی اتنی بڑی اکثریت کو اس رائے سے اتفاق ہے کہ اس کی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے ۔ جہاں یرقان حسن کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہو جائے اور چشمِ بیمار وتنِ لاغر حسن کا معیار بن جائیں، وہاں لڑکیاں اپنے تندرست وتوانا جسم سے شرمانے اور بدن چرا کر چلنے لگیں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے ۔ یوں سمجھئے کہ حوّا کی جیت کا راز آدم کی کمزوری میں نہیں بلکہ خود اس کی اپنی کمزوری میں مضمر ہے ۔''

(چراغ تلے۔مشتاق احمد یوسفی۔ص۔149)

علاوہ ازیں یوسفی کے ''چراغ تلے'' میں دوسرے بھی مضامین ہیں جو مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں ک۔کافی ،موذی، سنہ، جنون لطیفہ، اور آنا گھر میں مرغیوں کا، کرکٹ ،موسموں کا شہر، کاغزی ہے پیرہن وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو ان کی فکری وفنی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ان کا فن محض تفنن طبع کا سامان نہیں بلکہ اس پر سنجیدگی سے غور وفکر کی جائے تو بڑے ذرخیز نتائج سامنے آتے ہیں ۔یوسفی نے اپنی تحریروں کی شگفتگی، انشاپردازی ،عمدہ اسلوب ،زبان و بیان کے جوہر سے اردو طنز ومزاح نگاری کو وہ بلندی عطا کی جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

15.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

- مشتاق احمد یوسفی کے حالات زندگی اور ادبی خدمات سے متعلق جانکاری حاصل کی۔
- مشتاق احمد یوسفی کی طنز ومزاح نگاری کی خصوصیات سے واقفیت حاصل کی ۔
- مشتاق احمد یوسفی کی تصنیف ''چراغ تلے'' کا جائزہ لیا۔
- مشتاق احمد یوسفی کی اسلوب نگاری کے متعلق معلومات حاصل کی ۔
- اردو ادب میں مشتاق احمد یوسفی کی اہمیت کو سمجھا۔

15.5 اپنا امتحان خود لیجیے

سوال:1۔ مشتاق احمد یوسفی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیے؟

سوال:2۔ مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ لیجیے؟

سوال:3 ۔ مشتاق احمد یوسفی کی طنز ومزاح نگاری کی خصوصیات بیان کیجئے ؟

سوال:4۔ مشتاق احمد یوسفی کی تصنیف ''چراغ تلے'' کامختصر تجزیہ پیش کیجئے؟

سوال:5۔ مشتاق احمد یوسفی کے زبان وبیان پر روشنی ڈالئے؟

15.6 سوالات کے جوابات

جواب1۔ مشتاق احمد یوسفی کی پیدائش 4 ستمبر 1923ء کو ہندوستان کے شہر جے پور، ٹونک، راجستھان کے ایک تعلیم یافتہ خاندان میں ہوئی۔ان کے والد کا نام عبدالکریم خان یوسفی تھا جو جے پور بلدیہ کے صدر نشین تھے اور بعد میں جے پور قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر مقرر ہوئے۔مشتاق احمد یوسفی نے راجپوتانہ میں اپنی ابتدائی تعلیم پوری کی اور بی اے کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد آگرہ یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کیا اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔بلا کے ذہین تھے۔مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا۔تقسیم ہند کے بعد ان کا خاندان پاکستان کے کراچی میں جا بسا۔قیام پاکستان کے بعد سنہ 1950ء میں وہ مسلم کمرشیل بینک (ایم سی بی بینک لمیٹڈ) سے متعلق ہوئے اور ڈپٹی جنرل مینیجر کے عہدے کو سرفراز کیا۔1965ء میں الائڈ بینک لمیٹڈ میں بحیثیت مینیجنگ ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔1974ء میں یونائٹیڈ بینک کے صدر اور 1977ء میں پاکستان بینکنگ کونسل کے صدر منتخب ہوئے۔بینکاری کے شعبہ میں انہوں نے غیر معمولی خدمات انجام دیں جن پر انہیں قائداعظم میموریل تمغا عطا کیا گیا۔

جواب2۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنے کیریئر کا آغاز بینکر کی حیثیت سے کیا۔بعدازاں انہوں نے اردو میں طنزومزاح نگاری کی جانب رجوع کیا اور اس میدان میں نمایاں مقام حاصل کیا۔مشتاق احمد یوسفی کی پہلی کتاب ''چراغ تلے'' 1961ء میں شائع ہوئی، دوسری ''خاکم بدہن'' 1970ء میں، تیسری ''زرگزشت'' 1976ء میں اور آخری شاہکار ''آب گم'' 1990ء میں شائع ہوئی۔اپنی ان تصانیف میں مشتاق احمد یوسفی نے طنز وظرافت کے جو اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔ان کی تمام تصانیف میں ان کی شخصیت کی وہ جھلک ملتی ہے جس کو سمجھ پانا عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

2014ء میں ان کی ایک اور کتاب ''شام شعر یاراں'' کے عنوان سے منظرعام پر آئی جو ان کی متفرق تحریروں کو جہاں تہاں سے جمع کر کے مرتب کر لی گئی تھی۔جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ان کے مداحوں کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ یہ ان کی پہلی کتابوں کی طرح طنزومزاح کی کسوٹی پر کھری نہیں اتری۔اس کتاب میں وہ شگفتگی اور عمدہ اسلوب نہیں تھے جو ان کی گزشتہ تصنیف میں دیکھا گیا تھا۔

مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صدر پاکستان کے ہاتھوں انہیں کئی اعزازات دیے گئے۔1999ء میں صدر پاکستان کے ہاتھوں 'ستارۂ امتیاز' ملا۔2002ء میں پھر صدر پاکستان کے ہاتھوں 'ہلال امتیاز' ملا۔1990ء میں پاکستان اکیڈمی برائے خطوط سب سے بہترین کتاب کے لیے ملا۔اسی طرح انہیں قائداعظم، ہجرہ انعام اور آدم جی انعام سے بھی سرفراز کیا گیا۔

جواب3۔ مشتاق احمد یوسفی کا شمار ایسے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے فن کو زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں سے اس

طرح ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر طرف شگفتگی ہی شگفتگی نظر آتی ہے۔مزاح نگاری مشتاق احمد یوسفی کی خاص جولاں گاہ ہے۔ یہ طنز نگاری سے کہیں زیادہ نازک شئے ہے اور اس کے لیے اعلیٰ ظرفی ،فراخ دلی ، بلند حوصلہ اور ہمدردانہ نقطہ نظر کی ضرورت ہے۔ یہ صلاحیت بس اسی میں موجود ہو سکتی ہے جو زندگی کی خامیوں اور ناہمواریوں سے مایوس نہ ہو کر اس پر خوش دلی سے ہنسنے کی ہمت رکھتا ہو اور جھنجھلاہٹ کے بجائے انہیں فلسفیانہ نقطے نظر سے دیکھنے کا ہنر رکھتا ہو۔

مشتاق احمد یوسفی اپنی تخلیقات میں اول سے آخر تک لوگوں سے ہمدردانہ رویہ قائم رکھتے ہیں۔اس سے بڑھ کر ایک فن کار کی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ سخت سے سخت موضوع پر جھنجھلاہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ ان پر مسکرا دینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔اس طرح سے وہ زندگی کو نئے زاویہ سے دیکھتا بھی ہے اور قاری کو بھی دکھاتا ہے۔لیکن مزاح نگاری کا مقصد محض ہنسنے ہنسانے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ ایک سنجیدہ عمل کارفرما ہے۔ ہر زمانے میں ایک کامیاب ادب تخلیق کرنا ایک ومہ ادیب کی ذمہ داری ہوتی ہے۔اگر مزاحیہ ادب کی روایت کو بھی دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مزاح نگاری نے وقت کی آواز بن کر سچا کردار ادا کیا ہے۔جس میں معاشرے کی ناہمواریوں کے پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔یوسفی صاحب نے اس فن کو بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔

جواب4۔''چراغ تلے'' مشتاق احمد یوسفی کا پہلا مجموعہ مضامین ہے جس میں یوسفی کے 12 مضامین شامل ہیں اور مقدمہ بھی شامل کر لیا جائے تو یہ 13 ہو جاتے ہیں۔ یہ مجموعہ 1961ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔اس تصنیف میں جو سب سے دلچسپ اور خاصے کی چیز ہے وہ اس کا مقدمہ ہے جو کہ ''پہلا پتھر'' کے عنوان سے ہے۔اس میں مقدمہ نگاری سے متعلق انگریزی اور اردو کے بعض مقدموں کا ذکر کیا گیا ہے۔جس کے باعث یہ کتاب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔''پڑیئے اگر بیمار'' یوسفی کا نہایت ہی عمدہ مضمون ہے جو طنز و مزاح کا بہترین نمونہ ہے۔ یوسفی کو اپنے اردگرد کے ماحول کا اتنا گہرہ مشاہدہ تھا کہ ان کے اس ہنر کی داد دینی پڑتی ہے۔وہ دوستوں کی محفل میں ہنسی مزاق اور طنز و مزاح کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ قاری ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔لیکن اس مزاق کے پس پردہ طنز بھی کارفرما ہوتا ہے جو دیرپا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مریض کی عیادت کو آنے والے ،مریض پر کیسے کیسے طنز کرتے ہیں اور مریض کو یہ سب ضبط کرتے ہوئے خوش اخلاقی کا مظاہرہ بھی کرنا ہوتا ہے۔'یادش بخیر'' چراغ تلے کا ایک اہم مضمون ہے جس میں یوسفی ان نوجوانوں پر طنز کرتے ہیں جو ہمیشہ اپنے ماضی میں ہی ڈوبے رہتے ہیں اور مستقبل اور حال سے بے خبر اور ناآسودہ ہوتے ہیں۔مضمون کا مجموعی کردار'' آغا چاکسوری'' ہے جو کہ ماضی پرست ہے۔ان کے نزدیک وقت ماضی میں ہی رک گیا ہے اور اسی دور میں ساری تہذیبی ترقی بھی ہوئی ہے جو کہ حال میں ممکن ہی نہیں اور مستقبل میں تو ان کے ہونے کے کوئی امکانات بھی نہیں ہیں۔''چارپائی اور کلچر'' مشتاق احمد یوسفی کا نہایت ہی بلند پایہ مضمون ہے جو اردو ادب میں معرکے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوسفی نے چارپائی کو استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے جس کے ذریعے ہماری پوری تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا ایسا نقشہ پیش کیا ہے جس مین ہماری روزمرہ کی نشست و برخاست، عام آدمی کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور مختلف رویوں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔''صنف لاغر'' مشتاق احمد

یوسفی کا ایک شاہکار مضمون ہے جس کا موضوع، انداز بیان اور اسلوب نگاری دوسرے مضامین سے قدرے مختلف ہے۔ اس میں انہوں نے عورتوں کی نفسیات اور ان کے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ یوسفی عورتوں کے جذبات واحساسات اور نفسیات سے بخوبی واقف ہیں خواہ وہ کسی بھی قسم کی عورت ہو۔ علاوہ ازیں یوسفی کے ''چراغ تلے'' میں دوسرے بھی مضامین ہیں جو مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ کافی، موذی، سنہ، جنون لطیفہ، اور آنا گھر میں مرغیوں کا، کرکٹ، موسموں کا شہر، کاغزی ہے پیرہن وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو ان کی فکری وفنی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

جواب 5۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنی کتابوں میں بے شمار ایسے جملے لکھے ہیں جو ضرب المثل بن گئے ہیں۔ لوگ ان کو اقوال زریں کی طرح پھیلاتے ہیں۔ انہوں نے طنز ومزاح کو شیر وشکر کر کے پیش کیا ہے۔ مزاح میں اگر طنز کی تھوڑی سی تلخی شامل نہ ہو تو صرف مٹھاس رہ جاتی ہے۔ جو وقت گزاری کا تو اچھا ذریعہ ہے لیکن اس سے کوئی بڑا کام نہیں لیا جا سکتا اور وہ بے مقصد ادب کہلاتا ہے۔ یوسفی صاحب بھی مزاح میں طنز کے نشتر چلاتے ہیں جو معیوب نہیں معلوم ہوتے بلکہ اس سے عبارت کا لطف دوگنہ ہو جاتا ہے۔ اپنی تخلیق کو اور بھی لطف اندوز بنانے کے لیے انہوں نے خالص ادبی اسلوب کا استعمال کیا۔ ان کے یہاں ہر بات کہنے کا اپنا سلیقہ ہے۔ یوسفی صاحب بڑے نستعلیق آدمی تھے اور اپنی تخلیق میں زبان کے رکھ رکھاؤ اور اسلوب کو موضوع کی مناسبت سے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ ذکر کیا ہے کہ وہ پیدائشی مصنف نہیں ہیں اور اردو ان کی مادری زبان بھی نہیں ہے۔ انہوں نے اردو سیکھنے کے لیے کافی محنت کی تھی۔

15.7 فرہنگ

لفظ	:	معنی
مضحکہ	:	ہنسی، تمسخر، مسخرہ
گزشتہ	:	گزرا ہوا، بیتا ہوا
فراخ	:	وسیع، کشادہ، بڑا
شیر وشکر	:	دودھ اور شکر کی طرح ملا ہوا
بالیدگی	:	افزائش، روئیدگی
پیروڈی	:	کسی مصنف کی عبارت، نظم یا اسلوب بیان وغیرہ کی مضحک نقل
مسخ	:	اچھی صورت سے بری صورت ہو جانا
نستعلیق	:	مہذب، متین
مشاہدہ	:	دیکھنا، معائنہ
عیادت	:	بیمار پرسی، بیمار کی خبر پوچھنا
امتزاج	:	ملاوٹ، آمیزش، ہم آہنگی

لاغر : دبلا پتلا، نزار

15.8 کتب برائے مطالعہ

- زرگزشت۔مشتاق احمد یوسفی۔2000 ۔راہی کتاب گھر، دہلی
- آب گم۔مشتاق احمد یوسفی۔1990 ۔حسامی بک ڈپو، حیدرآباد
- چراغ تلے۔مشتاق احمد یوسفی۔1973 ۔ادبی دنیا اردو بازار، دہلی
- خاکم بدہن۔مشتاق احمد یوسفی۔1997۔کتاب والا، دہلی
- شام شعر یاراں۔مشتاق احمد یوسفی۔2014 ۔جہانگیر بکس، لاہور
- مشتاق احمد یوسفی۔ایک مطالعہ۔مظہر احمد۔1996۔شبانہ پبلیکیشنز، دہلی
- مشتاق احمد یوسفی کی ادبی خدمات۔ڈاکٹر محمد طاہر۔2003۔شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ

اکائی 16: اردو نظم میں طنز و مزاح کی روایت: اکبر الہ آبادی کے خصوصی حوالے سے

ساخت

16.1 اغراض و مقاصد

16.2 تمہید

16.3 اکبر الہ آبادی: مختصر سوانحی احوال و کوائف

16.4 اردو نظم میں طنز و مزاح کی روایت

16.5 اکبر الہ آبادی کی شاعری میں طنز و مزاح

16.6 آپ نے کیا سیکھا

16.7 اپنا امتحان خود لیجیے

16.8 سوالات کے جوابات

16.9 فرہنگ

16.10 کتب برائے مطالعہ

16.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

☆ طنز و مزاح کی تعریف جانیں گے۔

☆ اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت کے متعلق جانیں گے۔

☆ اکبر الہ آبادی کی شاعری میں طنز و مزاح کا جائزہ لیں گے۔

16.2 تمہید

کلاسیکی اردو شاعری سنجیدہ، نیم سنجیدہ، طنزیہ، مزاحیہ یا دانش و حکمت پر مبنی اشعار کا ایک نگار خانہ ہے۔ اس میں موضوع کی کثرت کے ساتھ لہجے اور لسانی ہنر مندی کا ہر روپ اور ہر رنگ موجود ہے۔ اس لئے اپنے کلاسیکی شعری سرمایے کی بازیافت سے ہمیں ہر طرح کے اسالیب کے اظہار کا سراغ مل سکتا ہے۔ مگر اس شعری سرمایے کی کلیت بسا اوقات اس لئے مشتبہ محسوس کی گئی کہ ہمارے تذکرہ نگاروں نے اپنے تاثراتی تنقیدی آرا کے ذریعہ کچھ ایسی استناد سازی کی کوشش کی تھی جس کے باعث قدرے غیر سنجیدہ اور تفنن طبع پر مبنی ہلکی پھلکی شاعری کو سند اعتبار سے ساقط قرار دیے جانے پر زور دیا۔ عام سماجی اور ثقافتی موضوعات اور عوامی انداز بیان اور اسالیب اظہار پر سوقیت سے لے کر ابتذال تک کے الزامات عائد کئے گئے۔ تاہم یہ بات کچھ کم غنیمت نہ تھی کہ اہم اور مستند شعراء کا شعری سرمایہ کبھی

اس حد تک نظر انداز نہیں کیا گیا کہ اس کی اشاعت میں تسلسل باقی نہ رہتا۔ اتفاق یہ تھا کہ تذکروں کی اس نوع کی تنقیدی رائے زنی کو ادبی تاریخ نویسوں یا قدیم نقادوں نے اگر مسترد نہیں کیا تو اسے پوری طرح قبول بھی نہیں کیا۔ اس پس منظر کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن کلاسیکی اصناف شاعری کی توسیع کا سلسلہ جاری رہا وہ بڑی حد تک غزل کی روایت یا پھر جزوی طور پر قصیدے، مرثیے اور مثنوی کی روایت تھی۔ قصیدے کی صنف میں سوائے تشبیب کے دوسرے تمام اجزا کو تقریباً بھلا دیا گیا۔ مرثیہ بڑی حد تک مذہبی حوالوں کے سبب اور کسی حد تک فنی صنعت گری کے باعث زندہ رہی اور مثنویوں میں سے محض معدودے چند کو یاد رکھا گیا اور بیش تر پر روایتی بیانیہ اور سپاٹ پن کا اعتراض عائد کیا گیا۔ ہمارے کلاسیکی شعری سرمایے کے استحکام میں سب سے پہلے امیر خسرو اور ان کے بعد میر جعفری زٹلی، سودا، قائم، حاتم، جرأت اور نظیر اکبر آبادی کے طنزیہ و مزاحیہ انداز تکلم کو ہر زمانے کی تنقید نے اگر چہ پوری طرح مسترد نہیں کیا تو اس کی بازیافت کی کوشش بھی برائے نام ہی کی گئی۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ کچھ تو ترقی پسند تحریک کی غیر طبقاتی درجہ بندی کے باعث اور اس کے بعد نئی تھیوری کے زیر اثر سماجی اور ثقافتی شعور کی اہمیت کے سبب اپنے پورے شعری سرمایے کی قدر و قیمت کے نئے سرے سے متعین کرنے کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ جس کے باعث اس میدان میں کئی نام ابھر کر سامنے آئے جن ایک بڑا نام اکبرالہ آبادی کا ہے۔ اس اکائی میں ہم ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا خصوصاً مطالعہ کریں گے۔

16.3 اکبرالہ آبادی: مختصر سوانحی تعارف

اردو ادب کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں جن شعرا کا شمار ہوتا ہے ان میں اکبرالہ آبادی سرفہرست ہیں۔ ان کا اصل نام سید اکبر حسین رضوی تھا۔ شاعری میں انھوں نے اکبر تخلص اختیار کیا اور اسی نام سے شعر و ادب کی دنیا میں مشہور ہوئے۔ ان کی ولادت ۱۶/ نومبر ۱۸۴۶ کو ضلع الہ آباد کے قصبہ بارہ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید تفضّل حسین تھا جو تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے۔ دادا کا نام سید فضل محمد تھا۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ آگے کی تعلیم کے لیے انھیں مکتب میں داخل کیا گیا۔ اکبر نے مزید تعلیم کے لیے اکبر نے جمنا مشن اسکول الہ آباد میں داخلہ لیا لیکن کچھ گھریلو حالات اور مالی مسائل کی بنا پر وہ اپنی تعلیم زیادہ دنوں تک جاری نہ رکھ سکے اور ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یوں تو وہ باقاعدہ طور پر اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر انھوں نے اپنے ذاتی مطالعے سے مختلف علوم و فنون میں خاصی استعدا پیدا کر لی۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگریزی کے علاوہ فلسفہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور ان میں غیر معمولی قابلیت پیدا کی۔ ان کا گھرانا علمی و مذہبی تھا جس کا گہرا اثر ان کی شخصیت پر پڑا۔ بچپن سے ہی مجلسوں میں شرکت کی وجہ سے ان کے اندر مذہب سے والہانہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے والد ایک صوفی منش شخص تھے جو عربی و فارسی کے ساتھ ہی علم ریاضی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے اکبر کو بھی علم ریاضی کی تعلیم دی اور انھیں اس کا ماہر بنا دیا۔ پڑھائی کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد انھوں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ کم عمری میں ہی معاشی فکر لاحق ہوئی۔ لہٰذا انھوں نے یکے بعد دیگرے چھوٹی بڑی ملازمت اختیار کی اور آخر میں جج کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ اکبر کی جوڈیشری خدمات کے عوض ۱۸۹۸ء میں انھیں خان بہادر کا خطاب ملا۔ شعر و ادب کی خدمات کے لیے انھیں لسان العصر کے لقب سے نوازا گیا۔

اکبر نے گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور بیشتر نوآموز شعرا کی طرح اکبر نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔

ان کی شاعری کے استاد غلام حسین وحید الہ آبادی تھے جن سے وہ اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ انھوں نے ابتدا میں سنجیدہ کلام کہنا شروع کیا لیکن رفتہ رفتہ وہ طنز ومزاح کی طرف مائل ہونے لگے اور اسی میدان میں انھیں شہرت ملی جو آج ان کی شناخت بن گئی ہے۔ حالاں کہ یہ کہنا شاید درست نہ ہوگا کہ وہ محض طنز ومزاح کے شاعر ہیں کیوں کہ انھوں نے بہت ہی سنجیدہ اور فکر آمیز باتیں کی ہیں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس کے لیے انھوں نے جو پیرایہ بیان استعمال کیا ہے وہ طنز ومزاح کا ہے۔

اکبرالہ آبادی نے ملازمت اور زندگی کی دیگر مصروفیات کے باوجود شعروادب کی بھی آبیاری کی۔ اور اردو زبان کی گراں قدر خدمات انجام دیں جو کتابی شکل میں شائع ہوکر منظر عام پر آئیں، جن میں کلیات اکبرالہ آبادی اوران کے خطوط کے مجموعوں میں مکتوب اکبر، خطوط مشاہیر اور رقعات اکبر ہیں۔ ان کی کچھ مشہور نظموں میں ''مدرسہ علی گڑھ، ایک مس سیمیں بدن، دریا کی روانی، مستقبل، دعائے کلو، فرضی لطیفہ، گاندھی نامہ، تعلیم نسواں، برق کلیسا، جلوۂ دربار دہلی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اردو شعروادب کے اس خادم نے ۱۵ر فروری ۱۹۲۱ء کو اپنی زندگی کی آخری سانس لی جہاں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔

16.4 اردو نظم میں طنز ومزاح کی روایت

طنز کو Satire کے معنوں میں استعمال کیا جائے یا ہجو ملیح اور آئرنی کے معنوں میں، دونوں کے لئے مقصدیت اور اصلاح کی خواہش لازمی عناصر ہیں۔ اگر طنز وظرافت میں مقصدیت کا فقدان ہو تو وہ محض تضحیک، تمسخر اور پھکڑ پن بن کر رہ جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ایک جگہ پتے کی بات لکھی ہے کہ ' کلاسیکی اردو شاعری کی ایک انفرادیت یہ بھی تھی کہ ہم اس سے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ طنز ومزاح کو بھی نہایت لطیف اور مہذب پیرایے کے وسیلے سے ادب عالیہ کا حصہ کیوں کر بنایا جاسکتا ہے۔' طنز ومزاح کے متعلق پروفیسر آفاق حسین صدیقی لکھتے ہیں:

> ''طنز ومزاح ایک ایسے ردعمل کا ادبی اظہار ہے جو برق سے شمع ماتم خانہ روشن کرنے کی جبلت کے تحت حیات انسانی کے مضحکہ خیز مظاہر اور المناک پہلوؤں کو خندہ جبینی اور دردمندی کے ساتھ قبول کرنے پر پیدا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر طنز ومزاح آنسوؤں کے کہر میں ڈوبی ہوئی دنیا، مصلحتوں اور مصالحتوں میں گرفتار معاشرے، شب وروز نت نئے حملوں کا شکار تہذیبی قدروں اور زندگی میں پھیلی ہوئی بوالعجبیوں، تلخ حقیقتوں، بے رحم سچائیوں اور اذیت ناک دکھوں کو زندہ دلی سے قابل قبول اور دلچسپ بنا کر پیش کرنے کا فن ہے۔''

(''اردو طنز ومزاح: فن اور روایت''، پروفیسر آفاق حسین صدیقی مشمولہ: اردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت، مرتبہ: ڈاکٹر خالد محمود، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۵، ص: ۳۰)

اردو کے قدیم اساتذۂ شعر کو روایت کے طور پر فارسی کے نمائندہ شعرا مثلاً حافظ، انوری یا سعدی کے شعری نمونے ملے تھے۔ اس روایت میں طنز وظرافت کے بعض ایسے نمونے بھی موجود تھے۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبری کنند

چوں به خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

اے کبک خوش خرام کجا می روی به ناز
غره مشو که گربب عاجز نماز کرد۔
(حافظ)

یا بقول سعدی:۔

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
که یاراں فراموش کردند عشق

تو اس پس منظر میں ہمیں اپنے کلاسیکی شاعروں کا یہ لب ولہجہ بہت چونکانے والا نہیں لگتا۔

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا، رات کو تھا میخانے میں
جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی مستی میں انعام کیا
(میر)

تقوٰی کا اس کے موسم گل نے کیا یہ رنگ
زاہد کو خانقاہ سے مے خانہ لے گیا
(سودا)

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل
(میر حسن)

اس روایت کی حامل شاعری میں وسیع المشر بی، لہجے کے تنوع اور رنگا رنگی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس رنگا رنگی میں طنز کے عنصر نے عالمی تنقید کے معاصر منظر نامے کے سبب بھی بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔نئی انگریزی تنقید میں طنز اور پیراڈوکس کو قریب قریب علامتوں جیسی اہمیت حاصل ہے۔جس طرح علامت سے اس کی مناسبات کے وسیلے سے معنویت کا استخراج کیا جا سکتا ہے کم و بیش، طنز اور پیراڈوکس میں تضاد اور تناقض کی بنیاد پر معنوی تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔کلاسیکی شاعری کی ہجو نگاری کو ہم آج کی طنزیہ شاعری کے نعم البدل کا نام دے سکتے ہیں۔یوں تو تنقیدی نظریے آتے اور جاتے رہتے ہیں۔مگر طنز و مزاح کا کوئی اسلوب اگر فنی ہنر مندی کے باعث معنوی امکانات کی غمازی کرتا ہے تو اس کی قدر و قیمت کو نئے سیاق و سباق میں متعین کرنے کی ضرورت سے نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔

ہماری کلاسیکی شاعری میں جعفر زٹلی ایک معتوب شاعر رہے ہیں مگر ان کی سادہ، عام فہم اور ہلکی پھلکی نظموں میں بیانیہ شاعری

کے شانہ بہ شانہ شعری بیانیوں کی افراط ملتی ہے۔ ان کا ایک قطعہ 'در بیان نوکری' ہے۔ جن کے بعض اشعار دیکھئے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی ردیف 'یہ نوکری کا خط ہے' سے ہر جگہ نوکری سے بد خط ہونے کے مفہوم مخالف کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ طنز کے ذریعہ مفہوم مخالف کا استخراج دراصل معکوس علامتی طریق کار کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر روز اُٹھ مجرا کریں، در کار اک سو گر پڑیں
بے شرم ایسے لڑ پڑیں، یہ نوکری کا خط ہے

صاحب عجب بیداد ہے، محنت ہمہ برباد ہے
اے دوستاں فریاد ہے، یہ نوکری کا حظ ہے

ہم نام کو اسوار ہیں، روزگار سیں بیزار ہیں۔
یارو ہمیشہ خوار ہیں، یہ نوکری کا حظ ہے

ان تمام شعروں میں استفہام انکاری کی منطق سے کام لے کر طنز کی تخلیق کی گئی ہے۔ کم وبیش یہی انداز اور یہی ثقافتی متن سازی ہمیں ظہور الدین حاتم کے یہاں بھی ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

تو کھول چشم دل اور دیکھ قدرتِ حق یار
کہ جن نے ارض و سما، اور کیا ہے لیل و نہار
نہ کھو تو عمر کو غفلت میں ٹک تو ہوشیار
کہ دور بارہ صدی کا ہے سخت کج رفتار
جہاں کے باغ میں یکساں ہے اب خزاں و بہار

حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے
جو چور تھے سو ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے
جو زیردست تھے سوان دنوں میں زور ہوئے
جنہوں کو زور تھا سو اب مثال مور ہوئے

زٹلی اور انشا اللہ خان انشاء کے کلام کے متوازی اگر نظیر اکبرآبادی کی نظموں کو رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر کے کلام میں ظاہری بیانیہ کی تہہ میں اجتماع النقیضین اور پیراڈوکس کی کچھ ایسی شدت موجود ہے کہ کائنات میں موجود تناقضات اور تضادات اپنی داخلی جدلیات کے ذریعہ ایک تہہ نشین، عبرت خیز اور تحیر آمیز صورت حال کو بھی ہم پر منکشف کرتے رہتے ہیں۔

طنزیہ اور مزاحیہ موضوعات میں ندرت اور طباعی اور ان کے بیان میں اسالیب کا تنوع اگر ایک جگہ کسی ایک شاعر کی ہجویات اور شہر آشوب میں تلاش کیا جا سکتا ہے تو وہ مرزا محمد رفیع سودا ہیں۔ بعض نقادوں نے سودا کے یہاں ذاتی پرخاش پر مبنی نظموں سے انکار کیا ہے مگر میر ضاحک، ندرت کاشمیری اور مولوی سجاد جیسے شرفاء پر ان کی نظمیں اس کی تردید کرتی ہیں۔ تاہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کی اس نوع کی شخصی ہجویں بھی تعمیمی صورت حال میں بدل جاتی ہیں۔ اس طرح ان کے یہاں اشخاص بھی علی العموم سماج کے نمائندے بن کر اُبھرتے ہیں۔ ویسے اشخاص سے متعلق چند نظموں سے الگ سودا کا غالب ہجویہ لہجہ درحقیقت ثقافتی ادبار کا منظر نامہ کچھ ایسے محاکاتی انداز میں پیش کرتا ہے کہ ظاہری طنز اور تضحیک میں بھی شعور کی ایسی بلوغت ملتی ہے جو حسن و قبح یا خیر و شر یا بہ الفاظ دگر اقدار کے شدید بحران کے ردعمل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

16.5 اکبر الہ آبادی کی شاعری میں طنز و مزاح

اردو ادب میں جہاں سنجیدہ شاعری کی فراوانی ہے وہاں مزاحیہ شاعری آٹے میں نمک کے برابر نظر آتی ہے۔ اعلیٰ اور معیاری مزاحیہ شاعری مہذب صنف کی حیثیت سے طویل عرصے تک اردو ادب میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہی ہے۔ سید ضمیر جعفری نے اس حقیقت کا ادراک کچھ یوں کیا ہے: ''اس ادبی فقدان کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ اعلی درجے کا مزاح تخلیق کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ دوسری یہ کہ اس صنف سخن کو قابل لحاظ شعراء نے چنداں لائق توجہ نہیں سمجھا۔'' اس حقیقت کے باوجود اردو ادب میں مزاح کے حوالے سے جو کچھ بھی دستیاب ہے وہ قاری کے دل کو فرحت اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ انس، محبت، نفس الامری اور اپنائیت بھی عطا کرتا ہے۔ اردو ادب میں مزاحیہ شاعری کا آغاز اگر چہ جعفر زٹلی، سودا، نظیر اکبر آبادی اور انشاء سے شروع ہوتا ہے۔ اس فہرست میں ان کے علاوہ بھی کلی اور جزوی طور پر بہت سے نام ور شعراء موجود ہیں جنھوں نے مزاح گوئی کے فن کو فروغ دے کر قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کیا ہے۔ ان میں ایک اہم نام اکبر الہ آبادی کا بھی ہے جن کی دلآویز، رنگین اور روح فرسا شاعری نے ادب کی فضا کو مزاحیہ عطر سے معطر کر دیا۔ انھوں نے اپنے کلام میں مزاحیہ عنصر پیدا کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا۔ اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ انھوں نے اپنے دور کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل پر طنز و مزاح کے جو ظریفانہ نشتر چلائے یہ انھیں کا خاصا ہے۔ اودھ پنچ کے فلیٹ فارم سے اکبر الہ آبادی وہ واحد شاعر تھے جس نے ظرافت کو فن کی حیثیت دے کر اردو ادب کے دامن کو مزاح کے مخصوص کینوس سے نکال کر عام قاری کی ذہنی سطح تک لے آئے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ طنز و مزاح کا ذکر آتے ہی پردۂ ذہن پر ایک نام ابھرتا ہے اور وہ نام اکبر الہ آبادی کا ہے۔ اکبر نے اپنی مصروف ترین زندگی میں سے اردو ادب کے لیے بھی وقت نکالا اور ادب کو بہت کچھ دیا۔ ان کے یہاں موضوعات کی کوئی کمی نہیں لیکن جہاں تک مزاحیہ شاعری کی بات ہے تو ان کی مزاحیہ شاعری ان کے سنجیدہ کلام پر بھاری نظر آتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ بھی ان کی طبیعت کی شوخی اور ظرافت ہے جس سے وہ کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اس بات کی سب سے بڑی دلیل سر سید جیسی بڑی شخصیت کے خلاف محاذ کھولنا بھی ہے۔ اکبر کو انگریز اور انگریز نوازوں سے سخت نفرت تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ 1857 کا ہنگامہ ان کے سامنے گزرا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ کالجوں اور اسکولوں میں انگریزی تعلیم و تربیت کے سخت مخالف تھے جب 1875 میں سر سید نے علی گڑھ اسکول بنایا (جسے دو سال بعد کالج کی حیثیت دی گئی) تو اس پر اکبر نے برملا کہا،

ابتدا کی جناب سید نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پر ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا

ایک جگہ لکھا ہے

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کے چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

اکبر کی مزاحیہ شاعری کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کی آخری دہائی سے ہوا تو یہ سلسلہ پھر ان کی وفات تک جاری رہا۔ یہ وہ دور تھا جس میں آزادی کی تحریک مسلمانوں اور ہندوؤں میں زوروشور سے جاری تھی۔ اس دور میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حالت زار زیادہ دگرگوں تھی۔ سامراجی نظام برصغیر کے سینے پر اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ رہا تھا۔ مسلمانوں کا استحصال، معاشی بحران، مذہب سے دوری، تعلیمی انحطاط، آپس کی نااتفاقی اور سب سے بڑھ کر اخلاقی بے راہ روی وہ مسائل تھے جن سے کوئی ذی فہم انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چہ جائیکہ ایک درددل رکھنے والے شاعر۔ تہذیب مغرب کی اس طوفان میں اکبر بلا جھجک بول اٹھتے ہیں۔

تہذیب مغربی کی بھی ہے وارنش غضب
ہم کیا جناب شیخ بھی چکنے گھڑے ہوئے

اکبر کے ہاں ظریفانہ شاعری کے تقریباً تمام نمونے پائے جاتے ہیں بلکہ ان کی ظرافت نے فن کی خدمت کے ساتھ تعمیری کام بھی سرانجام دیا۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز بیاں سے مغربی ہوا کا رخ موڑنے کی ہر ممکن کوشش کی اور آخری دم تک اس کا برملا اظہار کرتے رہے۔

اسے اکبر کا کمال ہی کہنا چاہیے کہ انھوں نے طنز ومزاح برائے تفریح کے ساتھ طنز ومزاح برائے فن منوایا۔ انھوں نے زندگی کو ہر زاویے سے دیکھا، پرکھا اور اپنے الگ رنگ روپ کا اظہار کیا وہ حادثاتی نہیں بلکہ طبعاً مزاح گو تھے، ساتھ ہی ان کو آس پاس کا ماحول بھی ایسا ملا تھا جو اس قسم کی شاعری کے لیے موزوں تھا چوں کہ ان کا زمانہ مشرق ومغرب کی متضاد تہذیبی قدروں کے ٹکراؤ کا زمانہ تھا، اس صورت حال سے اکبر نے بھرپور استفادہ کیا۔ اکبرالہ آبادی 1857 کے زمانے کی ہولناکیوں میں اگرچہ کم عمر تھے مگر شعوری طور پر سب کچھ ان کے ذہن پر نقش ہو رہا تھا ان کے یہاں جابجا اس سانحے کا ذکر ملتا ہے۔ اکبر اسی زوال پذیر معاشرے کو ایک پرامن اور بقائے باہمی پر یقین رکھنے والے معاشرے کی شکل میں بدلتا دیکھنے کے آرزومند تھے۔ وہ عملی طور پر کم اور فنی وفکری طور پر زیادہ سرگرم عمل تھے اپنے مقصد کے لیے انھوں نے طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے تمام مروجہ حربے اور اصناف یعنی ظرافت، طنز، ہجو، پھبتی، تحریف، لفظی بازیگری اور انگریزی الفاظ کے برمحل استعمال کے ساتھ صنعت تجنیس کا استعمال خوب کیا ہے۔ ان کی نظر میں غضب کی وسعت تھی ان کی

مقبولیت اور بڑائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال اور ظریف لکھنوی جیسے اعلی پائے کے شعرا بھی ان کی ظریفانہ شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور برسوں ان کی تقلید میں طبع آزمائی کرتے رہے۔عورتوں کی بے پردگی سے اکبر الہ آبادی کو سخت نفرت تھی ان کے نزدیک مغربی تہذیب کے اثرات نے عورتوں سے حیا کی چادر چھین لی اور وہ خاتون خانہ کے بجائے رونق محفل بن گئی ہیں۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

ایک جگہ یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

تعلیم کی خرابی سے ہوگئی بالآخر
شوہر پرست بیوی پبلک پسند لیڈی

سر سید اور ان کے رفقا کے خیال میں اگر مسلمانوں نے جدید علوم وفنون نہ سیکھے تو وہ دوسری اقوام کے مقابلے میں پست اور ناکام رہ جائیں گے لیکن دوسری طرف ان کے مخالفین بھی موجود تھے جن میں اکبر سرفہرست تھے۔اس تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اکبر خود انگریزوں کی ملازمت میں رہے بلکہ اپنے بیٹے کو بھی ولایت سے تعلیم دلوائی۔اس کھلے تضاد کی بنیادی وجہ دراصل مغربی تعلیم کی مخالفت نہیں بلکہ نوجوان اور عورتوں کی اخلاقی گراوٹ اور دین سے دوری تھی جن سے اکبر لاتعلق نہ تھے ان کی یہ مخالفت ذاتی نہیں بلکہ قومی خلوص پر مبنی تھی۔ان کا ہدف ملامت اکثر مغرب زدہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔اس حوالے سے ذیل میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم ایسی کُل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ٹرخادیا مغرب ہراک کو مغرب نے پاس کردیا
سید بھی کورے کھسکے برسوں مساس کرکے

طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا مقصد اصلاح ذات اور اصلاح معاشرہ ہوتا ہے۔اس میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ طنز میں جو بات کہی جارہی ہے وہ تھوڑی سی چبھے مگر اس سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔اکبر عورتوں کی تعلیم وتربیت کے مخالف نہیں بلکہ وہ اس مخصوص تربیت سے نفرت کرتے تھے جو انگریزی تعلیم حاصل کرکے عورتیں اپنا لیتی ہیں۔اکبر کی شاعری اپنے دور کی ترجمان ہے اپنی شاعری کو انھوں نے تصنع اور بناوٹ سے نہیں سجایا بلکہ عمومی مضامین سے اپنے کلام کو مزین کیا ان کے یہاں مخصوص الفاظ کی ایک فہرست ہے جن

سے وہ براہ راست اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں ظرافت پیدا کرنے کے لیے جمن،ٹٹو،اونٹ،گائے، ریل گاڑی، بدھو،شیخ، پری،انجمن اور بیبیاں وغیرہ الفاظ استعمال کیے۔اس کے علاوہ انھیں انگریزی الفاظ کا برمحل استعمال خوب آتا تھا۔انگریزی الفاظ کے ذریعہ بھی انھوں نے طنز وظرافت کی فضا قائم کی ہے۔انھوں نے معاشرے کی کمزوریوں کو ابھارا۔انھیں زبان وبیان اوراسلوب کا گہرا شعور تھا۔اسی شعور کے رچاؤ نے ان کی مزاحیہ شاعری میں شان پیدا کی اورانھیں ہر مکتب فکر میں مقبول خاص و عام بنادیا۔اکبرالہ آبادی کی مشہورزمانہ نظم''جلوۂ دربار دہلی'' کے کچھ بند ملاحظہ کیجیے جن میں طنز وظرافت کا حسین امتزاج ہے۔

سر میں شوق کا سودا دیکھا
دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے
گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگین اور بھالے دیکھے
بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا اک جنگل دیکھا
اس جنگل میں منگل دیکھا
برھما اور ورنگل دیکھا
عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا
بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا
دل دربار سے اٹکا دیکھا

گو رقاصۂ اوج فلک تھی

اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی
بزم عشرت صبح تلک تھی

کی ہے یہ بندش ذہن رسا نے
کوئی مانے خواہ نہ مانے
سنتے ہیں ہم تو یہ افسانے
جس نے دیکھا ہو وہ جانے

ایک اور نظم ''مستقبل'' کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں طنز کا پہلو عیاں ہے:

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے

بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیان اور نئے اسباب غم ہوں گے

نہ پیدا ہوگی خط نسخ سے شان ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیب رقم ہوں گے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے

نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے

اکبرکواسلام سے سچی محبت تھی وہ عام مسلمان کے ساتھ ملا کوبھی سچا مسلمان بنانا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ جس انداز سے بھی بات کرتے مذہب ہی کومرکز ومحور خیال کرتے۔اسی لیے تو انھوں نے علی گڑھ کے بجائے ندوۃ العلماء کوزیادہ پسند کیا لیکن اس کے ساتھ مولویوں کی تنگ نظری کوبھی نہیں بخشا۔وہ کہتے ہیں۔

نفس کے تابع ہوئے ایمان رخصت ہو گیا
وہ زمانے میں گھسے ایمان رخصت ہو گیا

لامذہبی سے ہونہیں سکتی فلاح قوم
ہر گز گزرسکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ

موضوعاتی تجزیے سے ہٹ کرا گرفنی اور ہئیتی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہاں بھی ہمیں مختلف النوع تجربات گلشن سخن میں رنگا رنگ پھولوں کی طرح جابجا کھلےنظر آتے ہیں مثال کے طور پر اکبر کے یہاں ہندی اور انگریزی کے الفاظ اور کہیں کہیں فارسی کے الفاظ کے ذریعے اردومزاح کوایک نئے مزاج سے روشناس کرایا گیا ہے۔

لسان العصر اکبرالہ آبادیہ اپنے فکروفن کی کامل حیثیت کے سبب ادبیاتِ اردو کے آسمان پر ایک درخشندہ ستارہ کی طرح موجود ہیں جن کے کلام کی وجہ سے اردومزاحیہ شاعری کومستقل صنف سخن کی حیثیت مل گئی۔ان کے کلام سے ناقدین نے ان کی قادرالکلامی کا اندازہ لگایا ہے۔اکبر کے مزاج کا مطمع نظر اصلاح،تہذیب اور اخلاق ہے۔فارسی کے شاعر سعدی کے بعد کسی شاعر نے یہ کام بایں شائستہ کیا ہے تو وہ اکبر ہے اسی خصوصیت کی وجہ سے اکبر کی شاعری ہر زمانے میں مقبول رہے گی۔

16.6 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

اکبرالہ آبادی کی سوانح حیات اوران کے کارناموں سے واقف ہوئے۔

اردوشاعری میں طنزومزاح کی روایت کو جانا۔

اکبرالہ آبادی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا۔

16.7 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔اکبرالہ آبادی کے حالات زندگی پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

2۔اردو شاعری میں طنز ومزاح کی روایت بیان کیجئے۔

3۔اکبرالہ آبادی کی شاعری میں طنزیہ ومزاحیہ عناصر کی نشاندہی کیجئے۔

16.8 سوالات کے جوابات

جواب1۔ اردو ادب کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں جن شعرا کا شمار ہوتا ہے ان میں اکبرالہ آبادی سرفہرست ہیں۔ان کا اصل نام سید اکبر حسین رضوی تھا۔شاعری میں انھوں نے اکبر تخلص اختیار کیا اور اسی نام سے شعر وادب کی دنیا میں مشہور ہوئے۔ان کی ولادت ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ کو ضلع الہ آباد کے قصبہ بارہ میں ہوئی۔ان کے والد کا نام سید تفضّل حسین تھا جو تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے۔دادا کا نام سید فضل محمد تھا۔اکبر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔آگے کی تعلیم کے لیے انھیں مکتب میں داخل کیا گیا۔اکبر نے مزید تعلیم کے لیے اکبر نے جمنا مشن اسکول الہ آباد میں داخلہ لیا لیکن کچھ گھریلو حالات اور مالی مسائل کی بنا پر وہ اپنی تعلیم زیادہ دنوں تک جاری نہ رکھ سکے اور ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔یوں تو وہ باقاعدہ طور پر اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر انھوں نے اپنے ذاتی مطالعے سے مختلف علوم وفنون میں خاصی استعداد پیدا کر لی۔عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگریزی کے علاوہ فلسفہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور ان میں غیر معمولی قابلیت پیدا کی۔ان کا گھرانا علمی ومذہبی تھا جس کا گہرا اثر ان کی شخصیت پر پڑا۔بچپن سے ہی مجلسوں میں شرکت کی وجہ سے ان کے اندر مذہب سے والہانہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ان کے والد ایک صوفی منش شخص تھے جو عربی وفارسی کے ساتھ ہی علم ریاضی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔انھوں نے اکبر کو بھی علم ریاضی کی تعلیم دی اور انھیں اس کا ماہر بنا دیا۔پڑھائی کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد انھوں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔کم عمری میں ہی معاشی فکر لاحق ہوئی۔لہٰذا انھوں نے یکے بعد دیگرے چھوٹی بڑی ملازمت اختیار کی اور آخر میں جج کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔اکبر کی جوڈیشری خدمات کے عوض ۱۸۹۸ء میں انھیں خان بہادر کا خطاب ملا۔شعر وادب کی خدمات کے لیے انھیں لسان العصر کے لقب سے نوازا گیا۔

اکبر نے گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور بیشتر نوآموز شعرا کی طرح اکبر نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ان کی شاعری کے استاد غلام حسین وحید الہ آبادی تھے جن سے وہ اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔انھوں نے ابتدا میں سنجیدہ کلام کہنا شروع کیا لیکن رفتہ رفتہ وہ طنز ومزاح کی طرف مائل ہونے لگے اور اسی میدان میں انھیں شہرت ملی جو آج ان کی شناخت بن گئی ہے۔حالاں کہ یہ کہنا شاید درست نہ ہوگا کہ وہ محض طنز ومزاح کے شاعر ہیں کیوں کہ انھوں نے بہت ہی سنجیدہ اور فکر آمیز باتیں کی ہیں۔ہاں یہ اور بات ہے کہ اس کے لیے انھوں نے جو پیرایہ بیان استعمال کیا ہے وہ طنز ومزاح کا ہے۔

اکبرالہ آبادی نے ملازمت اور زندگی کی دیگر مصروفیات کے باوجود شعر وادب کی بھی آبیاری کی۔اور اردو زبان کی گراں قدر خدمات انجام دیں جو کتابی شکل میں شائع ہو کر منظر عام پر آئیں، جن میں کلیات اکبرالہ آبادی اور ان کے خطوط کے مجموعوں میں مکتوب

اکبر، خطوط مشاہیر اور رقعات اکبر ہیں۔ ان کی کچھ مشہور نظموں میں ''مدرسہ علی گڑھ، ایک مس سیمیں بدن، دریا کی روانی، مستقبل، دعائے کلو، فرضی لطیفہ، گاندھی نامہ، تعلیم نسواں، برق کلیسا، جلوۂ دربار دہلی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اردو شعر و ادب کے اس خادم نے ۱۵ر فروری ۱۹۲۱ء کو اپنی زندگی کی آخری سانس لی جہاں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔

جواب 2۔ طنز کو Satire کے معنوں میں استعمال کیا جائے یا ہجو ملیح اور آئرنی (Irony) کے معنوں میں، دونوں کے لئے مقصدیت اور اصلاح کی خواہش لازمی عناصر ہیں۔ اگر طنز و ظرافت میں مقصدیت کا فقدان ہو تو وہ محض تضحیک، تمسخر اور پھکڑ پن بن کر رہ جاتا ہے۔ طنز و مزاح کے متعلق پروفیسر آفاق حسین صدیقی لکھتے ہیں:

> ''طنز و مزاح ایک ایسے ردعمل کا ادبی اظہار ہے جو برق سے شمع ماتم خانہ روشن کرنے کی جبلت کے تحت حیات انسانی کے مضحکہ خیز مظاہر اور المناک پہلوؤں کو خندہ جبینی اور دردمندی کے ساتھ قبول کرنے پر پیدا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر طنز و مزاح آنسوؤں کے کہر میں ڈوبی ہوئی دنیا، مصلحتوں اور مصالحتوں میں گرفتار معاشرے، شب و روز نت نئے حملوں کا شکار تہذیبی قدروں اور زندگی میں پھیلی ہوئی بوالعجبیوں، تلخ حقیقتوں، بے رحم سچائیوں اور اذیت ناک دکھوں کو زندہ دلی سے قابل قبول اور دلچسپ بنا کر پیش کرنے کا فن ہے۔''

(''اردو طنز و مزاح: فن اور روایت'' پروفیسر آفاق حسین صدیقی مشمولہ: اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، مرتبہ: ڈاکٹر خالد محمود، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۵، ص: ۳۰)

اردو کے قدیم اساتذہ کے یہاں کے یہاں جہاں ایک طرف سنجیدہ شاعری ملتی ہے وہیں دوسری جانب طنز و ظرافت کے نمونے بھی موجود ہیں۔ اس پس منظر میں ہمیں اپنے کلاسیکی شاعروں کا یہ لب و لہجہ بہت چونکانے والا نہیں لگتا۔

اس روایت کی حامل شاعری میں وسیع المشربی، لہجے کے تنوع اور رنگارنگی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس رنگارنگی میں طنز کے عنصر نے عالمی تنقید کے معاصر منظر نامے کے سبب بھی بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ نئی انگریزی تنقید میں طنز اور پیراڈوکس کو قریب قریب علامتوں جیسی اہمیت حاصل ہے۔ جس طرح علامت سے اس کی مناسبات کے وسیلے سے معنویت کا استخراج کیا جا سکتا ہے کم و بیش، طنز اور پیراڈوکس میں تضاد اور تناقض کی بنیاد پر معنوی تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔ کلاسیکی شاعری کی ہجو نگاری کو ہم آج کی طنزیہ شاعری کے نعم البدل کا نام دے سکتے ہیں۔ یوں تو تنقیدی نظریے آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ مگر طنز و مزاح کا کوئی اسلوب اگر فنی ہنر مندی کے باعث معنوی امکانات کی غمازی کرتا ہے تو اس کی قدر و قیمت کو نئے سیاق و سباق میں متعین کرنے کی ضرورت سے نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔

ہماری کلاسیکی شاعری میں جعفر زٹلی ایک معتوب شاعر رہے ہیں مگر ان کی سادہ، عام فہم اور ہلکی پھلکی نظموں میں بیانیہ شاعری کے شانہ بہ شانہ شعری بیانیوں کی افراط ملتی ہے۔ ان کا ایک قطعہ 'در بیان نوکری' ہے۔ جن کے بعض اشعار دیکھئے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی ردیف 'یہ نوکری کا خط ہے' سے ہر جگہ نوکری سے بد خط ہونے کے مفہوم مخالف کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ طنز کے ذریعہ مفہوم

مخالف کا استخراج دراصل معکوس علامتی طریق کار کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر روز اُٹھ مجرا کریں، در کار اک سو گر پڑیں
بے شرم ایسے لڑ پڑیں، یہ نوکری کا خط ہے

ان تمام شعروں میں استفہام انکاری کی منطق سے کام لے کر طنز کی تخلیق کی گئی ہے۔کم وبیش یہی انداز اور یہی ثقافتی متن سازی ہمیں ظہورالدین حاتم کے یہاں بھی ملتی ہے۔ملاحظہ ہو:

تو کھول چشم دل اور دیکھ قدرتِ حق یار
کہ جن نے ارض و سما، اور کیا ہے لیل و نہار

زٹلی اور انشا اللہ خان انشاء کے کلام کے متوازی اگر نظیر اکبر آبادی کی نظموں کو رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر کے کلام میں ظاہری بیانیہ کی تہہ میں اجتماع النقیضین اور پیراڈوکس کی کچھ ایسی شدت موجود ہے کہ کائنات میں موجود تناقضات اور تضادات اپنی داخلی جدلیات کے ذریعہ ایک تہہ نشین، عبرت خیز اور تحیر آمیز صورت حال کو بھی ہم پر منکشف کرتے رہتے ہیں۔

طنزیہ اور مزاحیہ موضوعات میں ندرت اور طباعی اور ان کے بیان میں اسالیب کا تنوع اگر ایک جگہ کسی ایک شاعر کی ہجویات اور شہر آشوب میں تلاش کیا جاسکتا ہے تو وہ مرزا محمد رفیع سودا ہیں۔بعض نقادوں نے سودا کے یہاں ذاتی پرخاش پر مبنی نظموں سے انکار کیا ہے مگر میر ضاحک، ندرت کاشمیری اور مولوی سجاد جیسے شرفاء پر ان کی نظمیں اس کی تردید کرتی ہیں۔تاہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کی اس نوع کی شخصی ہجویں بھی تعمیمی صورت حال میں بدل جاتی ہیں۔اس طرح ان کے یہاں اشخاص بھی علی العموم سماج کے نمائندے بن کر اُبھرتے ہیں۔ویسے اشخاص سے متعلق چند نظموں سے الگ سودا کا غالب ہجویہ لہجہ درحقیقت ثقافتی ادبار کا منظر نامہ کچھ ایسے محاکاتی انداز میں پیش کرتا ہے کہ ظاہری طنز اور تضحیک میں بھی شعور کی ایسی بلوغت ملتی ہے جو حسن وقبح یا خیر وشر یا بہ الفاظ دگر اقدار کے شدید بحران کے ردعمل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

جواب3۔ اردو ادب میں مزاحیہ شاعری کا آغاز اگرچہ جعفر زٹلی،، سودا، نظیر اکبر آبادی اور انشاء سے شروع ہوتا ہے۔اس فہرست میں ان کے علاوہ بھی کلی اور جزوی طور پر بہت سے نام ورشعراء موجود ہیں جنھوں نے مزاح گوئی کے فن کو فروغ دے کر قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کیا ہے۔ان میں ایک اہم نام اکبرالہ آبادی کا بھی ہے جن کی دلآویز، رنگین اور روح فرسا شاعری نے ادب کی فضا کو مزاحیہ عطر سے معطر کردیا۔انھوں نے اپنے کلام میں مزاحیہ عنصر پیدا کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا۔اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔انھوں نے اپنے دور کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل پر طنز ومزاح کے جو ظریفانہ نشتر چلائے یہ انھیں کا خاصا ہے۔اودھ پنچ کے فلیٹ فارم سے اکبرالہ آبادی وہ واحد شاعر تھے جس نے ظرافت کو فن کی حیثیت دے کر اردو ادب کے دامن کو مزاح کے مخصوص کینوس سے نکال کر عام قاری کی ذہنی سطح تک لے آئے۔یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ طنز ومزاح کا ذکر آتے ہی پردۂ ذہن پر ایک نام ابھرتا ہے اور وہ نام اکبرالہ آبادی کا ہے۔اکبر نے اپنی مصروف ترین زندگی میں سے اردو

ادب کے لیے بھی وقت نکالا اور ادب کو بہت کچھ دیا۔ان کے یہاں موضوعات کی کوئی کمی نہیں لیکن جہاں تک مزاحیہ شاعری کی بات ہے تو ان کی مزاحیہ شاعری ان کے سنجیدہ کلام پر بھاری نظر آتی ہے۔اس کی بنیادی وجہ بھی ان کی طبیعت کی شوخی اور ظرافت ہے جس سے وہ کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔اس بات کی سب سے بڑی دلیل سرسید جیسی بڑی شخصیت کے خلاف محاذ کھولنا بھی ہے۔اکبر کو انگریز اور انگریز نوازوں سے سخت نفرت تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ 1857 کا ہنگامہ ان کے سامنے گزرا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ کالجوں اور اسکولوں میں انگریزی تعلیم وتربیت کے سخت مخالف تھے جب 1875 میں سرسید نے علی گڑھ اسکول بنایا (جسے دو سال بعد کالج کی حیثیت دی گئی) تو اس پر اکبر نے برملا کہا:

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کے چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

اکبر کی مزاحیہ شاعری کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کی آخری دہائی سے ہوا تو یہ سلسلہ پھر ان کی وفات تک جاری رہا۔یہ وہ دور تھا جس میں آزادی کی تحریک مسلمانوں اور ہندوؤں میں زور وشور سے جاری تھی۔اس دور میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حالت زار زیادہ دگرگوں تھی۔سامراجی نظام برصغیر کے سینے پر اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ رہا تھا۔مسلمانوں کا استحصال، معاشی بحران، مذہب سے دوری، تعلیمی انحطاط، آپس کی نااتفاقی اور سب سے بڑھ کر اخلاقی بے راہ روی وہ مسائل تھے جن سے کوئی ذی فہم انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔چہ جائیکہ ایک درد دل رکھنے والے شاعر۔تہذیب مغرب کی اس طوفان میں اکبر بلا جھجک بول اٹھتے ہیں۔

اکبر کے ہاں ظریفانہ شاعری کے تقریباً تمام نمونے پائے جاتے ہیں بلکہ ان کی ظرافت نے فن کی خدمت کے ساتھ تعمیری کام بھی سرانجام دیا۔انھوں نے اپنے مخصوص انداز بیاں سے مغربی ہوا کا رخ موڑنے کی ہر ممکن کوشش کی اور آخری دم تک اس کا برملا اظہار کرتے رہے۔

اسے اکبر کا کمال ہی کہنا چاہیے کہ انھوں نے طنز ومزاح برائے تفریح کے ساتھ طنز ومزاح برائے فن منوایا۔انھوں نے زندگی کو ہر زاویے سے دیکھا، پرکھا اور اپنے الگ رنگ روپ کا اظہار کیا وہ حادثاتی نہیں بلکہ طبعاً مزاح گو تھے، ساتھ ہی ان کو آس پاس کا ماحول بھی ایسا ملا تھا جو اس قسم کی شاعری کے لیے موزوں تھا چوں کہ ان کا زمانہ مشرق ومغرب کی متضاد تہذیبی قدروں کے ٹکراؤ کا زمانہ تھا، اس صورت حال سے اکبر نے بھرپور استفادہ کیا۔اکبرالہ آبادی 1857 کے زمانے کی ہولناکیوں میں اگرچہ کم عمر تھے مگر شعوری طور پر سب کچھ ان کے ذہن پر نقش ہو رہا تھا ان کے یہاں جابجا اس سانحے کا ذکر ملتا ہے۔اکبر اسی زوال پذیر معاشرے کو ایک پرامن اور بقائے باہمی پر یقین رکھنے والے معاشرے کی شکل میں بدلتا دیکھنے کے آرزومند تھے۔وہ عملی طور پر کم اور فنی وفکری طور پر زیادہ سرگرم عمل تھے اپنے مقصد کے لیے انھوں نے طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے تمام مروجہ حربے اور اصناف یعنی ظرافت، طنز، ہجو، پھبتی، تحریف، لفظی بازیگری اور انگریزی الفاظ کے برمحل استعمال کے ساتھ صنعت تجنیس کا استعمال خوب کیا ہے۔ان کی نظر میں غضب کی وسعت تھی ان کی مقبولیت اور بڑائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال اور ظریف لکھنوی جیسے اعلی پائے کے شعرا بھی ان کی ظریفانہ شاعری

سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور برسوں ان کی تقلید میں طبع آزمائی کرتے رہے۔عورتوں کی بے پردگی سے اکبر الہ آبادی کو سخت نفرت تھی ان کے نزدیک مغربی تہذیب کے اثرات نے عورتوں سے حیا کی چادر چھین لی اور وہ خاتون خانہ کے بجائے رونق محفل بن گئی ہیں۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

سرسید اور ان کے رفقا کے خیال میں اگر مسلمانوں نے جدید علوم وفنون نہ سیکھے تو وہ دوسری اقوام کے مقابلے میں پست اور ناکام رہ جائیں گے لیکن دوسری طرف ان کے مخالفین بھی موجود تھے جن میں اکبر سرفہرست تھے۔اس تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اکبر خود انگریزوں کی ملازمت میں رہے بلکہ اپنے بیٹے کو بھی ولایت سے تعلیم دلوائی۔اس کھلے تضاد کی بنیادی وجہ دراصل مغربی تعلیم کی مخالفت نہیں بلکہ نوجوان اور عورتوں کی اخلاقی گراوٹ اور دین سے دوری تھی جن سے اکبر لاتعلق نہ تھے ان کی یہ مخالفت ذاتی نہیں بلکہ قومی خلوص پر مبنی تھی۔ان کا ہدف ملامت اکثر مغرب زدہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔اس حوالے سے ذیل میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم ایسی کُل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا مقصد اصلاح ذات اور اصلاح معاشرہ ہوتا ہے۔اس میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ طنز میں جو بات کہی جارہی ہے وہ تھوڑی سی چبھے مگر اس سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔اکبر عورتوں کی تعلیم وتربیت کے مخالف نہیں بلکہ وہ اس مخصوص تربیت سے نفرت کرتے تھے جو انگریزی تعلیم حاصل کر کے عورتیں اپنا لیتی ہیں۔اکبر کی شاعری اپنے دور کی ترجمان ہے اپنی شاعری کو انھوں نے تصنع اور بناوٹ سے نہیں سجایا بلکہ عمومی مضامین سے اپنے کلام کو مزین کیا ان کے یہاں مخصوص الفاظ کی ایک فہرست ہے جن سے وہ براہ راست اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں ظرافت پیدا کرنے کے لیے جمن، ٹٹو، اونٹ، گائے، ریل گاڑی، بدھو، شیخ، پری، انجمن اور بیبیاں وغیرہ الفاظ استعمال کیے۔اس کے علاوہ انھیں انگریزی الفاظ کا برمحل استعمال خوب آتا تھا۔انگریزی الفاظ کے ذریعہ بھی انھوں نے طنز وظرافت کی فضا قائم کی ہے۔انھوں نے معاشرے کی کمزوریوں کو ابھارا۔انھیں زبان وبیان اور اسلوب کا گہرا شعور تھا۔اسی شعور کے رچاؤ نے ان کی مزاحیہ شاعری میں شان پیدا کی اور انھیں ہر مکتب فکر میں مقبول خاص و عام بنا دیا۔اکبر الہ آبادی کی مشہور زمانہ نظم ''جلوۂ دربار دہلی'' کے کچھ بند ملاحظہ کیجیے جن میں طنز وظرافت کا حسین امتزاج ہے۔

اکبر کو اسلام سے سچی محبت تھی وہ عام مسلمان کے ساتھ ملا کو بھی سچا مسلمان بنانا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ جس انداز سے بھی بات کرتے مذہب ہی کو مرکز ومحور خیال کرتے۔اسی لیے تو انھوں نے علی گڑھ کے بجائے ندوۃ العلماء کو زیادہ پسند کیا لیکن اس کے ساتھ

مولویوں کی تنگ نظری کو بھی نہیں بخشا۔وہ کہتے ہیں۔

موضوعاتی تجزیے سے ہٹ کر اگر فنی اور ہیئتی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہاں بھی ہمیں مختلف النوع تجربات گلشن سخن میں رنگا رنگ پھولوں کی طرح جا بجا کھلے نظر آتے ہیں مثال کے طور پر اکبر کے یہاں ہندی اور انگریزی کے الفاظ اور کہیں کہیں فارسی کے الفاظ کے ذریعے اردو مزاح کو ایک نئے مزاج سے روشناس کرایا گیا ہے۔

لسان العصر اکبر الہ آبادی یہ اپنے فکر وفن کی کامل حیثیت کے سبب ادبیاتِ اردو کے آسمان پر ایک درخشندہ ستارہ کی طرح موجود ہیں جن کے کلام کی وجہ سے اردو مزاحیہ شاعری کو مستقل صنف سخن کی حیثیت مل گئی۔ان کے کلام سے ناقدین نے ان کی قادرالکلامی کا اندازہ لگایا ہے۔اکبر کے مزاج کا مطمع نظر اصلاح ،تہذیب اور اخلاق ہے۔فارسی کے شاعر سعدی کے بعد کسی شاعر نے یہ کام بایں شائستہ کیا ہے تو وہ اکبر ہے اسی خصوصیت کی وجہ سے اکبر کی شاعری ہر زمانے میں مقبول رہے گی۔

16.9 فرہنگ

لفظ	:	معنی
مطمع		وہ جس کی خواہش کی جائے ،امید اور لالچ کی جگہ
قادرالکلام		شعر گوئی پر قدرت رکھنے والا
درخشندہ		چمکنے والا
مشتبہ		جس کے بارے میں یقین نہ ہو
صوفی منش		صوفیانہ مزاج رکھنے والا
نوآموز		جس نے ابھی سیکھنا شروع کیا ہو
زعم		گمان،غرور
عظمت		قدر ومنزلت، بڑائی ،شان وشوکت
فلاح		کامیابی
خبطی		پاگل، بے وقوف
زاویے		نظر، انداز فکر
ظریفانہ		مزاح کا پہلو لیے ہوئے، مسخرے پن کا
انحطاط		نقصان یا زوال، پستی، نیچے اترنا
حربہ		لڑائی کا ہتھیار، تدبیر
ندرت		نیا پن، انوکھا پن، خوبی
منکشف		کھلنے والا، ظاہر

تعمیم	عام ہونا، سب کو شامل کرنا

16.10 کتب برائے مطالعہ

1۔ فرقت کاکوروی، اردو ادب میں طنز و مزاح، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، 1964ء

2۔ وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1990ء

3۔ مظہر احمد، آزادی کے بعد اردو شاعری میں طنز و مزاح، اردو اکیڈمی، دہلی، 2001ء

4۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، اکبر الہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2003ء

5۔ افشاں ظفر، اکبر الہ آبادی ایک سماجی و سیاسی مطالعہ، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2011ء